دستاویز

(ضلع کیمبل پور (اٹک) کے افسانہ نگار اور افسانے)

ارشد سیماب ملک

دستاویز

(ضلع کیمبل پور (اٹک) کے افسانہ نگار اور افسانہ)

جمالیات پبلی کیشنز اٹک

ضابطہ

نام کتاب	:	دستاویز
تحقیق و ترتیب	:	ارشد سیماب ملک
صفحات	:	۳۵۲
سنِ اشاعت	:	جنوری ۲۰۱۹ء
قیمت	:	۳۰۰
سرورق	:	ارشد سیماب ملک
اہتمام	:	سید نصرت بخاری
ناشر	:	جمالیات پبلی کیشنز: اٹک
رابطہ	:	seemabma@gmail.com

﴾انتساب﴿

اوّل

چھوڑ جانے والوں کے نام
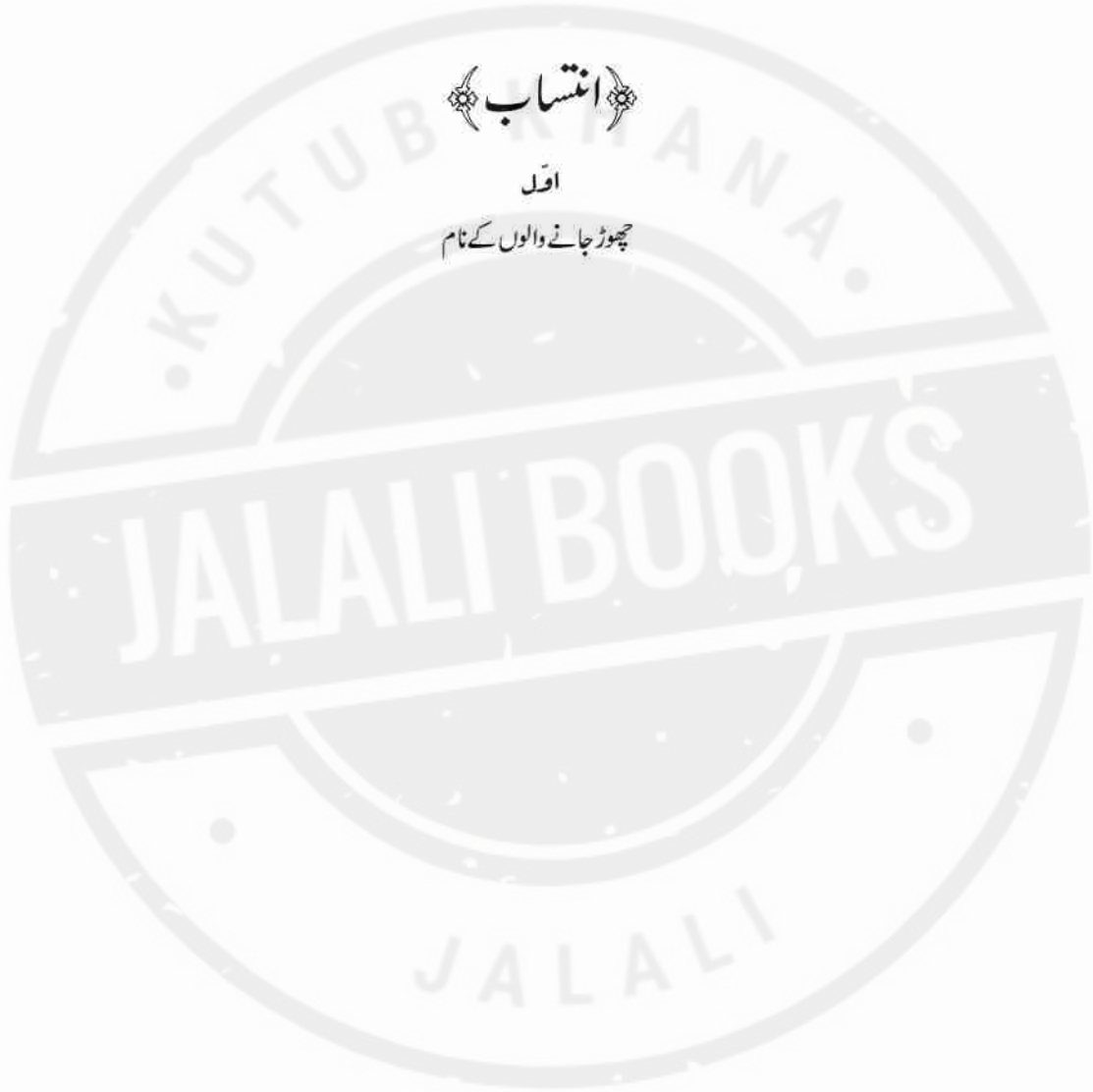
دوم

اپنی شریکِ حیات اور پیاری بیٹی کے نام

فہرست

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ابتدائیہ

کیمبل پور اٹک ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے یہاں عربی وفارسی شعروادب کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی تاہم معلوم تاریخ کے مطابق اردو نظم ونثر کی ابتدا عہدِ ولی دکنی میں ہوئی۔شاکر اٹکی نے اسی عہد میں اردو شعروادب کو فروغ دے کر اٹک کی ادبی روایت کی تاریخ رقم کی۔شاکر اٹکی کے بعد سے عہدِ حاضر تک علم وادب کی کئی اکابر شخصیات نے اس خطہ میں جنم لیا اور عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبان میں علم و ادب میں نمایاں خدمات انجام دے کر بین الاقوامی سطح پر اپنے علاقہ کا نام روشن کیا۔تاہم ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے اپنے علاقہ کے اس اثاثہ کو عہد بہ عہد محفوظ نہ کیا جا سکا جس کی وجہ سے ہمیں مختلف ادوار میں ایک خلا دکھائی دیتا ہے۔اس کا دوش ہم حوادث زمانہ کو دیں یا پھر کسی اور کو یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔!

شعر گوئی کے ساتھ کیمبل پور (اٹک) کے افسانوی ادب کی روایت بھی یقیناً اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو افسانہ یا پنجابی کہانی کی۔ اگر ہم طبع شدہ افسانوی ادب پر نگاہ ڈالیں تو لے دے کہ ہمیں گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں تقسیم ہند سے چند سال قبل فروغ پانے والا افسانہ ہی دیکھائی دیتا ہے۔اس سے قبل دھول مٹی اور گرد ہی ہی جمی دیکھائی دیتی ہے اس کی وجہ شائع شدہ مواد کی عدم دستیابی اور غیر محفوظ ہونا ہے۔تاہم اس کھوج میں کیمبل پور اٹک کی افسانوی روایت کا ایک اہم نام امر سنگھ منصور کا سامنے آیا۔جو سجاد حیدر یلدرم، کرشن چندر، اور پریم چند کے ہم اثر کہانی کار تھے۔یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیمبل پور اٹک سے تعلق رکھنے والا افسانہ نگار کسی نا کسی طور اردو افسانہ کے اولین دور میں سانس لے رہا تھا۔ان کی کہانیوں کی تشہیر ادبی سطح پر ممکن نہ ہو پائی یا پھر اسلوبیاتی وفنی اعتبار سے وہ مقام حاصل نہ کر پائیں جو اس عہد کے دیگر افسانہ نگاروں کو حاصل ہوا تاہم انہوں نے سادہ اور بیانہ انداز میں اصلاحی نوعیت کی کہانیاں لکھ کر افسانے کے فروغ میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔

گورنمنٹ کالج کیمبل پور نے جہاں تنقید، تحقیق، نظم، غزل اور ڈاکٹر جیلانی برق کے اردو ماہیا کو زمانی اعتبار سے چراغ حسن حسرت کے اردو ماہیا پر فوقیت اور فروغ دیا وہیں افسانے کے فروغ کے لیے

بھی اہم کردار ادا کیا۔ تقسیم سے قبل اندر سروپ دت نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا اور دیویندر اسر ''نسوانی دنیا'' میں افسانہ لکھ کر کیمبل پور میں اردو افسانے کی راہ ہموار کر چکے تھے۔ تقسیم کے بعد پچاس کی دہائی سے ستر تک منیر احمد منو بھائی، عنایت الٰہی ملک، شفقت علی، سیعدہ فیض، وقار بن الٰہی، احمد جاوید، انور جلال اور مرزا حامد بیگ نے کیمبل پور میں افسانے کو توانا اور مستحکم بنایا۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور کے اساتذہ ڈاکٹر سعد اللہ کلیم، پروفیسر انور جلال اور معروف افسانہ نگار منیر احمد شیخ نے گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں اپنے قیام کے دوران اردو افسانے کے فروغ کے لیے طالب علم افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے خود بھی افسانے لکھے اور ان میں بھی افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا کی۔ تاہم تقسیم کے فوراً بعد نمودار ہونے والے بعض طالب علم افسانہ نگاروں کا ذوق وشوق پروان نہ چڑھ سکا اور وہ گوشہ گم نامی میں کھو گئے۔ دیویندر اسر، اندر سروپ دت اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کیمبل پور سے ہجرت کے بعد بھی اردو افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور افسانوی ادب میں اپنی شناخت اور کیمبل پور کے نام کو زندہ رکھا۔ وقار بن الٰہی نے پچاس کی دہائی میں افسانہ لکھنے والوں کی قطار میں خود کو شامل کر لیا اور انڈو پاک کے صفِ اول کے جریدوں میں تواتر سے افسانے لکھ کر خود کو افسانوی ادب کے لیے مخصوص کر لیا انہوں نے پریم چند ،کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی ایسے کہانی کاروں کی تقلید میں بہترین بیانیہ افسانے تخلیق کیے اور اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں جگہ بنائی۔

رخسانہ صولت نے ۱۹۶۰ء میں بیسویں صدی دہلی سے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا روایتی بیانہ افسانوں کے ساتھ علامتی کہانیاں بھی لکھی پاکستانی ادب کی خواتین افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اسی دہائی میں سفر آغاز کرنے والے احسان بن مجید افسانے کی بیانہ روایت کے امین ٹھہرے اور مستقل مزاجی سے مختصر افسانہ لکھتے رہے، انہوں نے تقریباً پچاس برس کی ریاضت کے بعد ''موم کا پتھر'' اور ''آنکھوں کے ساگر'' کے نام سے دو افسانوی مجموعے اردو ادب کو دیئے۔

علی تنہا، احمد جاوید، احمد داؤد اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۷۰ کی دہائی میں اردو افسانے کے افق پر نمودار ہونے والے ان افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے مارشل لا دور کی سنگینی اور ظالمانہ طبقاتی نظام کے خلاف ایک خاص انداز اور تکنیک کے ساتھ افسانے تخلیق کیے، ان ایسے افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کے اسلوب اور منظر نامہ کو بدل کر رکھ دیا۔ احمد جاوید نے ''غیر علامتی کہانی''، ''چڑیا گھر'' اور

''گمشدہ شہر کی داستان'' ایسے افسانوی مجموعے دیئے۔ چڑیا گھر کے سبھی افسانے اپنے عنوانات اور اسلوب کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ قدیم مغلیہ تہذیب کے پسِ منظر اورتہہ داریوں میں اتر کرطلسماتی انداز میں پیش منظر کوایک خاص تکنیک کے ساتھ لفظوں میں پروتے چلے جاتے ہیں۔ان کا شمار اردو فکشن کے ان چند مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے فکشن کے لیے بے بہا خدمات انجام دیں۔کیمبل پور(اٹک) کے ایک اور فکشن رائٹر محمد حمید شاہد کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ان کا شمار بھی اردو کے اہم افسانہ نگاروں اور ناقدین میں ہوتا ہے۔امان اللہ خان منجھے ہوئے کہانی کار ہیں ان کی کتاب ''بے خواب سفر'' بہترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔سید نصرت بخاری نے بہت مختصر وقت میں پاکستان کے افسانوی ادب میں اپنی راہ ہموار کر لی،گزشتہ سالوں میں اردو کے اہم ناقدین نے ان کی کہانیوں کو سال کی بہترین کہانیاں قرار دیا۔طلعت نورین سحر اور نگہت یاسمین بھی کئی سالوں سے افسانہ لکھ رہی ہیں ان کی کہانیاں پاکستانی ادب کی خواتین افسانہ نگاروں کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے پر تول رہی ہیں۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری،تحقیق اور تنقید کے ساتھ افسانوی ادب میں بھی کیمبل پور (اٹک) کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہاں افسانہ لکھنے کے رجحان میں اضافہ پایا جاتا ہے۔ضلع کے مدارس بھی اردو افسانے کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔

اردو افسانہ کے ساتھ کیمبل پور میں پنجابی کہانی کی روایت کا آغاز بھی تقسیم سے قبل ہو چکا تھا۔ گرمکھ سنگھ مسافر پنجابی کہانی کے سرخیل ہیں بعد ازاں انہوں نے بہ طور کہانی کار پنجابی ادب میں شہرت پائی۔سردار سنگھ نارنگ بھی زمانہ طالب علمی میں ۱۹۳۰ء کی دہائی میں کہانیاں لکھ رہے تھے۔ ماضی کے برعکس مقامی بولی میں کہانی لکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ چھاچھی بولی کے سرخیل منظور عارف ہیں جنہوں نے ابتدا میں ریڈیائی کہانیاں اور ڈرامے لکھ کر مقامی بولی کو مان بخشا تاہم اس بات کا سہرا ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کو جاتا ہے جنہوں نے ''قصہ کہانی'' کے عنوان سے کہانیوں کا مجموعہ شائع کر کے کیمبل پور میں مقامی بولی چھاچی میں افسانہ لکھنے کی بنیاد ڈالی ۔ پروین ملک پنجابی کی معروف کہانی کار ہیں'' کیہ جاناں میں کون'' اور'' نکے نکے دکھ'' کہانی کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔انڈو پاک میں بہ طور پنجابی کہانی کار یکساں مقبولیت رکھتی ہیں ٹکسالی پنجابی کے علاوہ مقامی بولی میں کئی بہترین کہانیاں لکھیں۔مشتاق عاجز کی کہانیاں چھاچی زبان و بیان کا معتبر حوالہ ہیں۔توقیر چغتائی ایک عرصہ سے مقامی بولی میں کہانی لکھ

رہے ہیں۔نوے کی دہائی میں امرتا پریتم نے ان کے افسانوں کو اپنے رسالہ ''ناگ منی'' میں شائع کرنا شروع کیا تو بہ طور کہانی کاران کی پہچان انڈو پاک میں بنی۔ بعدازاں امرتا پریتم نے ہی ان کی کتاب چھاپی جس کا دوسرا ایڈیشن بھی حال ہی میں انڈیا میں شائع ہوا۔ان کے پنجابی افسانوں کی کتاب ''اخیرلا ہنجو'' پروہاں کی ایک یونی ورسٹی میں ایم اے کا مقالہ لکھا گیا۔گزشتہ چند سالوں سے کیمبل پور میں مقامی بولی میں لکھنے والے کئی کہانی کار ادبی افق پرنمودار ہورہے ہیں جس سے ماں بولی کوفروغ حاصل ہورہا ہے جوایک خوش آئند بات ہے۔آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ یہ کتاب کہانیوں کا انتخاب ہرگز نہیں ہے! یہ کیمبل پور میں کہانی کی روایت کی ایک اہم دستاویز ہے۔جس میں شامل کہانی سے جُڑا ہر وہ قلمکار اہم ہے جس کا یہاں جنم ہوا اور کسی نا کسی طور کہانی کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالا۔شاملِ کتاب مواد کے حصول کے لیے مجھے بہت تگ ودو اور چھان بین کرنا پڑی۔ مجھے امید ہے کہ اپنی مٹی کی محبت میں کی جانے والی میری یہ کاوش رائیگاں نہیں جائے گی۔آخر میں محمد اظہار الحق،مشتاق عاجز،سید نصرت بخاری اور نند کشور وکرم کا شکرگزار ہوں بل خصوص ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا جنہوں نے اپنی بے بہا مصروفیت کے باوجود وقت نکالا اور اندر سروپ دت کی کہانی کے لیے بیسویں صدی دہلی کی دس سالہ فائلیں چھان ڈالی اور کوشش بسیار کے بعد خود کو اور مجھے شدید مایوسی سے بچالیا۔ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بعض افسانہ نگاروں نے سفر آغاز بعد میں کیا لیکن ان کے نام پہلے درج ہیں لہٰذا کتاب کی ترتیب کو زمانی اعتبار سے دیکھا جائے۔یقیناً کچھ ایسے نام اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

ارشد سیماب ملک

دستاویز

تذکرہ نویسی اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے اور اسے ہمارے ادب میں بڑی اہمیت و افادیت رہی ہے اور شعراء ادبا کے بارے میں کوئی تین صدی سے تذکرے لکھے جا رہے ہیں اور موجودہ دَور میں بھی بے شمار تذکرے معرضِ وجود میں آ چکے ہیں جو ہمیں اُس دَور کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات وکوائف سے روشناس ہی نہیں کرتے بل کہ اُس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے متعلق بھی آگاہ کرتے ہیں۔

دراصل تذکرہ اور بیاض یادداشت قسم کی چیز رہی ہیں اور ان میں زیادہ تر توجہ شعراء کی شاعری ،ان کے نجی اور خاندانی حالات پر دی گئی ہے۔ بعض تذکروں میں شعراء کا ذکر ان کے اُستاد کے حالات و شاعری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بعض میں تذکرہ نگار نے ادوار مقرر کئے ہیں اور اس کے تحت ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر دَور کے شعراء میں تقدیم وتاخیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تذکروں میں تنقید کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، جو کسی میں زیادہ اور کسی میں سرسری طور پر پایا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں تذکرہ نویسی کی شروعات لگ بھگ اٹھارہویں صدی کے قریب ہوئی تھی۔ محققین کے مطابق اُردو کا پہلا تذکرہ مرزا الطف علی کا 'گلشنِ ہند' مانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہوسکتا ہے کسی نے کسی بیاض یا یادداشت کی صورت میں کوئی تذکرہ رقم کیا ہو، مگر وہ ابھی تک کسی محقق کی نظر سے نہیں گزرا، لہٰذا مذکورہ تذکرے کو ہی اُردو کا پہلا تذکرہ قرار دیا گیا ہے۔

گزشتہ ساڑھے تین سو سال کے دوران متعدد تذکرے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں جن کی گنتی بھی کارے دشوار ہے۔ تاہم اس طویل مدت میں جن اہم تذکروں سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع ملا ہے ان میں اٹھارہویں صدی میں میر تقی میرؔ کا 'نکات الشعرا'، قائم چاندپوری کا 'مخزنِ نکات' (۱۷۵۲ء) فتح علی حسینی کا 'تذکرہ ریختہ گویاں'، لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی کا 'چمنستانِ

شعرا' (۱۷۶۱ء) وجیہ الدین عشقی کا 'تذکرۂ عشقی'، غلام حسین شورش کا 'تذکرۂ شورش'، ابوالحسن امراللہ الٰہ آبادی کا 'تذکرۂ مسرت افزا'، قدرت اللہ شوق رامپوری کا 'طبقات الشعرا'، مردان علی خان مبتلا کا 'گلشنِ سخن'، نواب علی ابراہیم خاں خلیل کا 'گلزارِ ابراہیم'۔ ۱۸۳۴ء میں مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ 'گلشنِ بے خار' اور خیراتی لال بے جگر کا 'تذکرۂ بے جگر' منصۂ شہود پر آئے۔ مصحفی کا ''تذکرۂ ہندی'' اٹھارہویں صدی کے اواخر (۹۵-۱۷۹۴ء) میں منظرِ عام پر آیا جن سے شعرا کے حالاتِ زندگی، اُن کی شاعری اور ان کے دَور کے ادبی اور تہذیبی ماحول کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان کے علاوہ 'ریاض الفصحاء' بھی اُردو کا ایک ایسا تذکرہ ہے جو ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہے، مگر یہ تذکرہ دوسرے تذکروں سے کچھ ہٹ کر ہے اور اسے جدید قسم کا تذکرہ کہنا غلط نہ ہوگا کیونکہ اس میں شعراء کے حالاتِ زندگی کی تصاویر، ان کی قلمی تحریریں اور اُن کے حالاتِ زندگی اور کہیں کہیں ان کے شاعرانہ انداز و اسلوب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں تنقید کے عنصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں مولانا محمد حسین آزاد کی مشہورِ زمانہ کتاب 'آبِ حیات' معرضِ وجود میں آئی جسے تذکروں میں غیر معمولی اہمیت و شہرت حاصل ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' اس نوح کی اہم کتابیں ہیں۔

جہاں تک افسانوی تاریخ و تذکروں کا سوال ہے یہ سلسلہ بیسویں صدی کے پانچویں دہے سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ خود افسانے کی پیدائش ہی بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوئی، جب راشد الخیری کا تحریر کردہ اُردو کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' منظر عام پر آیا۔ اور اس کے بعد پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش سدرشن۔ علی عباس حسینی وغیرہ کے افسانے منظرِ عام پر آئے۔ لیکن ابتدا میں افسانوی تذکرے بہت کم اشاعت پذیر ہوئے۔ بہر حال تحقیقی اور تنقیدی کتابوں اور افسانوں کی انتھالجیز کو اس سلسلے کی اہم کڑی کہا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں وقار عظیم کی افسانے سے متعلق تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں جو افسانوں اور افسانہ نگاروں کے بارے میں قابلِ قدر معلومات فراہم کرتی ہیں۔ پھر ۱۹۸۵ء کے قریب وحید انور اور محمود علیم صدیقی کی مرتب کردہ ''کہانیاں'' دو جلدوں میں نمودار ہوئی جسے اس سلسلے کی اہم کڑی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''نیا اُردو افسانہ'' اور ۲۰۱۳ء میں ''آج کا

افسانہ'' منظر عام پر آیا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ پھر بیسویں صدی کے اواخر میں مرزا حامد بیگ کی ''اُردو افسانے کی روایت'' شائع ہوئی جس میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۹۰ تک کی اُردو افسانے کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے اور جسے بے حد سراہا گیا اور جسے اُردو افسانے کی تحقیق میں سنگِ میل قرار دیا جا تا ہے۔ پھر ۲۰۰۷ میں ڈاکٹر انوار احمد نے اپنی تحقیقی کتاب ''اُردو افسانہ......ایک صدی کا قصہ'' پیش کی جو اُردو افسانے کی تحقیق وتنقید کی ایک اہم کتاب ہے اور جسے ایک قابلِ تحسین کام کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر خالد اشرف کی تحقیقی کتاب بر صغیر میں اُردو افسانہ'' دو جلدوں میں شائع ہوئی جن میں ہندو پاک کے نامور افسانہ نگاروں کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ اور ابھی حال ہی میں معروف افسانہ نگار دیپک بدکی کی کتاب ''اُردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'' منظر عام پر آئی ہے جس میں کوئی اڑھائی سو افسانہ نگاروں کا ذکر ہے اور جسے جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی رسائل نے بھی افسانہ نمبر شائع کئے ہیں جو اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں اور جن میں اہم افسانہ نگاروں تخلیقات پیش کی گئی ہے۔ نقوش لاہور کے افسانہ نمبر کے علاوہ سویرا لاہور ، روشنائی کراچی وغیرہ کے افسانہ نمبر بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ عرصہ سے ہم نظم ونثر کے حوالے سے ایسے تذکرے دیکھ رہے ہیں جو علاقائی سطح پر ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے لکھنؤ کے امی شعراء، اتر پردیش کے شعراء، آزادی کے بعد دہلی میں افسانہ، شاہجہاں پور میں افسانہ اور سیماب صاحب کی پہلی کتاب تذکرہ شعرائے اٹک بھی اہم پیش رفت ہیں۔

اب اس سلسلے میں سیماب ملک صاحب نے ''دستاویز'' کے عنوان سے ایک قابل قدر تحقیقی کتاب پیش کی ہے جس میں انہوں نے اٹک (جسے انگریزی دور میں کیمپلپور کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا) کے افسانہ نویسوں کا تذکرہ قلمبند کر کے صنف تذکرہ کی تاریخ میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔ گو کہ کسی بھی تحقیقی کام کو حتمی نہیں کہا جا سکتا لیکن پھر بھی سیماب صاحب نے اس سلسلے میں بھرپور کوشش کی ہے کہ معروف افسانہ نگاروں کے ساتھ چند نئے لکھنے والوں کو بھی اس میں جگہ دی جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ محقق حضرات ہی جانتے ہیں کہ کسی شاعر یا ادیب کے حالات وفن سے متعلق مواد تلاش کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات اسے کوہِ بےستون سے جوئے شیر لانے کے مترادف کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ سیماب صاحب کی زیر تبصرہ کتاب بلاشبہ ایک غیر معمولی تحقیقی کاوش ہے جس میں

انہوں نے اٹک سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے متعلق جتنا بھی مواد حاصل ہو سکا، یکجا کر کے ایک ایسی تحقیقی کتاب تیار کر دی ہے جو مستقبل میں اٹک کی افسانوی روایت پر کام کرنے والوں کے لئے راہِ مشعل ثابت ہو گی ۔ سیماب صاحب کی یہ تحقیقی کتاب پہلی کوشش ہے جو کیمبلپور (اٹک) کے افسانہ نگاروں کے حالات وکوائف پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔اور اس سے یہ بھی قارئین کو معلوم ہوتا ہے کہ دیویندر اسر، وقار بن الٰہی، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، محمد حمید شاہد، علی تنہا، ستیہ پال آنند ایسے ممتاز اور نامور افسانہ نگار اس خطے کی پیداوار ہیں جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اس کے علاوہ صاحب کتاب اس بات کے لئے بھی قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے اس خطے کے پہلے معروف افسانہ نگار امر سنگھ منصور سے لے کر حال تک کے افسانہ نگاروں کو اس تحقیقی دستاویز میں محفوظ کر دیا ہے۔

مَیں اس کتاب کی اشاعت پر سیماب صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت و کاوش سے اس کتاب سے متعلق مواد کو اکٹھا کر کے افسانوی تذکروں کی تاریخ میں اپنے علاقے کی نمائندگی کرتے ہوئے بہت ہی اہم خدمت انجام دی ہے جو اہلِ تحقیق خصوصاً ایم اے ایم فل کرنے والوں کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوگی اور جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

نند کشور وکرم (عالمی اردو ادب دہلی)

اردو کہانی کار

نام سردار امر سنگھ
قلمی نام امر سنگھ منصور
ولدیت سردار گلاب سنگھ
پیدائش ۱۸۸۸ء پنڈی گھیب
تعلیم (فارسی و اردو)

امر سنگھ منصور کے آباؤ اجداد کا تعلق پنڈی گھیب سے تھا۔ The Herítage of The Sikhs کے مطابق منصور امر سنگھ ۲۷ مئی ۱۸۸۸ کو پنڈی گھیب میں پیدا ہوئے۔

بعض اردو تذکروں میں ان کی پیدائش کا ذکر سری نگر جب کہ آبائی قصبہ پنڈی گھیب ہی درج ہے اور سن ولادت کے حوالہ سے متضاد بیان ہیں۔

امام مرتضٰی نقوی ''لائل گزٹ'' ۱۹۱۱ء کے اجراء پر اس وقت ان کی عمر اٹھاراں برس درج کرتے ہیں جب کہ سن ولادت درج نہ ہے۔ ڈاکٹر ناشر نقوی نے ''پنجاب اور اردو افسانہ'' میں ان کی سن پیدائش ۱۸۷۵ء درج کی ہے۔

ان کے دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ماتحت سول ملازم رہے۔ والد سردار گلاب سنگھ کشمیر کے مہاراجہ کے ہاں ملازمت پر معمور تھے۔ مشن ہائی سکول سری نگر میں تعلیم حاصل کی۔ فارسی کی تعلیم اپنے آبائی وطن میں مولوی شیر احمد خان سے حاصل کی۔

والد کی وفات کے بعد ان کا خاندان راول پنڈی میں آباد ہوا یہاں آ کر انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اس سے قبل کچھ عرصہ وہ ایک دکان چلاتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں انہوں نے روال پنڈی سے ایک ہفت روزہ ''لائل گزٹ'' میں بہ طور مدیر کام کیا جس میں خالصہ دیوان کے نظریات کے تحت سیاسی، مذہبی اور سماجی مسائل پر تحریروں کی سر پرستی و بحث کی۔ اسی

دور میں انہیں اپنی ادبی صلاحتیں اجاگر کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۱۶ء میں ''شیرِ پنجاب'' کے نام سے اردو اخبار جاری کیا ۱۹۱۸ تک شائع کرتے رہے۔ اس اخبار کی نظریاتی پالیسوں کے تحت انگریز سرکار نے اس اخبار کا پریس ضبط کر لیا لیکن دوسری طرف ''لائل گزٹ'' بدستور جاری رہا۔ بعد ازاں سردار امر سنگھ نے ''لائل گزٹ'' کا نام بدل کر ''شیرِ پنجاب'' رکھ لیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد یہ اخبار اسی نام سے دہلی سے شائع ہوتا رہا تاہم ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سردار جنگ بہادر نے اخبار کو جاری رکھا۔ منصور امر سنگھ سولہ برس تک مونسپل کمیٹی لاہور کے رکن رہنے کے علاوہ سکھ سبھا لاہور کے مستقل رکن رہے۔ اس کے ساتھ وہ ایک سیاسی سرگرم رکن بھی رہے جس کی پاداش میں انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔

منصور امر سنگھ سیاست، صحافت کے علاوہ شاعر، مترجم، افسانہ نگار اور اسکالر بھی تھے انہوں نے اردو، پنجابی اور فارسی میں ادبی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اردو زبان میں دو ناول اور کئی مختصر کہانیاں لکھیں تاہم ان کی کوئی کتاب منظر عام پر نہ آ سکی۔ علاوہ ازیں عمر خیام کی رباعیات کا پنجابی میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔

منصور امر سنگھ سجاد حیدر یلدرم، کرشن چندر، اور پریم چند کے ہم اثر کہانی کار تھے۔ انہوں نے سادہ اور بیانہ انداز میں اصلاحی نوعیت کی کہانیاں لکھیں انہوں نے اپنے افسانوں میں کسان اور مزدور طبقے کے حق میں آواز بلند کی اور جاگیردارانہ نظام کے جبر واستبداد کی نفی کی۔

''غریب اور پسماندہ لوگوں کی تلخ زندگی کے حقائق امر سنگھ منصور نے بڑے موثر انداز میں پیش کیے۔ گاؤں کی زندگی میں اس وقت کی اہم شخصیت زمیندار کی ہوتی تھی جو سب پر سبقت پانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی ساہوکار کے خلاف مظلوم اور معصوم مزدور اور کسان کاشت کار کا حق دلانے کی کوشش میں اس وقت کے سبھی افسانہ نگار لگے ہوئے تھے۔ امر سنگھ منصور نے بھی پریم چند کے قافلے کا ساتھ دیا۔۔ امر سنگھ منصور نے رومانی افسانے بھی لکھے جو عشق ومحبت کے معاملات پر مبنی ہیں۔ یہ افسانے سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے انداز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رومان میں امر سنگھ منصور نے تعمیری نقطہ نظر کو اہمیت دی۔'' (ناشر نقوی، پنجاب میں اردو افسانہ، ص ۳۳)

منصور امر سنگھ نے تقسیم کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام دہلی میں بسر کیے اور ۹ جولائی ۱۹۴۸ء کو

آنجہانی ہوئے۔

لائل گزٹ (۱۹۱۱ء)

شیرِ پنجاب (۱۹۱۶ء)

ماخذ

اسلم جمشید پوری، اردو کے سکھ افسانہ نگار، فکروخبر، ملیر کوٹلہ، ۱۱مئی ۲۰۱۷ء

ڈاکٹر ناشر نقوی، اردو پنجاب اور سکھ شعراء، پٹیالہ ۱۹۹۹ء

نند کشور وکرم، عالمی اردو ادب، دہلی ۲۰۱۲ء

Harbns Singh ,The Heritage Of The Sikhs 1982

امام مرتضیٰ نقوی، اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، امروہہ، اپریل ۱۹۷۰ء
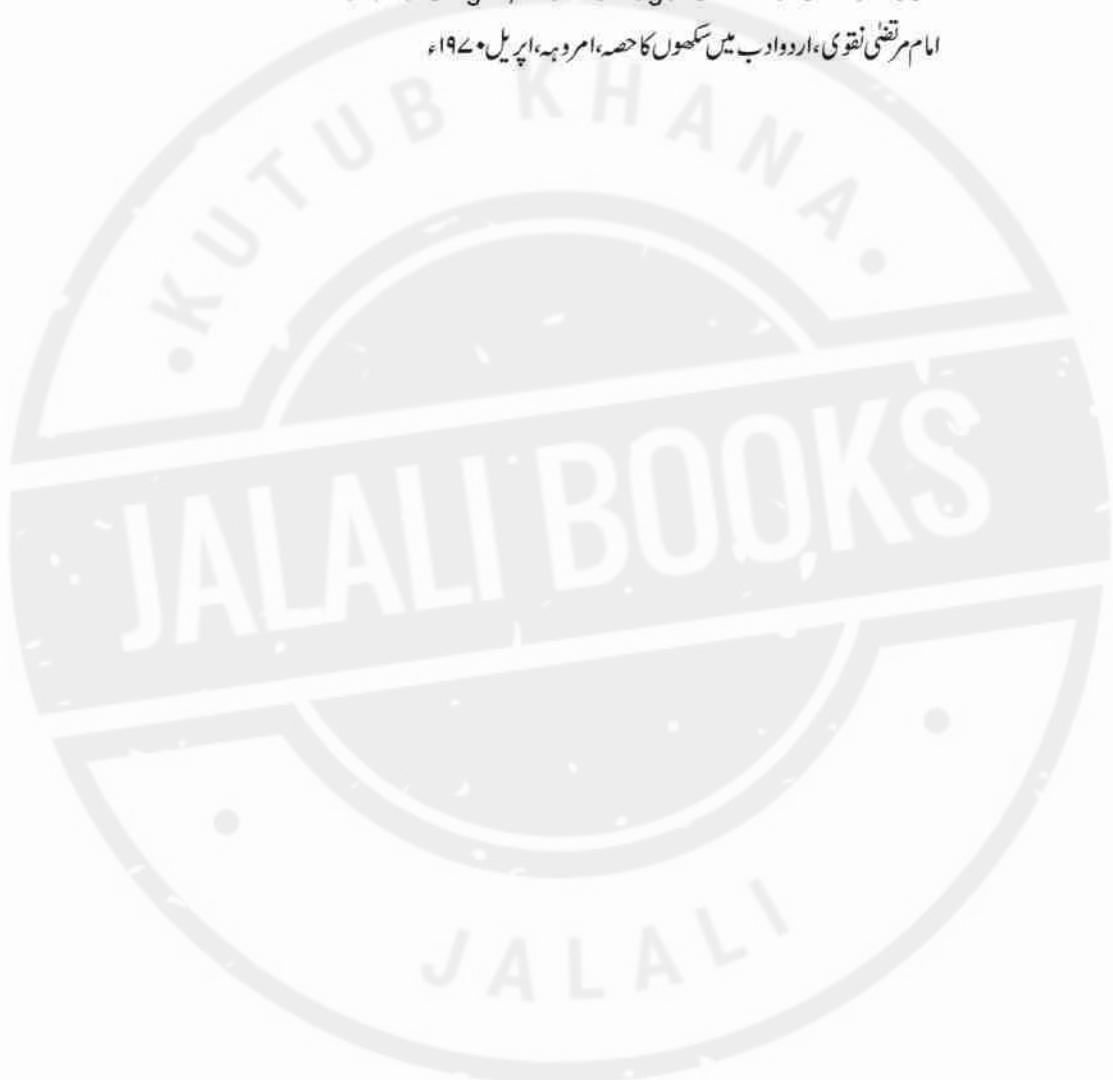
ایکے کی برکت

امر سنگھ منصور

رام نگر کے زمیندار نے فصل کی کٹائی کے دنوں اپنے سارے دیہات کے باشندوں کو بیگار دینے کا حکم دیا۔ رام آدھین کماران دنوں ملیریا سے بیمار پڑا تھا، نہ وہ بیگار دے سکا اور نہ اس کی بیوی۔ کٹائی ہو چکنے پر کسی ملازم نے چغلی کھائی کہ ہمارے رام نگر میں رام آدھین اور اس کی بیوی کے سوا کسی نے بھی آپ کے حکم کی تکمیل سے انکار نہیں کیا۔ زمیندار ٹھاکر رچھپال سنگھ نے رام آدھین کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ اسے بخار چھوڑ گیا تھا لیکن کمزوری کے باعث ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے باوجود زمیندار کے خوف سے لاٹھی اور بیوی کے سہارے زمیندار کی ڈیوڑھی پر بصد مشکل پہنچا، وہاں اسے بیٹھنے یا لیٹنے کے لیے جگہ نہ ملی۔ دو گھنٹے سخت گرمی اور لو میں قسمت کا مارا دروازے پر کھڑا رہا۔ آخر ملازم اسے اندر لے گئے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر بھی زمیندار کے من میں ریا نہ آئی اور اس سے پوچھا "کیوں بے! تم نے بیگار کیوں نہ دی؟"

کمہار "ناتھ میں تو ایک مہینے سے چارپائی پر پڑا ہوں۔"

زمیندار "تم بیمار تھے تو تمہاری اس ہٹی کٹی لگائی کو کیا ہو گیا تھا۔"

کمہار "پرتھی ناتھ! میری تیمارداری کون کرتا۔ اس کے سوا تو مجھے کوئی پانی دینے والا بھی نہیں تھا نہ بچوں کو سنبھالنے والا تھا۔"

رام آدھین کا گلا سوکھ گیا۔ اور اس نے پانی مانگا۔ زمیندار کے ہاں اسے کون پلاتا، وہ تو غریب بھی تھا اور کمہار بھی۔ وہ گرمی اور پیاس سے وہیں دم توڑ دیتا کہ ایک دوسرے دربان کو جو ذات کا کمہار تھا اس کی یہ حالت اور زمیندار کی بے رحمی دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ وہ بھاگا بھاگا گیا ایک لوٹے میں پانی لے آیا۔ کچھ رام آدھین کے منہ میں ڈالا اور چند چھینٹے اس کی آنکھوں پر بھی مارے۔ زمیندار کو دربان کی اس حرکت پر غصہ آیا اور گرج کر بولا "دیکھو دربان تم نے ہمارا فرش خراب کر دیا ہے۔"

دربان ''بجور فرش تو سوکھ جائے گا مگر رام آدھین مر جاتا تو پھر یہ جی نہ اٹھتا۔''

''بکومت۔'' دربان کے جواب میں کہہ کر زمیندار زنانخانے میں چلا گیا اور بے چارے رام آدھین کو اس کی منت سماجت کر کے اس سے معافی مانگنے کا موقع نہ مل سکا۔

''اب ہم کہاں جائیں گے؟'' یہ دردناک الفاظ تھے جو رام آدھین کی عورت نے اپنے خاوند کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رام آدھین ''جہاں آن جل ہوگا اور جہاں بھگوان لے جائے گا۔''

بیوی ''یہ بھائی بند، یہ سمبندھی، یہ رشتہ دار تو یہیں رہ جائیں گے۔ برادری کے بغیر کیسے دن کٹا کریں گے۔ میرے میکے بھی اسی زمینداری میں ہیں۔ نانہال بھی اور سسرال بھی۔ پردیس میں دکھ سکھ کے سمے ہمارا کون ساتھی ہوگا۔

رام آدھین ''قسمت میں دیش نکالا لکھا تھا مل گیا۔ ورنہ ہمارا قصور تو کوئی نہیں۔ زمیندار جتنا بڑا آدمی ہے اتنا ہی نروئی۔ ریا تو اسے آتی ہی نہیں وہ تو تاپ کے دنوں میں ہم سے فصل کٹوانا چاہتا ہے۔ اچھا میں ایک دفعہ پھر اس کی منت سماجت کروں گا۔''

بیوی ''اس کی منت سماجت سے کام نہ نکلے گا اپنی برادری کے پاس جاؤ۔ انہیں اپنا حال سناؤ اور پنچایت بھیجو اس ظالم کے پاس کہ کون سا اتنا بڑا قصور کیا ہے۔ جس کے لیے غریب بال بچے دار کو دیش نکالا مل رہا ہے۔ اس کا زیادہ اثر ہوگا۔''

رام آدھین ''بات تو ٹھیک کہتی ہے ہوشیاماں۔ ایسا ضرور کریں گے شاید تپا ٹل جائے۔''

۳

''باپو یہ زمین کس نے بنائی؟''

''بھگوان نے بیٹا۔''

''پانی کس نے بنایا؟''

''پانی بھی بھگوان نے بنایا۔''

''یہ باغ اور کھیت کس نے بنائے۔؟''

''یہ بھی بھگوان نے۔''

''ان کا مالک کون ہے؟''

''زمیندار ٹھاکر۔''

''ان میں سے ہمارا کچھ بھی نہیں؟''

''نہیں بیٹا ہمارا کچھ بھی نہیں۔ یہ زمین بھی ہماری نہیں جس پر جھونپڑی ڈال کے پڑے ہیں۔''

''تو پھر بھگوان نے ہمارے لیے کیا بنایا؟''

''بھوک، ننگ، دکھ اور غلامی۔'' اپنے معصوم اور لاڈلے بیٹے جگو کے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے رام آدھین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

۴

رام آدھین نے اپنی ساری برادری اکٹھی کی اور زار زار رونے لگا۔ برادری سے کہا:

''میرا کیا قصور ہے؟ فصل کی کٹائی کے دنوں میں تاپ سے قریب المرگ تھا۔ گھر میں استری (بیوی) کے سوا کوئی نہیں تھا جو میرے منہ میں پانی بھی ڈالتا۔ بتاؤ ہم میں سے کون فصل کی کٹائی پر جاتا۔ بس اس قصور پر مجھے دیش نکالا مل رہا ہے۔ مجھے اس جھونپڑی کی تو ذرا پرواہ نہیں، لیکن برادری کے بغیر میں گزارہ کیسے کروں گا۔ مر گیا تو پردیس میں میرا مردہ کون اٹھائے گا۔ دکھ سکھ میں ہم کس کے پاس جائیں گے۔ سات پشتوں سے رام نگر میں رہتے آئے ہیں۔ مگر اب کس دوش کے بنا مجھے کالا پانی دیا جا رہا ہے۔ بھگوان کی زمین پر بھی ہمیں رہنے کا حق نہیں۔ ہمارے ساتھ ڈھوروں سے بھی برا سلوک کیا جا رہا ہے۔ نہ ہمارا گھر نہ ہمارا گھاٹ، جب چاہا ٹھاکر جی نے جھونپڑی گروا دی اور کہا جاؤ جدھر سینگ سماتے ہیں چلے جاؤ۔ یہ کیا زندگی ہے اس سے مر جانا بہتر ہے۔''

رام آدھین کے بعد دربان رام لال اٹھ کے رو پڑا اور برادری کو بتایا کہ صرف رام آدھین کے منہ میں دو گھونٹ پانی ڈالنے کے ٹھاکر جی نے نہ صرف مجھے موقوف کر دیا بلکہ گاؤں سے بھی نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔ بھائیو! یہ کتنا بھاری ظلم ہے یہاں کون محفوظ ہے؟

رام لال کے اس بیان سے برادری میں سنسنی پھیل گئی اور تجویز پیش ہوئی کہ برادری کے پنچ زمیندار کے پاس جا کر بات چیت کریں۔ اسے سمجھائیں اور اگر وہ نہ سمجھے تو سب کمہار رام نگر سے نکل جائیں۔

اس اعلان سے حاضرین میں جوش پھیل گیا۔ گوالوں نے کہا کہ ہم پر کمہاروں سے بھی زیادہ سختی ہوتی ہے۔ جس گاؤں میں وہ جھونپڑی بھی ہماری نہیں جو باپ دادا نے بنائی اس میں رہنا بھاری مور کھتا اور ڈھور پن ہے۔ کمہار جائیں گے تو ہم بھی اپنے ڈھور لے کر ان کے ساتھ نگر چھوڑ جائیں گے۔ اکٹھے مل کر رہے اب اگر گزارہ نہیں ہوتا تو اکٹھے ہی چلیں گے۔

جاٹوں نے کہا ''ہم سارا برس محنت کرتے ہیں مگر تن پر کپڑا نہیں اور پیٹ بھر کے کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کسی شہر میں محنت مزدوری کر کے پیٹ بھریں اور کسی کی رعیت نہ کہلائیں۔''

چماروں نے بھی اعلان کر دیا کہ ہم باقی گاؤں والوں کے ساتھ ہیں۔ گاؤں چھوڑنا ہے تو سب مل کے چھوڑیں گے اور یہاں ٹھاکر جی کے سوا کوئی نہ رہے گا۔

۵

وزیر ''ٹھاکر صاحب رئیس کی ریاست رعیت ہے زمین نہیں۔ اگر ان سب لوگوں نے ایکا کر لیا تو ہمارا اپنا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ تھوڑی سی بات پر آپ نے سارا گاؤں ہی مخالف بنا لیا ہے۔ ایک آدمی اگر بیماری کے باعث فصل کی کٹائی کے دنوں نہیں آ سکا تو ہمارا کیا نقصان ہوا؟ کام تو چل گیا تھا۔ محض ایک چغلی خور کی باتوں میں آ کر آپ نے رعیت کے ایک نہیں دو کنبوں کو گاؤں بدر کرنے کا حکم دے دیا۔ اب تو سارا نگر اجڑتا ہے اور کس بات پر؟''

ٹھاکر ''وزیر صاحب مجھے علم نہیں تھا کہ معمولی غصہ میں کہی گئی بات کا اتنا بتنگڑ بن جائے گا اور سارے نگر ہی میں بغاوت ہو جائے گی۔ آپ بزرگ ہیں ہم سے تو بگڑ گئی۔ آپ سنوار لیجئے۔ دونوں کمہاروں کا قصور معاف۔''

ٹھاکر ''لیکن اس کے معنی یہ نکلے کہ زمین کے مالک ہم نہیں رعیت لوگ ہوں گے؟''

وزیر ''ملکیت تو آپ کی رہے گی انھیں جھونپڑی رہن رکھنے یا بیچ کرنے کا اختیار تو نہ ہوگا ہاں جب تک وہ خود چھوڑ کر باہر نہ چلے جائیں انھیں جھونپڑیوں سے نکالا نہ جا سکے گا۔''

ٹھاکر ''مگر ایسی صورت میں لوگ ہمارا حکم کب ماننے لگے ہیں؟''

وزیر ''مہاراج پچھلی باتیں پچھلے زمانے کے ساتھ گئیں۔ اب نیا زمانہ ہے اب تو محبت پیار اور اپکار سے غریب قابو میں رہ سکیں گے ورنہ رئیسوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔''

۶

تمام برادریوں کے پنچ پچاس ساٹھ کے قریب تھے۔ راج کے بڑے ہال میں ملاقات کے لیے آئے اورانھوں نے اپنی شکایات بیان کیں اور پوچھا رام آدھین اور رام لال کا قصور بتایا جائے جس کی پاداش میں انھیں دیش نکالا کا حکم دیا گیا ہے۔''

ٹھاکر کی طرف سے اس بڑے وزیر پنڈت ایشور سرن نے اٹھ کر کہا ''بھایئو! سات پشت سے تم اور ہم یہاں رہتے ہیں، تھوڑی سی بات کا بتنگڑ نہیں بننے دینا چاہیے۔ جس دن ٹھاکر صاحب رام آدھین اور رام لال پر ناراض ہوئے ان کی طبیعت خراب تھی، انھیں رپورٹ بھی غلط دی گئی۔ دراصل نہ رام آدھین کا قصور ہے اور نہ رال لال کا۔ ان کے خلاف کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے ناراضی میں جو الفاظ کہے وہ حکم نہیں ہے۔ رام لال اپنے کام پر واپس آجائے اور اسے پوری تنخواہ مل جائے گی۔''

ایک پنچ۔ ''ہم صرف رام آدھین اور رام لال کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہم اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے آئے ہیں کہ جن جھونپڑیوں میں ہم رہتے ہیں ان میں ہمیں رہنے کا حق ہے یا نہیں اور ان سے ہمیں نکالا جاسکتا ہے یا نہیں نیز ہم کو بیگار دینے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں؟''

وزیر۔ ''ٹھاکر صاحب نے حکم دے دیا ہے اور کل باقاعدہ تحریر میں آکر آپ کے پاس آجائے گا کہ جب تک آپ اپنے مکان میں آباد رہیں گے آپ کو حکماً نکالا نہیں جاسکے گا اور بیگار بھی آج سے موقوف ہے۔''

پنچ اس جواب پر خوش ہو گئے ۔ یہ ایکے کی بھاری فتح تھی اور اسی سے ان کے کئی دکھ دور ہو گئے۔ بھگوان نے غریبوں کے لیے ایکا بنایا ہے۔

(یہ کہانی پہلے انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ''لال گزٹ'' اور بعد میں ۱۹۴۷ء میں روزنامہ'' شیرِ پنجاب'' میں شائع ہوئی جب کہ امام مرتضٰی نقوی نے اپنی کتاب ''اردو ادب میں سکھوں کا حصہ میں'' ۱۹۷۰ء میں شامل کی)

نام	گرمکھ سنگھ مسافر
ولدیت	سردار سجان سنگھ
پیدائش	۱۸۹۹ء
جائے پیدائش	ادھوال (ضلع کیمبل پور)
تعلیم	میٹریکولیشن (گیانی)

ان کے آباؤاجداد کا تعلق ضلع کیمبل پور (اٹک) کی تحصیل فتح جنگ کے ایک گاؤں ادھوال سے تھا جہاں ۱۸۹۹ء کو گرمکھ سنگھ کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے پرائمری تک تعلیم گاؤں سے حاصل کی اس کے بعد راول پنڈی چلے آئے جہاں سے مڈل کا امتحان کیا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلے چکری کے ایک اسکول میں پڑھایا پھر تحصیل کہوٹہ کے قصبہ کلر میں خالصہ ہائی اسکول میں بہ طور ٹیچر ملازمت کی۔ اس دوران ایس وی کا امتحان پاس کر کے ورنیکولر ٹیچر خدمات انجام دیں۔ ابھی ان کی ملازمت کو چند سال ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں گیانی ہو گئے اور سکھوں کے گوردوارہ میں جتھے دار مقرر ہوئے۔ انہوں نے آزادی کی تحریک میں شمولیت اختیار کی جس کی پاداش میں انہیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی سزا کاٹی۔ ہندوستان چھوڑ و تحریک کے دوران راول پنڈی، ملتان، لاہور اور سیالکوٹ کی جیلوں میں قید رہے۔ بعد ازاں انہیں اکال تخت کا ہیڈ بنایا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان چلے گئے جہاں ۱۹۴۹ء میں پنجاب کانگرس کمیٹی کے صدر بنے انہوں نے بارہ سال خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۰ء سے ۵۲ تک صوبائی پارلیمنٹ کے ممبر رہنے کے علاوہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۶ء تک کئی عہدوں پر تعینات رہے۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔ گرمکھ سنگھ کی شادی ۱۹۱۲ء میں نڑالی ضلع راول پنڈی سے اس وقت ہوئی جب وہ پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز پنجابی زبان میں زمانہ طالب علمی سے کیا پنجابی زبان کے بہت بڑے شاعر کہانی کار تھے ان کا شمار پنجابی کے نامی لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ شاعری کے نو مجموعے اور کہانیوں کے نو مجموعوں کے علاوہ انہوں نے کچھ شخصیات کی سوانح لکھی

اور تراجم بھی کیے۔انہوں نے ۱۹۶۱ءکو جاپان میں منعقدہ عالمی کانفرس میں انڈین ادیبوں کے وفد کی نمائندی بھی کی ۔ان کے فن وشخصیت پر کئی کتب لکھیں گئیں۔کرتار سنگھ دگل، راج آنند، گربچن سنگھ طالب اور پریم سنگھ پریم نے ان کی سیاسی وادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھا۔انہیں ادبی خدمات کے صلہ میں کئی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔گیانی گرمکھ سنگھ مسافر نے اپنی زندگی کا آخری وقت دہلی میں بسر کیا اور ۱۸ جنوری ۱۹۷۶ءکو ۷۷ سال کی عمر میں آنجہانی ہوئے۔

مطبوعات:

ا۔ پریم بانی (شاعری)	۲۔ جیون پندھ (شاعری)
۳۔ صبر دے بان (شاعری)	۴۔ مسافریاں (شاعری)
۵۔ ٹٹے کھنب (شاعری)	۶۔ وکھرا وکھرا قطرہ قطرہ (شاعری)
۷۔ دور نیڑے (شاعری)	۸۔ کاؤ سنیہے (شاعری)
۹۔ سہاج سیتی (شاعری	۱۰۔ اللہ والے (کہانیاں)
۱۱۔ستائی جنوری (کہانیاں)	۱۲۔ گٹار (کہانیاں)
۱۳۔ ستا تماشا (کہانیاں)	۱۴۔ سب اچھا (کہانیاں)
۱۵۔ الہنے دے بوٹ (کہانیاں)	۱۶۔ کندھاں بول پئیاں (کہانیاں)
۱۷۔ اُروار پار (کہانیاں)	۱۸۔وکھری دنیا (کہانیاں)

ماخذ

Biography of Giyani Ghormukh Singh Musafir 2004

Harbns Singh ,The Heritage Of The Sikhs Amristar 1982

Roopinder Singh, Poet,Teacher, Leader Ghormukh Singh Musafir 2009

ناس پٹے

گرمکھ سنگھ مسافر

دروپدی نے کچی نیند میں کہا۔۔۔نہیں اس کے منہ سے نکل گیا''ناس پٹے''ہارن کی آواز سے اس کے کان جو پھٹنے والے تھے۔آج تک ہارن کی جتنی آوازیں اس کے کان میں پڑی تھیں وہ آواز سب سے کُھر دری تھی۔گنیشا ٹیکسی والا نہیں۔چانن شاہ ہوں گے!اپنے خاوند بھگت سنگھ رام کے منہ سے چانن شاہ کا نام سن کر دروپدی کچھ شرما گئی۔ہائے۔کہیں شاہ جی نے سن ہی نہ لیا ہو!

تین چار دن پہلے گنیشے کی ٹیکسی کا ہارن سن کر دروپدی کے منہ سے نکلا۔''ناس پٹیوں کو خبر نہیں رات کو بھی نیند نہیں آتی۔''اس وقت بھگت رام کے سمجھانے پر کہ۔''اس غریب ٹیکسی والے کا چالان ہو گیا ہے۔۔بے چارا شرنارتھی ہے۔سفارش کے لیے کہتا ہے۔''دروپدی نے اور بھی اونچی آواز میں کہا۔''جائے جہنم میں ناس پٹیا۔!''گنیشے نے یہ بات سن لی تھی لیکن غرض مند تھا کیا کہتا؟آج چانن شاہ کا لحاظ بھگت رام کو دروپدی کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچا گیا۔موٹر روک کر چانن شاہ بھگت رام کی خواب گاہ میں چلا آیا۔دروپدی نے''آیئے۔آیئے''کہہ کر کرسی آگے کھسکا دی۔

چانن شاہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کھڑے کھڑے پوچھا۔''لالہ جی تیار ہو؟''

''جی ہاں۔۔بس دوا کی شیشی لے لوں۔نہ جانے واپس آتے ہوئے کتنی دیر ہو جائے۔۔۔اور۔۔''

بھگت رام کی بات بیچ میں ٹوکتے ہوئے چانن شاہ نے کہا۔''نہیں جی۔۔ابھی واپس آجائیں گے۔۔نئی موٹر ہے۔ڈھائی گھنٹے میں انبالہ۔۔گھنٹہ بھر وہاں رہیں گے۔اور ڈھائی گھنٹے میں دلی واپس آجائیں گے۔کُل چھ گھنٹے کی بات ہے۔اگر دس پندرہ منٹ میں چل پڑیں تو سوا بارہ بجے تک لوٹ آئیں گے۔''

''نہیں شاہ جی۔شرنارتھی کیمپ میں میرے کم سے کم سوا دو گھنٹے لگ جائیں گے۔''

''چلو زیادہ سے زیادہ تین بجے لوٹ آئیں گے۔ شام سے پہلے۔ اٹھیے۔۔ جلدی کیجیے جتنی جلدی چلیں گے اتنی ہی جلدی واپس آ جائیں گے۔'' دروپدی نے کہا۔ ''اگر دیر ہو جانے کا ڈر ہے۔۔ یا رات وہیں رہنا پڑ جائے تو پھر کوئی بھاری کپڑا یا بستر۔۔۔''

چاتن شاہ نے دروپدی کو بھی اپنی بات پوری نہ کرنے دی اور بھگت رام کا ہاتھ پکڑ کر اسے چار پائی سے اٹھا لیا۔ ''چلیے کسی چیز کے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی لوٹ آئیں گے۔ اگر آپ کو سردی لگتی ہے تو موٹر میں کمبل پڑا ہے۔ اسے اپنے گرد لپیٹ لینا۔ آپ کو تین بجے ضرور گھر پہنچا دیں گے۔''

بھگت رام نے بڑے اطمینان سے نئی موٹر کے نرم گدے پر آرام کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دروپدی جی۔ اگر کوئی شخص کسی کام سے آئے تو اس سے کہہ دینا وہ تین بجے آئے۔''

چاتن شاہ نے بھگت رام کے گھٹنوں پر کمبل پھینکتے ہوئے کہا۔ ''بس آپ کو ڈپٹی کمشنر کو اپنی صورت دکھانی ہوگی اور ہمارا کام بن جائے گا۔ اس کے بعد آپ جہاں جائیں جا سکتے ہیں، موٹر میں پٹرول بہت ہے۔''

لالہ بھگت رام شرنارتھیوں کے لیڈر ہیں۔ صبح سے شام تک ان کے پاس غرض مند شرنارتھی آتے رہتے ہیں۔ وہ سب کی باتیں ہمدردی سے سن کر ان کا کام کر دینے کا جتن کرتے ہیں۔ دروپدی کا سبھاؤ ویسے تو بہت میٹھا ہے اور اپنے پہلو میں ہمدرد دل رکھتی ہے لیکن صبح جاگنے سے پہلے اور رات کو سو جانے کے بعد جو آدمی بھی دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے، وہ اس پر کبھی کبھی بہت خفا ہوتی ہے۔

ابھی موٹر کوارٹر سے باہر نکلی ہی تھی کہ ایک شرنارتھی نے لالہ بھگت رام کے بارے میں آ کر پوچھا۔ دروپدی نے بتایا کہ وہ چاتن شاہ کے ساتھ انبالہ چلے گئے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

''اٹھتے ہیں اور سرمایہ داروں کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اگر آج وہ میرے ساتھ کسٹوڈین کے پاس نہ گئے تو شام کو سامان اور برتن سڑک پر ہوں گے۔'' وہ ابھی گیا ہی تھا کہ دوسرا آن پہنچا۔ ''میرا قرضہ تو منظور کرا دیا ہے، قرضہ کیسے لوں ضمانت کون دے گا۔''

''میرے تبادلہ کے کاغذوں پر آج دستخط ہو گئے ہیں۔ مکان رشتہ دار شرنارتھیوں سے بھرا ہے۔۔ ماں باپ بوڑھے ہیں۔۔ بیوی پورے دنوں پر ہے۔۔ جہاں میرا تبادلہ کیا جا رہا ہے وہاں رہنے

کے لیے خیمے تک کا انتظام نہیں۔''

''میں پشاور میں اے۔ڈی۔ایم تھا۔ یہاں کلرکی ملی ہے۔اس سے بھی جواب کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔''

''بہن جی ایک سو سات بنگلوں کے مالک کو کسی کوٹھے کے برآمدہ میں بھی ٹھکانہ نہ ملے۔آپ ہی کہیے کہ کہاں جا کر سر چھپائیں۔'' درو پدی آج آنے والے تمام شرنارتھیوں کے یہ کام سن کران کو تین بجے آنے کا وقت دیتی رہی۔ پانی کی نرم اور نازک بوندیں مسلسل ٹپک ٹپک کر پتھر میں بھی اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔درو پدی کے پہلو میں تو ماں کا دل ہے۔شوہر گیا۔ بیٹا گیا۔اب عزت بھی جاتی دکھائی دے رہی ہے۔''ایک ادھیڑ عمر کی شرنارتھی کے منہ سے یہ بات سن کر درو پدی اس سے یہ کہنے لگی تھی کہ وہ تین بجے آئے شرنارتھی عورت نے اپنی داستان چھیڑ دی۔آنکھوں کی زبان نہیں ہوتی ،لیکن آنکھیں زبان سے محروم بھی نہیں ہوتیں۔یوں محسوس ہوا جیسے شرنارتھی عورت کی دکھ بھری کہانی اس کی زبان اور درو پدی کی آنکھوں سے سنائی جا رہی تھی۔اس بے خیالی اور بے خودی میں درو پدی دوسرے آنے والوں کو تین بجے کا وقت دینا بھول گئی۔ایک اور عورت جس نے اپنے گورے اور خوب صورت بدن کو چیتھڑے چیتھڑے ہو چکے میلے جیکٹ اور دوپٹے سے بمشکل ڈھانپ رکھا تھا درو پدی کی آتی دکھائی دی۔اس نے اپنے بدن کے اگلے حصے کو چھپانے کے لیے اپنا سر اس قدر جھکا رکھا تھا کہ وہ آنے جانے والے کسی شخص کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔زمین پر نظریں گاڑے ہوئے جب وہ دروازے پر پہنچی تو اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ایک شرنارتھی کا سر اس کے پہلو میں لگا اور وہ دھڑم سے گر پڑی۔اس کے گرنے کی آواز سے درو پدی کو اس موجودگی کا احساس ہوا۔درو پدی نے گرنے والی عورت کو دوسری شرنارتھی عورت کی مدد سے باہر کے کمرے میں بچھی ہوئی میلی اور لوگوں کی جوتیوں کے باعث مٹی سے بھری دری پر لٹا دیا۔کمرے میں بیٹھے دوسرے لوگوں کو درو پدی نے پونے تین بجے آنے کے لیے کہہ کر اٹھا دیا۔گرنے والی عورت کی بے ہوشی دیکھ کر درو پدی کے ہوش گم ہو گئے۔وہ پسینہ پسینہ ہو گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔پہلی شرنارتھی عورت نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔گھبرائی ہوئی درو پدی نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ہارن کی آواز آئی۔کیا تین بج چکے تھے؟۔اوہ۔۔ یہ تو گنیشا ہے۔ناس پٹیا! پچھلے الفاظ درو پدی کے منہ سے نکل تو گئے لیکن وہ کچھ سوچ میں ڈوب گئی۔اس نے اشارے سے گنیشے

کو بلا بھی لیا۔ وہ اس سے کوئی کام کہنے کے لیے ہچکچائی لیکن وہ مجبور تھی۔

''قرول باغ گوردوارہ روڈ پر لیڈی ڈاکٹر کرتار کور کا نام پوچھ لینا۔''

گنیشا ساری دلی سے واقف ہو چکا تھا۔ دروپدی کے منہ سے بات سنتے ہی ٹیکسی لے کر ہوا ہو گیا۔ گنیشے نے فوراً واپس آ کر دلان میں داخل ہوتے ہی زور سے ہارن بجا دیا۔ دروپدی کے کان میں اس وقت شرنارتھی عورت کی ہائے ہائے اور نومولود بچے کی چیخیں سننے میں مصروف تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر دروپدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس حاملہ عورت کی حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے دروپدی کی تعریف کی۔ ''ٹیکسی والے کے چلے جانے کے بعد مجھے خیال آیا۔ میں ٹیلیفون کرا دیتی۔ آپ نے ایک بار اپنا فون نمبر نوٹ کروایا تھا۔'' دروپدی کی بات سن کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''جی وہ گھمنڈا سنگھ جی کا نمبر تھا۔ لیکن اب تو وہ سندیسہ ہی نہیں پہنچاتے۔ پیسے والے آدمی ہیں۔ ہاں۔۔ اگر ان کے اپنے کسی رشتہ دار یا ملنے جلنے والے کا کام ہو تو فوراً آدمی بھیج دیتے ہیں۔'' ''ناس پٹے!۔۔۔ پیسے کا اتنا گھمنڈ۔۔۔''

دروپدی کی ہمدردی پا کر لیڈی ڈاکٹر نے حاملہ شرنارتھی عورت کا اتا پتا پوچھ لیا۔۔ دروپدی نے سارا قصہ سناتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اس کا اتا پتہ ابھی پوچھا ہی نہیں۔ ذرا ٹھیک ہو جائے تو۔۔۔''

''یہ بھی اچھا ہوا۔ اگر سڑک پر ہی بے چاری۔۔۔''

''اچھا بہن دروپدی۔۔ مجھے اپنا دکھڑا رونے بھی آپ کے یہاں آنا تھا۔ لالہ جی کہاں ہیں؟''

''کیوں۔۔ کیا بات ہے۔۔ وہ تو انبالہ تک گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔''

''نہیں جی۔۔ بات کیا بتاؤں۔۔ میں جس گیرج میں کام کرتی ہوں۔ اسے تو آپ جانتی ہی ہیں۔ میں نے دو ہزار روپے لگا کر پارٹیشن ڈالوئی۔ دن بھر کام کرتی ہوں اور وہیں کوچ پر سو جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو گیرج میرے پاس ہے اسے بخشی خوشحال چند ایڈووکیٹ نے اپنے نام الاٹ کروالیا ہے۔''

''ناس پٹے۔۔۔!'' دروپدی منہ میں بڑبڑائی۔

''ہاں بہن دروپدی۔۔۔ فکر سے مجھے تو ساری رات نیند نہیں آتی۔''

تین بج گئے۔۔۔ چار اور پھر پانچ کا وقت ہو گیا۔ لالہ بھگت رام کے کواٹر کے سامنے شرنارتھیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک انبالہ سے واپس نہیں آئے۔

''چانن شاہ کے گھر ٹیلیفون کر کے پتہ لگاؤ۔'' دروپدی کے کہنے پر اس کے چھوٹے بیٹے نے ٹیلیفون ڈائریکٹری دیکھتے ہوئے کہا۔''ان کے گھر تو ٹیلیفون ہے ہی نہیں۔''

''نہیں ہے۔۔۔لالہ جی نے ابھی تو کوشش کر کے لگوا دیا ہے۔'' دروپدی کی یہ بات سن کر ایک شرنارتھی نے کہا۔

''ناس پیٹے''۔۔نقص نکالنے آ جاتے ہیں۔سرمایہ کے بغیر کون سا کام چلتا ہے۔۔۔چانن شاہ لالہ جی کو اپنی موٹر میں بٹھا کر انبالہ لے گئے ہیں۔کام اگرچہ ان کا اپنا تھا۔لیکن لالہ جی کو شرنارتھیوں کی مزاج پرسی کے لیے جانا تھا۔آرام سے گئے ہیں۔آرام سے آ جائیں گے۔'' یہ بات کرتے ہوئے دروپدی نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''ٹیلیفون کے پوچھ گچھ دفتر سے چانن شاہ کا نمبر پوچھ لو۔''

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔؟''

''لالہ چانن شاہ کی کوٹھی سے۔''

''شاہ جی انبالہ گئے تھے۔؟''

''اب آ گئے ہیں۔''

''ان کو ذرا ٹیلیفون دیجئے۔''

''آپ تھوڑی دیر میں فون کیجئے گا۔اس وقت وہ باہر باغیچے بیٹھے ہیں۔چند مہمان آئے ہوئے ہیں۔پارٹی ہو رہی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ لالہ بھگت رام جوان کے ساتھ گئے تھے کہاں ہیں۔؟''

''آپ کون بول رہی ہیں۔؟''

''دروپدی۔۔۔لالہ جی کی بیوی۔''

''ایک دو منٹ انتظار کیجئے۔اپنا نمبر بتا دیجئے۔'' دروپدی اپنا نمبر بتا کر کرتار کور سے باتیں کرنے لگی۔ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو''

''کہیے''

''شاہ جی کہتے ہیں کہ لالہ جی ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی سے ہی تانگہ لے کر شرنارتھی کیمپ چلے گئے

تھے۔موٹر میں پٹرول تھوڑا تھااور شاہ جی اپنے ایک دواور کام کرنے تھے۔شاہ جی شرنارتھی کیمپ سے لالہ جی کو اپنے ساتھ لانا تھا لیکن دوسرے ضروری کاموں میں بہت وقت لگ گیا۔یہاں گھر پر کچھ آدمیوں کو چائے پر بلا رکھا تھا۔اگر وہ کیمپ میں لالہ جی لانے کے لیے جاتے تو ان کو بہت زیادہ دیر ہو جاتی۔اس لیے وہ واپس آ گئے۔"

گئے کا لفظ ابھی کان ہی میں پڑا تھا کہ درو پدی نے "ناس پیٹے" کہہ کر رسیور کریڈل پر دے مارا۔سب کو بات کا پتہ چل چکا تھا۔کام والے لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

رات کا سکون جوں جوں گہرا ہوتا جا رہا ہے درو پدی کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔وہ سڑک پر سے گزرتی ہوئی ہر موٹر کی آواز اپنے مکان میں سنتی۔وہ مغالطے میں دروازہ کھولتی اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی غائب ہو جاتی۔زچہ شرنارتھی عورت کی دیکھ بھال درو پدی کے لیے جاگنے کا اچھا بہانہ ہے۔لیکن ویسے بھی آج اس کی آنکھوں میں نیند آتی تو کہاں سے آتی۔ دسمبر کی رات ہے۔بستر کے بغیر۔۔وہ کوئی بھاری کپڑا بھی ساتھ نہیں لے گئے۔دوا کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی۔اٹھتے بیٹھتے۔شرنارتھی عورت پر کپڑا ٹھیک کرتے کرتے ،موٹر کی آوازوں پر مڑ مڑ کر باہر جھانکتے جھانکتے اور انگیٹھی میں آگ کی راکھ جھاڑ کر سلگاتے سلگاتے درو پدی کی صبح ہو گئی۔آخر کار کل کی طرح منہ اندھیرے ایک موٹر اس کے دلان میں آ کر رکی۔اس کی آواز آج بھی بڑی کھردری ہے،لیکن وہ ہارن درو پدی کے کانوں میں صبح کا راگ معلوم ہوا۔گنیشے نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔میلے کچیلے کمبل میں لپٹے ہوئے لالہ بھگت رام باہر نکلے۔درو پدی دائیں ہاتھ کی انگلی سے کمبل کی موٹائی کا اندازہ لگا رہی تھی اور لالہ جی کہہ رہے تھے کہ شرنارتھی بے چارہ رات سردی کے مارے مر گیا ہوگا۔اس کے پاس ایک ہی تو کمبل تھا جو اس نے مجھے ٹرین میں بٹھاتے ہوئے زبردستی میرے گرد لپیٹ دیا۔درو پدی نے بایاں ہاتھ قمیض کی جیب میں ڈال دیا۔موٹر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔گنیشے کی اڑتی ہوئی جاتی ٹیکسی کو دور تک دیکھتے دیکھتے اس کے منہ سے نکلا۔"اِدھر اس غریب کو دیکھو اور اُدھر ان ناس پٹیوں کو۔"

(پنجابی افسانے ،مرتب ،ہربھجن سنگھ ،مترجم ،مخمور جالندھری ۱۹۷۱ء دہلی)

عنایت الٰہی ملک

''کچھ اپنے بارے میں
پیدائش: کیمبل پور (اٹک)
تعلیم: گورنمنٹ کالج اٹک پنجاب یونیورسٹی ایم۔اے ایل۔ایل۔بی
امریکن یونیورسٹی آف بیروت ۱۹۶۷ (ایم ۔ پی ۔اے) یونیورسٹی آف کیلیفورنیا لاس اینجلز ۱۹۷۴ء (ایم۔پی۔اے) بوسٹن یونیورسٹی
ڈپلومہ ۱۹۶۷ (پبلک ایڈمنسٹریشن)
ملازمت: محکمہ ترقی دیہات نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور۔ بہت دنوں کی بات ہے منو بھائی شفقت تنویر مرزا فتح محمد ملک اور میں کیمبل پور کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آریہ محلّہ راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے گھر میں بسلسلہ ملازمت اکٹھے رہا کرتے تھے۔ منو بھائی اور شفقت تنویر مرزا روزنامہ تعمیر سے وابستہ تھے۔ فتح محمد ملک کالج میں پروفیسر تھے اور میں محکمہ ترقی دیہات میں ڈیویلپمنٹ افسر تھا۔ آگے چل کر میرے ان تینوں ساتھیوں نے ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ منو بھائی عالمگیر شہرت کے کالم نویس شاعر اور ڈرامہ نگار، شفقت اخبار نویس، پنجابی کے بہت بڑے ادیب اور شاعر، فتح محمد ملک پاک و ہند کے صف اول کے نقاد بنے۔ اردو لٹریچر سے میری دلچسپی اور ادبی شعور انہی کی رفاقتوں کا مرہون منت ہے۔

میرے افسانوں میں پت جھڑ کی سلطنت چھوٹے بڑے دائرے آشوبِ آگہی اور لمحے کی قید کے کردار استحصالی اور استبدادی قوتوں سے نبرد آزما ہیں جنہیں وقت کے کسی بے رحم لمحے نے بے بسی اور ناداری کے آواگان میں لا پھنکا ہے جس سے وہ نکلنے نہیں پا رہے۔ یہ لوگ مادی ترقی کے اس دور میں چونے گارے اور پتھر کی طرح استعمال تو کیے جا رہے ہیں مگر ان کے احساسات اور خواہشات کی دنیا میں جھانک کر کوئی نہیں دیکھتا نہ ہی اس معاشرے میں انہیں باعزت مقام دیا جا رہا ہے۔

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در   میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

دوسرا آدمی، تاوان اور ختم ہوئی بارش سنگ کے بیشتر کردار طبقاتی کشمکش کا شکار ہیں اور مادی ترقی کے لیے بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔ قافلہ سخت جاں ایک ایسے بڑے فنکار کی کہانی ہے جو مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنی انا کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور کسی صورت بھی حالات سے صلح کرنے کو تیار نہیں۔ وہ شدید معاشی اور سماجی دباؤ کے باوجود قوت برداشت اور استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

میرے نزدیک افسانہ نہ تو تمام تر فکشن ہوتا ہے اور نہ ہی حقیقت نگاری۔ بلکہ ایک ایسا واقعہ یا منظر جو لکھنے والے کے ذہن میں ڈھل کر ایک کہانی کا روپ دھار لیتا ہے ایک ایسی کہانی جو اپنے اندر پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہو۔ یوں دیکھا جائے تو اصل مسلہ ابلاغ کا ہے۔ لیکن کہانی لکھنے والا اپنے محسوسات قارئین تک پونچا سکا ہے یا نہیں' اس بات کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنی کہانیوں کے بارے میں مزید وضاحت نہیں کروں گا۔'' (پت جھڑ کی سلطنت)

عنایت الٰہی ملک پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی مرحوم کے بیٹے ہیں اور ڈائریکٹر جنرل وفاقی محتسب ریٹائر ہوئے۔ ''پت جھڑ کی سلطنت'' ان کے افسانوں کا واحد مجموعہ ہے اس کتاب کا دیباچہ جناب احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا تھا۔ افسانوں کی کتاب کے علاوہ موسیقی پر انگریزی و اردو میں کتاب اور بے شمار مضامین لکھے۔ عنائیت الٰہی ملک کا مستقل قیام لاہور میں ہے اور وہ ان دنوں شدید علیل ہیں۔

مطبوعات:

پت جھڑ کی سلطنت (افسانے)

سرسنگیت

راگ رنگ

پاکستان میں انتظامیہ کا زوال

Private life of ragas : the story of classical music

پت جھڑ کی سلطنت

عنایت الٰہی ملک

جس طرح ہر لہر محض ایک لہر نہیں ہوتی بل کہ اپنی جلو میں ایک سمندر لیے ہوتی ہے اسی طرح انسان محض ایک فردِ واحد نہیں ہوتا بل کہ اطراف میں ایک عہد لیے ہوتا ہے۔ ایک مکمل عہد۔ وہ عورت بھی ایک عہد تھی۔

میری اس سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہ تھی یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لاہور کا شہر تھا اور غربت کا زمانہ یونیورسٹی کے اخراجات میری استطاعت سے باہر تھے۔ گھر سے جس قدر رقم ملتی تھی ان سے کتابیں اور فیس بھی پوری نہ ہو سکتی تھی۔ رہنے اور کھانے پینے کے لیے ٹیوشن کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ایسے تمام لوگ جو ٹیوشن ادا کر سکتے تھے۔ شہر کے ایسے علاقوں میں رہتے تھے جہاں مجھے اپنی رہائش کے لیے جگہ ملنا ناممکن تھا۔ یونیورسٹی کی کلاسوں سے فارغ ہو کر ٹیوشن پڑھانے کے لیے چل نکلتا تھا۔ ان دنوں گلبرک کی نئی آبادی تکمیل کے مراحل میں تھی۔ مین بلیوارڈ کے اردگرد بڑی بڑی کوٹھیاں بن چکی تھیں اور مضافات میں نئے گھروں کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ چوں کہ اچھے ہوٹل اور رسٹورنٹ ابھی بننے شروع نہ ہوئے تھے اس لیے کچے پکے کمروں کے ہوٹل اور تنور ہی خالی پلاٹوں پر مختلف علاقوں میں چل رہے تھے۔ ایسا ہی ایک تنور میرے راستے میں بھی پڑتا تھا۔ جہاں ایک عمر رسیدہ اور خوش اخلاق عورت بڑی آؤ بھگت کے ساتھ نچلے طبقے کے لوگوں کو جو اطراف میں کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ تنور کے ساتھ بچھی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھا کر بڑے بڑے دیگچوں میں پکی ہوئی دال اور آلو گوشت کے ساتھ نہایت کراری اور گرما گرم روٹیاں کھلاتی تھی۔ یہاں ایک بھیڑ لگی رہتی تھی ان میں کئی لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جنھیں شاید اس دن مزدوری نہ ملی ہو مگر انہیں کھانا ضرور مل جاتا تھا اور کچھ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے واقعی اس خاتون کو پیسے لینے سے دلچسپی نہ تھی مگر کھانا کھلانے پر وہ بضد ہو جایا کرتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی گاہک اس سے آنکھیں چرائے گزر رہا ہوا اور اس خاتون نے آواز دے کر بلایا نہ ہو ''ارے فلانے کہاں جا رہے ہو کھانا نہیں کھاؤ

گے آج! مجھے بھوک نہیں ہے مائی حشمت!!'' بھوک نہیں ہے یا پیسے نہیں ہیں آج ٹھیکدار نے پیسے نہیں دیئے ہوں گے۔ کھانا کھالو پیسے تو آ ہی جائیں گے آج نہیں تو کل دے دینا''۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مائی حشمت نے کبھی کسی سے پیسے مانگے ہوں۔ادھار دینے والا خود ہی چکا دے تو الگ بات ہے۔ کئی مرتبہ لوگوں کو کھانا کھا کر یہ کہتے سنا'' مائی یہ آج کے پیسے ہیں اور یہ پچھلے حساب کے'' جنہیں مائی حشمت بغیر گنے اپنے ساتھ رکھی ہوئی صندوق میں ڈال دیتی۔ایک دو بار کھانا کھانے کے بعد نہ جانے کیوں ان لوگوں سے لگاؤ سا ہوگیا اور اس تنور کے ساتھ ایک کشش سی پیدا ہوگئی۔ کھانے کا وقت آتا تو پاؤں اس طرف بڑھنے لگتے تھے۔ مائی حشمت کا تنور کیا تھا ایک ادارہ تھا۔ وہاں کھانا کھانے والے بیشتر کلرک منشی اور مزدور قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ غالباً میں واحد سٹوڈنٹ ہوں گا۔ صاف ستھرے کپڑے اور پتلون پہننے کی بدولت مائی حشمت نے مجھے باؤ جی کا خطاب دے رکھا تھا۔ مجھے بٹھانے سے پہلے اپنے جھاڑن سے چٹائی صاف کرتے ہوئے کہتی ''اس کے کپڑے میلے ہو گئے تو کون صاف کرکے دے گا۔ بچارہ پردیسی بابو ہے یہاں اس کا کون ہے۔اس کم بخت پڑھائی کے لیے جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے۔'' اور واقعی ان دنوں کی پڑھائی اور خاص کر ان معاشی حالات میں مجھے بہت دوبھر نظر آتی تھی۔ مائی حشمت کے تنور تک آتے آتے تھک کر چور ہو جاتا تھا۔

مائی حشمت کے تنور کے اردگرد ایک پوری کچی آبادی بن گئی تھی۔نئی کوٹھیوں کا ریلا ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکا تھا مگر ٹاون پیلنگ والوں نے ساری زمین خرید رکھی تھی اور کچی آبادی والوں سے ان کا مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ لوگ کئی برسوں سے اپنے کچے مکانات بغیر بجلی پانی کی سہولیات کے آباد کئے ہوئے تھے۔نزدیک کی عورتیں بھی آٹے کی پراتیں اٹھانے وہاں قطار لگائے اپنی باری کا انتظار کرتی تھیں اور مائی حشمت نے کچھ ایسا نظام بنا رکھا تھا کہ لوگوں کو کھانے بھی کھلاتی رہے اور روٹیاں بھی لگاتی جائے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی عورت شاید ہی ناراض ہوا کرتی تھی ان کے ساتھ ان کے گھریلو مسائل بھی طے کرتی جاتی تھی اور گاہکوں کی سروس بھی چلتی رہتی تھی۔ وہیں تنور پر بیٹھے بٹھائے ان کے جھگڑے بھی طے کرتی تھی ان کے بال بچوں کی بیماری سے متعلق ٹونے ٹوٹکے اور مشورے بھی بہم پہنچایا کرتی تھی۔ یوں تو وہاں آنے والے تقریباً سب ہی لوگ دوسرے گاؤں قصبوں سے آکر آباد ہوئے تھے۔مگر میرے پردیسی ہونے کا اسے کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ باؤ شاہد اپنے وطن سے کتنا دور ہے' دوسرا شہر اسکی زبان میں دوسرے وطن کا

درجہ رکھتا تھا۔

''باؤ شاید رہتے کہاں ہو؟

''دھرم پورے میں۔''

''ارے دھرم پورے سے یہاں تک پیدل چل کر آتے ہو گے؟

''نہیں کہیں پیدل اور کہیں سے بس لے لیتا ہوں۔''

اس سے نہ صرف وہ خود پریشان ہو جایا کرتی تھی بل کہ دوسروں کے دل میں بھی میرے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے رہنا جیسے اس کا مشغلہ تھا۔ اور پھر ایک دن اس نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔ جیراں! باؤ شاہد کا تو ہی کچھ خیال کر لے۔ تیرے پاس گلی کی طرف کھلنے والا ایک کمرہ خالی پڑا ہے۔ وہ اسے دے دو۔ دس پندرہ روپے کرایہ دے دیا کرے گا۔ کتنی دور سے چل کر آتا ہے۔ یہ ہم لوگوں کے پاس پڑھ لکھ کر افسر بنے گا تو ہمارے کام آئے گا۔

یہ سب کچھ حشمت نے ایسے یقین اور فیصلہ کن انداز میں کہا جیسے ہم دونوں اس کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ حالانکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور جیراں تو جیسے چونک اٹھی تھی اس کی بات سن کر بولی۔

''کیا کہا مائی حشمت۔ کون سا کمرہ! مجھے کرائے پر تو نہیں دینا کوئی کمرہ اور اس میں ذوالفقار کے ابے کا سامان بھی تو رکھا ہے اور وہاں بتی ہے نہ دیا۔ باؤ جی بھلا وہاں کیسے رہیں گے۔''

مائی حشمت کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کسی بات کو ڈھکا چھپا نہیں رہنے دیتی تھی اور نہ حقیقت کا اظہار کرنے میں پس و پیش کرتی تھی چاہے وہ ظاہر ہو کر کتنی ہی تلخ کیوں نہ نظر آنے لگے۔

''جیراں پتر! اب کدھر آئے گا ذوالفقار کا ابا تو جانتی ہی تو ہے اسے ولایت گئے دس برس ہونے کو آئے۔ پچھلے سال اس کا بھائی صادق تجھے میرے سامنے بتا کر گیا تھا کہ اس نے میم سے شادی رچالی ہے اور ولایت میں آباد ہو گیا ہے وہ کیونکر آنے لگا تیرے گھر، اور پھر اس نے تجھے آج تک ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا وہاں جا کر وہ کسی کام کا ہوتا تو تجھے آج کوٹھیوں میں کپڑے دھونے پڑتے اور مزدوریاں کرنا پڑتیں؟''

مائی حشمت نے ایک ہی فقرے میں نہ صرف جیراں کے ایک نہایت ہی نجی معاملے کو کھول کے رکھ دیا تھا۔ بل کہ جو لائحہ عمل تجویز کر رہی تھی اس سے مجھے سخت خفت ہو رہی تھی۔ نہ جانے میں کس حیثیت میں جیراں کا کرایہ دار بنایا جا رہا تھا۔ یوں جیراں سے تنور پر ملاقات تو ہوا کرتی تھی مگر آج پہلی مرتبہ میں نے

جیراں کا ردعمل دیکھنے کے لئے اس کے چہرے پر ایک ٹٹولتی ہوئی نظر ڈالی ۔ اسے یہ بتانے کے لئے کہ میرا اس منصوبے میں کوئی حصہ نہیں اور اگر آپ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو میں اس میں بالکل شریک نہیں تھا اور پہلی بار تیس پچیس برس کی اس سانولی سی ان پڑھ عورت کے چہرے میں لگی ہوئی ذہین گہری اور چمکدار آنکھوں پر میرے نظر پڑی ۔ یہ آنکھیں کس قدر اجنبی لگتی تھیں ۔ اس کے چہرے پر ۔۔۔۔۔ مگر مجھے یکبارگی یوں محسوس ہوا جیسے صرف اور صرف وہ آنکھیں مجھے پہلے سے جانتی ہیں ۔ اس کا چہرہ نہیں ۔ بڑی بڑی سیاہ غلافی آنکھیں جو مجھ سے کہہ رہی تھیں یہ سب مائی حشمت کا قصور ہوگا ۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا ساتھ ہی ان میں بیچارگی بیکسی مجبوری خودداری کی ایک تڑپ دکھائی دی اور وہ گھبراہٹ میں آٹے کی پرات اٹھا کر چلنے لگی ۔ تو مائی حشمت نے ایک ڈانٹ کے ساتھ بیٹھا دیا " کہاں چلنے لگی ہے تیری باری آ گئی ہے ۔" روٹیاں لگوا کے جانا اور وہ اُدھی جھکی پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی مگر نہ تو اس نے کسی کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی بس اس نے نظریں آٹے کی پرات پر گاڑے رکھیں ۔ ان آنکھوں سے کیا برس رہا تھا ۔ ملگجا پانی یا حسرت ، میں کچھ بھی نہ دیکھ پایا ۔ مگر میرے سارے جسم میں سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ جیسے کنارے پر کھڑے ہوئے سمندر کی ایک یخ بستہ لہر نے مجھے آلیا ہو ۔ لوگ کیا سوچتے ہوں گے اور کیا سوچیں گے جب میں اس کے گھر پر آ کر رہوں گا ۔ جیراں اگرچہ عمر میں مجھ سے دس بارہ برس بڑی ہوگی مگر پھر بھی وہ ایک عورت تھی ۔ پھر لوگ شہروں میں پے گیسٹ کے طور پر بھی تو رہتے ہیں ۔ میں ایک غریب عورت کے پاس اس حیثیت میں ٹھر گیا تو کیا حرج تھا مگر یہ مجھ سے کون کہہ رہا ہے کہ میں مائی حشمت کی تجویز سے اتفاق کرلوں اور مجھے محسوس ہوا جیسے اپنے اندر ایک انجانے جذبے نے یہ ارادہ کرلیا تھا ۔ اگرچہ اس ارادہ پر میں خود حیران ہو رہا تھا ۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ مائی حشمت نے مجھے کہا

" باؤ شاید تم کل اپنا سامان لے آنا میں قادرے کو کہوں گی وہ اپنا بیٹرہ لے کے تیرے ساتھ چلا جائے گا ۔ سمجھے ! سردیاں آ رہی ہیں اور تم یوں میلوں میلوں کے فاصلے طے کرتے بیمار ہو جاؤ گیا اور پھر جتنی بچوں کو پڑھاتے ہو وہ سب نزدیک کوٹھیوں والوں کے ہیں ۔ تمہیں کتنی آسانی ہو جائے گی ۔"

" مگر مائی حشمت ۔ ۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جیراں روٹیاں لگوا کر کچے گھروں کی طرف جا رہی تھی ۔"

" باؤ جی اگر مگر چھوڑو میں نے جیراں کو رضامند کرلیا ہے تم کل سامان اٹھا کر لے آنا گھر کا آرام بھی

ملے گا اور دو وقت کا کھانا بھی تمہاری جو توفیق ہو گی جیراں کو دے دیا کرنا وہ جھگڑا کرنے والی عورت نہیں''اور میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔

دوسرے روز تنور پر کھانا کھاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر مائی حشمت کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی یہ کہ میں دھرم پورے میں ایک کمرے میں بڑے آرام سے رہ رہا ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں اور جیراں کے ساتھ میرا رہنا مناسب نہیں مگر مائی حشمت نے میری ایک نہ سنی قادرے کا ریہڑہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔قادرے نے مجھے تقریباً گھسیٹ کر ریڑھے پر براجمان کیا اور یہ جا وہ جا۔میرے پاس سامان ہی کتنا تھا ایک سوٹ کیس کتابوں کی ایک گٹھری چائے کے چند برتن ناشتہ بنانے کا ایک فرائی پان ایک چار پائی بغیر پالش کا ایک میز دو تین کرسیاں اور ایک الماری یہی سامان لے کر غروب آفتاب کے ساتھ ہی ہم جیراں کے گھر پہنچ گئے۔جیراں نے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر رکھا تھا۔یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو میرے اس قدر سامان کے ساتھ ہی بھر گیا۔گارے سے چنی ہوئی اینٹوں کے اس کمرے میں نہ جانے قلعی کیے ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا تھا۔قادرے نے جیراں کے دو چھوٹے بچوں کی مدد سے میرا سامان اٹھا اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر رکھا اور پھر قادرے نے جیراں کو آواز دی۔

''جیراں بہن باؤ شاید کو چائے نہیں پلاؤ گی کیا''۔

وہ بیچاری مٹی کے روغنی پیالوں میں نمکین چائے بنا لائی اور میں نے قادرے کے ساتھ بیٹھ کر پی۔قادرے نے سامان کی ڈھلائی کے پیسے لینے سے صاف انکار کر دیا اور مائی حشمت کا نام لے کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔''مائی حشمت سے میری پٹائی کروانی ہے کیا اس نے مجھے بیٹے کی طرح پالا ہے اور یہ ریہڑہ بھی اس نے بنوا کر دیا تھا۔''وہ رب راکھا کہہ کر چل دیا اور میں اپنی چار پائی پر گر گیا۔ریڑھے پر دھرم پورے آنے جانے سے بدن کے جوڑوں میں درد ہو رہا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد جیراں نے صحن میں کھلنے والے کمرے پر دستک دی۔

''صاحب کھانا لے کر آؤں کیا''؟

جیراں صاحب لوگوں کی کوٹھیوں میں کپڑے دھونے اور اوپر کی صفائی کا کام کیا کرتی تھی اور مجھے بھی پتلون پہنے دیکھ کر صاحب ہی سمجھتی ہو گی۔

''نہیں جیراں کھانا میں تنور پر ہی جا کر کھاؤں گا اور وہاں تم مجھے شاید باؤ ہی کہا کرو میں صاحب نہیں

ہوں۔"

میں چارپائی سے اٹھ کر لالٹین کی روشنی میں اپنی کتابیں ترتیب سے رکھنے لگا۔

"مگر میں نے تو کھانا تیار کرلیا ہے جی بچے کہہ رہے تھے ہم کھانا شاید باؤ کے ساتھ کھائیں گے یہ بھی آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

میں نے ان لوگوں کا دل رکھنے کے لیے کھانے کی ہاں کردی۔ جیراں کے دو بچے تھے سلیم اور ظفر بڑا بیٹا سلیم دس برس کا تھا اور ظفر آٹھ برس کا۔ جیراں کی شادی اوائل عمر میں ہوئی ہوگی کیوں کہ اب بھی وہ مشکل سے تیس پینتیس برس کی لگتی تھی دراز قد اور تنومند۔ جیراں اگر ڈھنگ کا لباس پہنے ہوتی تو ایوا گارڈ دکھائی دیتی۔ لمبے بالوں اور غلافی آنکھوں والی جیراں کو خدا جانے اس کا خاوند کیوں چھوڑ گیا تھا اور ایسے پیارے پیارے بچے۔ وہ مجھ سے بہت جلدی مانوس ہوگئے تھے میں یونی ورسٹی سے واپس آتا تو میری ٹانگوں سے لپٹ جاتے جیسے دن بھر میرے منتظر رہے ہوں۔ میں بھی ان کے لیے گاہے گاہے کوئی نہ کوئی چیز لے آتا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کبھی باپ کی شفقت اور محبت نہ ملی تھی۔ میں ان کے لیے شروع دن ہی سے اجنبی نہ تھا جیراں انہیں میرے ساتھ مل بیٹھنے اور لپٹتے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک پیدا ہوجاتی اور دوسرے ہی لمحے تیزی سے وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی رندھی ہوئی آواز آتی۔

"چھمے اپنے بھائی کو لے آؤ بیٹا صاحب کو آرام کرنے دو"

کچھ ہی عرصہ بعد میں نے جیراں کو سمجھا بجھا کر دونوں بچوں کو ایک سکول میں داخل کروادیا۔ سلیم نے دوسری جماعت تک پڑا تھا اور اپنے باپ کے ولایت جانے پر سکول چھوڑ دیا تھا۔ رات کو جب بھی مجھے وقت ملتا میں انہیں تھوڑا بہت پڑھا دیا کرتا تھا۔ جیراں دو وقت کا کھانا پکادیا کرتی تھی اور اس لیے سودا سلف میں خود ہی لایا کرتا تھا میرے لیے وہ الگ ہی پکایا کرتی تھی۔ کھانا جو بھی پکاتی بہت مزے کا ہوتا تھا۔ بڑی کوٹھیوں میں پارٹ ٹائم کام کرتی تھی اور شاید ایک آدھ کوٹھی میں دوپہر کا کھانا بھی پکایا کرتی تھی اس لیے کھانا بنانے میں اسے کافی مہارت تھی۔ یوں وقت گزرتا گیا اور میرے یونی ورسٹی کے امتحان قریب آگئے رات رات پڑھنے سے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ شام کو ٹیوشن پڑھا کر آتا تو پڑھائی میں جت جایا کرتا تھا۔

سردیوں کا موسم تھا اور میرے کپڑے بھی موسم کے مطابق نہ تھے۔ ایک شام کو گھر آیا تو بخار نے آ لیا! جیراں کو اس شام میں نے بے حد پریشان پایا اسے میرے بخار کی وجہ سے بے حد تشویش تھی۔ بار بار کمرے میں آتی اور کہتی کہ نزدیک کوئی ڈاکٹر بھی تو نہیں ہے بخار کیسے اترے گا۔ بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا شاید ملیریا تھا میرے جسم کو کپکپی لگی ہوئی تھی، رات کافی ہو چکی تھی اور وہ ہر گھنٹے کے بعد چولھا جلا کر چائے لے آتی کمرہ بے حد سرد تھا میرا ایک کمبل جو پرانا ہونے کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکا تھا، نا کافی تھا۔ جیراں نے اپنا کمبل پہلے ہی میرے اوپر اوڑھا دیا تھا مگر پھر بھی اس کی پریشانی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ جیراں میری پٹی سے لگی بیٹھی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر مجھے یوں لگا جیسے اس کی تمام حدت میرے اندر سمٹ کر آ گئی ہو۔ دوسرے دن میرا بخار تو اتر گیا مگر جو احساس مجھے ہونا چاہیے تھا وہ شاید جیراں کو تھا اور وہ بھی شدت کے ساتھ کیوں کہ اس نے میری موجودگی میں میرے کمرے میں آنا بند کر دیا تھا۔ دو تین روز میں میں نے یونی ورسٹی جانا شروع کر دیا امتحان آئے اور گزر گئے میں اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا۔

جیراں کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نہ آئی صبح کا ناشتہ اور دو وقت کا کھانا وہ باقاعدگی بنا کر بچوں کے ہاتھ بھجوا دیا کرتی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں، پہلی بارش جو ویرانے پر کھل کر برس جائے اس کا شکر ادا کیا جائے تو کیسے کیا جائے اور ایک ایسے جذبے کو جو رگ و پے میں ایک انجانی سی خوشبو کی طرح بس گیا ہو کس کا مرہون منت قرار دیا جائے۔ یہ جذبہ کئی دنوں تک میرے جسم کے تار و پود میں ایک نغمہ بن کر گونجتا رہا۔ پھر اس کی لہریں میرے ذہن کی سطح پر بھنور بنتی گئیں اور میں عجیب طرح کی الجھنوں میں محبوس ہو کر رہ گیا اور اس احساس نے ایک دن مجھے جیراں کے گھر کے اس گوشہ کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا جہاں مجھے جنت کے نشان ملے تھے۔

ایک شام کو میں نے چند کتابیں اور کپڑوں کے چند جوڑے بیگ میں ڈالے اور کسی کو کہے سنے اور ملے بغیر اس اکیلی بستی سے چل پڑا۔ تنور کے قریب سے گزرا تو مائی حشمت نے آواز لگائی ''باؤ شاہد کہاں چل دیئے۔'' اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ''یونہی جی اداس ہے ماں جی کئی مہینے ہو گئے گھر سے کوئی خط نہیں آیا اور سال بھر سے گاؤں نہیں گیا سوچا خبر لے آؤں۔''

''خدا حافظ شاہد باؤ۔۔۔۔۔۔ جلد لوٹ آنا اور گاؤں پہنچ کر چھٹی ضرور بھیجنا۔'' اسی لمحے میں نے

اجنبی ہوئی نظروں سے تنور کے اطراف میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھا تو جیراں پہ نظر پڑی وہ بھی ایک لمحے کے لیے،ان آنکھوں میں وہی لازوال روشنی اور چمک تھی جس سے زندگی جلا پاتی ہے اور سکون وطمانیت کی بارش برستی ہے۔۔۔اور جیسے وہ اک نگاہ میں بس اتنا ہی کہہ پائی ہو کہ مجھے معلوم ہے تم کیوں جا رہے ہو اور یہ بھی کہ تم اب لوٹ کر نہیں آؤ گے!

میں واقعی لوٹ کر آنے کے لیے نہیں جا رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا میں اس کا فیصلہ بھی نہ کر سکا۔ پھر سوچا گاؤں ہی چلے چلو۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا اماں کا انتقال ہو چکا تھا مجھے اطلاع اس لیے نہ دی جا سکی کہ میرا کوئی پتہ یا ٹھکانہ کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ کچھ دن گاؤں میں رہ کر اپنی تھوڑی سی زمین اور اپنا چھوٹا سا گھر میں نے اونے پونے اپنے رشتہ داروں کے ہاتھ بیچ دیا۔اب میں پھر تنہا تھا بالکل تنہا اپنی ساری جمع پونجی لے کر میں کراچی چلا گیا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی اب کیمکل انجینئرنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری میرے پاس تھی۔

بڑی تگ و دو کے بعد مجھے گھی کی ایک مل میں میری توقعات کے خلاف ایک بڑی نوکری مل گئی۔مل کے مالک نے مشرقی پاکستان سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد کراچی میں آ کر یہ مل لگائی تھی۔شروع میں تو انہوں نے میری قابلیت کا اچھی طرح جائزہ لیا اور جب انہیں پوری طرح تسلی ہوگئی کہ میں واقعی اپنے کام میں مہارت رکھتا ہوں تو وہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئے اور مجھے اپنے گھر پہ بلانے لگے۔کلفٹن میں ان کی ایک وسیع وعریض کوٹھی تھی۔ان کی دو بیٹیاں تھی بڑی اپنے میاں کے ساتھ امریکہ میں رہتی تھی اور چھوٹی بیٹی گھر پر تھی۔وہ بالکل الگ تھلگ اور گم سم رہا کرتی تھی اس کے بارے میں میں نے کبھی پوچھا اور نہ ہی مجھے بتایا گیا مگر کچھ عرصہ بعد میں اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا اور ایک دن احسان صاحب جو مل کے مالک تھے ان سے علیحدگی میں ان کی بیٹی کی اداسی کا سبب ازراہ ہمدردی پوچھ ہی لیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کی شادی مشرقی پاکستان میں کر دی گئی تھی مگر فسادات کے دوران اس کا میاں لاپتہ ہو گیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اسے کارخانے کے مزدوروں میں سے کسی نے قتل کر دیا تھا۔سارا واقعہ سنتے ہوئے مجھے یوں احساس ہوا جیسے میاں صاحب مجھ سے ہمدردی کے علاوہ بھی کوئی توقع رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ان کے پاس لاہور،شیخوپورہ روڈ پر اراضی کا ایک وسیع قلعہ ہے جس پر انہوں نے ایک کارخانے کی داغ بیل ڈالی ہوئی ہے مگر انہیں کوئی قابل اعتماد آدمی نہیں مل رہا جو اس کام کو سنبھال سکے۔ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ

مجھے قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں بشرطیکہ۔۔۔!اور میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کی شرت پوری کرنے کا ارادہ ان پر ظاہر کر ہی دیا۔

ایک سادہ سی تقریب میں میری شادی ان کی بیٹی سے ہوگئی اور میں ان کی کوٹھی میں رہنے لگا۔تھوڑے عرصے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ حماقت اور دور اندیشی کی بنیاد پر کیا جانے والا یہ فیصلہ میری جلد بازی کا نتیجہ تھا۔جس نے میری شخصیت کو یکسر بدل کے رکھ دیا تھا اور میں کس قدر بےبس ہو کر رہ گیا تھا۔وہ خاتون پرلے درجے کی ضدی اور تنگ مزاج نکلی گھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی کوئی بات تال سکے جب چاہتیں اپنے کمرے میں بند ہو کر پہروں جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی تھیں۔میری حیثیت گھر میں ایک فرنیچر کی سی تھی میں گھر میں رکھی جانے والی ایک جزوی شے تھا اور بس! ہم دونوں قانونی طور پر میاں بیوی تھے اور ایک گھر میں رہتے تھے۔میں ایک استعمال کی چیز تھا جسے کارکانے چلانے میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور گھر میں بھی۔!

کچھ عرصے کے بعد شیخوپورہ کارخانہ تیار ہو جانے پر میاں صاحب نے ہم دونوں کے لئے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی اور ہم لاہور پہنچ گئے۔میری بیوی کے ہاں میری توقعات سے پہلے ایک بیٹا ہوا جس کے پیدا ہونے پر نہ میری بیوی کے گھر والوں نے کوئی خوشی منائی اور نہ ہی انہوں نے میرے علاوہ کسی قسم کی حیرت کا کوئی اظہار کیا۔

دن گزرتے گئے اور میں حالات کا عادی ہوتا گیا دن بھر کارخانے کے معاملات میں الجھا رہتا تھا اور رات کو گھر آ کر تھکا ہارا سو رہتا تھا مگر کبھی کبھی سوچتا ضرور تھا کہ یہ زندگی جو میں گزار رہا تھا بظاہر کس قدر شاندار تھی مگر اس میں ملمع کاری کے سوا کیا ہے اور ہم میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے کس قدر اجنبی تھے۔ایک دوسرے کی ضرورتوں نے ہمیں ایک ہی چھت کے نیچے تو لا کھڑا کیا تھا مگر ہمارے درمیان کوئی بندھن نہ تھا ایک شادی کا رشتہ ضرور تھا مگر کتنا بےرنگ اور کتنا بےاثر تھا یہ رشتہ۔کبھی کبھی ذہن ماضی کی طرف لوٹ جاتا اور وہ بستی نظروں کے سامنے پھر جاتی جو اب جنت گم گشتہ ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنا فرق تھا اس مصنوعی زندگی گزارنے میں اور مائی حشمت کی اس کچی آبادی والی جدوجہد اور تگ ودو کی اس بھرپور زندگی میں جو مصائب اور حادثات سے پُر تھی مگر کتنی رواں دواں تھی۔اور یہ زندگی کس قدر ساکت تھی اپنی تمام تر آسائشوں کے ساتھ مگر انسانی جذبوں سے یکسر عاری۔پھر اس غیر متحرک زندگی سے

میں ایک زلزلہ سا آ گیا میری بیوی نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے مجھے کہا کہ اس نے پراپرٹی ڈیلر سے گلبرگ ۳ میں چار کنال کا ایک پلاٹ خرید لیا ہے جہاں کچھ لوگ جھونپڑیاں ڈالے ہوئے تھے اور یہ کہ اس نے زمین خالی کرانے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ مجھے بس اس کے ساتھ جانا ہے صرف اخلاقی فرض کے طور پر باقی سارا کام ہو چکا تھا صرف پلاٹ کا قبضہ لینا باقی تھا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر تھے۔ گلبرک ۳ پہنچتے ہی میرے تخیل میں ایک بجلی سی کوندگئی۔ یہ تو وہی آبادی تھی جہاں آج سے دس بارہ برس پیشتر میں رہا کرتا تھا۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی میں نے دھوپ کی شیشوں والی عینک لگائی۔ میری بیوی نے گاڑی میں ہی مجھے ہدایت دی تھیں کہ مجھے بس اس کے ساتھ رہنا ہے اور ان لوگوں پر کسی قسم کا ترس نہیں کرنا جنہوں نے وہاں پندرہ برس سے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے اور یہ کہ وہ پلاٹ کی پوری رقم اور اسے خالی کرانے کے اخراجات ادا کر چکی ہے۔ وہاں کچھ سرکاری اہل کار اور دوسرے لوگ پہلے سے موجود تھے جو ہمارے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سارا منظر میرے لیے ایک قیامت سے کم نہ تھا ۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مائی حشمتے کا تنور تھا جسے ہمارے آنے سے پہلے ہی توڑا جا چکا تھا اور چار ستونوں اور لکڑی کے چھت پر کھڑے ہوئے اس ہوٹل کو گرایا جا چکا تھا جو مائی حشمتے اس طرح چلایا کرتی تھی جیسے کہ وہ ایک ادارہ تھا۔ ایک تہذیب تھی ایک تمدن تھا مائی حشمتے گھٹنوں میں سر دیئے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہمارے قریب آنے پر اس نے دھندلائی ہوئی بے نور آنکھوں سے ہماری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے تو وہ کیا پہچان سکتی کہ میرے چہرے پر وہ تمام کرختگی اور اور سختی رقم ہو چکی تھی جو سرمایہ داری کی دین ہوا کرتی ہے۔

میری بیوی سے جس نے ایک ہاتھ سے اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے رومال ناک پر دھرے کھڑی تھی۔ وہاں کے کچھ لوگوں نے استدعا کی کوشش کی مگر کرائے پر لائے گئے ہمارے آدمیوں نے انہیں سختی سے پیچھے دھکیل دیا مگر مائی حشمتے نے میلے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سرکاری اہل کاروں اور ہمارے آدمیوں سے نہایت جرات اور بیباکی سے بحث شروع کر دی تھی۔ بی بی جی صاحب جی میرے کوئی بیٹے نہیں جو آج لاٹھیاں اٹھا کر تمہارے مقابلے میں نکل آئیں گے اور میں جانے پاکستان بننے کے بعد ایسی کتنی جگہوں سے اسی طرح نکالی جا چکی ہوں۔ میرے کتنے ہی تنور مٹی تلے دبا دیئے گئے۔ میں نے گزشتہ چالیس برسوں میں اپنی جان کو مصیبتوں میں ڈال رکھا ہے امرتسر سے لے کر لاہور تک پہنچی تھی اب اور اوپر والا جانے کہاں جاؤں گی۔ جب پندرہ برس پہلے یہاں تنور لگایا تھا تو مجھے کہا

گیا تھا کہ یہ متروکہ املاک ہیں اور مجھے یہاں سے کوئی نہیں ہٹائے گا۔ اسٹاموں پر انگوٹھے بھی لگائے اور اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ بھی اہل کاروں کے حوالے اس بھروسے پر کر دیا کہ زمین کا یہ ایک چپہ شاید میرا ہو سکے گا۔ مگر یہ کیسا دیس ہے کونسی سلطنت ہے جہاں میرے لیے ہمیشہ بت جھڑ رہتی ہے۔ میں تو خیر اب قبر میں جانے کی تیاری کر رہی ہوں مگر یہ بستی والے جنھوں نے اپنے اور بیوی بچوں کے کندھوں پر اینٹیں اٹھ اٹھا کر یہ گھروندے بنائے تھے کہاں جائیں گے۔

میری بیوی نے برہم ہوتے ہوئے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے تم نے تو کہا تھا کہ جگہ خالی کرا دی ہے اور مجھے صرف قبضہ لینا ہے'' ان میں سے ایک سرکاری اہل کار نے جس کے سرد چہرے پر وہ تمام سکون اور اطمانیت تھی جو چالیس برس رشوت لینے کے بعد آ جاتی ہے۔ نہایت لجاجت سے کہا۔ بیگم صاحبہ اب تو پلاٹ خالی ہو چکا' صرف یہ چند لوگ یہاں رکے ہوئے تھے۔ یہ بھی جا رہے ہیں!! آپ اپنا قبضہ لیجئے کسی کو کوئی اعتراض نہیں محکمہ نے ان کو معاوضہ دے دیا ہے۔ مائی حشمتے نے ایک بار پھر مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میری تو کوئی بات نہیں۔ میں کہیں بھی پڑی رہوں گی۔ مگر جیراں کا کیا ہو گا؟ اس بیچاری کا خاوند اسے پہلے ہی چھوڑ گیا تھا۔ بیٹے مزدوری کرنے کراچی چلے گئے اور اس کا پکی اینٹوں والا گھر تم لوگوں نے گرا دیا ہے۔ کون سہارا دے گا اسے! میں نے پلٹ کے دوسری طرف کھڑے مردوں اور عورتوں کو دیکھا۔ جنہیں ہمارے آدمیوں نے آگے آنے سے روک رکھا تھا ان میں مجھے جیراں دکھائی دی جو میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ چہرہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح مرجھا چکا تھا مگر وہ آنکھیں ان میں آج بھی وہی چمک تھی' وہی اتھاہ تھی جہاں سے زندگی کی کرن پھوٹتی ہے۔ اس نے دوسری طرف دیکھ کر پھر آخری بار میری طرف دیکھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ میں دوسروں کے لئے اجنبی سہی مگر اس کے لئے نہیں! اور پھر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مائی حشمتے کی پوٹلی اٹھا کر چپ چاپ چل کھڑی ہوئی اور میں زندگی کے اس موڑ پر کھڑا رہ گیا جہاں سے ہلنے کے لئے قیامت کا حوصلہ چاہیے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد میں نے وہاں بالکل اسی جگہ پر اپنی کوٹھی تعمیر کر لی اور جو قطعہ کبھی جنت کی مشقتوں سے آباد تھا۔ میں آسائشوں کی اس جہنم میں رہنے لگا۔

(یہ کہانی ۱۹۵۰ کی دہائی میں لکھی گئی، مشمولہ افسانوی مجموعہ پت جھڑ کی سلطنت)

نام	خلش ہمدانی
ولدیت	ملک شاہ جہاں
پیدائش	۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء
جائے پیدائش	دندہ شاہ بلاول (کیمبل پور، اٹک) حال (چکوال)
تعلیم	بی اے (ایل ایل بی) ایم اے (اردو)

خلش ہمدانی کا نام سرکاری دستاویزات میں الطاف خلش ہمدانی درج ہے لیکن ان کے اہلِ خانہ کے مطابق ان کا اصل نام احمد یار ہے۔ ان کے آباؤ اجداد وادیٔ سون سکیسر کی اعوان قوم کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو وہاں سے نقل مقانی کر کے دندہ شاہ بلاول تحصیل تلہ گنگ ضلع کیمبل پور میں آباد ہوئے جہاں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو خلش ہمدانی کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد ملک شاہ جہاں عہدِ برطانیہ میں پیشۂ سپاہ گری سے وابستہ رہے اور جنگِ عظیم اول میں انگریز سرکار نے تمغۂ شجاعت سے نوازا۔

خلش ہمدانی ابتدائی تعلیم کے لیے دندہ شاہ بلاول کے لوئر مڈل اردو سکول میں داخل ہوئے۔ مڈل ۱۹۳۵ء میں اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول لاوہ سے پاس کیا۔ بعد ازں میانوالی ہائی اسکول میں داخلہ لیا مگر ایک سال تک یہاں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد سلسلہ تعلیم ادھورا چھوڑ کر پاک فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دورانِ ملازمت پچیس برس بعد ادھوری تعلیم کو مکمل کرنے کا شوق پیدا ہوا تو ۱۹۶۰ء میں پشاور بورڈ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا اس کامیابی کے بعد انہوں نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور ۱۹۶۱ء میں پشاور یونی ورسٹی سے ایف۔ اے اور ۱۹۶۱ء ہی میں اردو آنرز کیا۔ ۱۹۶۲ء میں بی۔ اے اور ۱۹۶۴ء میں پشاور یونی ورسٹی ہی سے ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء میں کراچی یونی ورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن کے لیے جدو جہد کی لیکن یہ سلسلہ ۱۹۶۵ء سے جنگ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پایا۔

۱۹۶۷ء میں فوج سے صوبیدار ریٹائر ہوئے بعد ازاں ۱۹۷۲ء میں حمایت الاسلام لا کالج سے وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وزارتِ قانون میں ملازمت مل گئی لیکن جلد ہی یہ نوکری چھوڑ کر چند ماہ

لاہور میں رہنے کے بعد ۱۹۷۳ میں کیمبل پور (اٹک) تشریف لے آئے اور وکالت شروع کر دی ۱۹۸۶ تک یہیں وکالت کی۔ وہ چند برس ضلع کونسل اٹک کے لیگل ایڈوائزر بھی رہے۔ اس کے بعد دو برس تک تلہ گنگ میں وکالت کی بعد ازاں ایک حادثہ میں ان کی صحت اور بینائی متاثر ہوئی جس بنا پر انہوں نے وکالت کو ترک کر دیا۔

خلش ہمدانی کو شعر و ادب کا ذوق وشوق شروع ہی سے تھا لیکن با قاعدہ طور پر ادبی سفر کا آغاز انہوں نے دورانِ ملازمت کوہاٹ کے قیام میں شاعری پر طبع آزمائی سے کیا وہ ''انجمن ترقی اردو'' کوہاٹ کے رکن بھی رہے تاہم ۱۹۴۲ء میں جب ان کا تبادلہ پشاور ہوا تو یہاں آ کر ان کا ادبی شوق پروان چڑھا اور انہوں نے شاعری پر باقاعدہ اصلاح کے لیے اپنا کلام مدراس یونی ورسٹی کے علامہ محوی صدیقی لکھنوی کو بھیجنا شروع کر دیا بعد ازاں انہوں نے سیماب اکبرآبادی سے بھی اصلاح لی لیکن جلد ہی شاعری ترک کر کے ناول نگاری میں نام پیدا کیا۔ ان کے ناول انڈو پاک میں بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے افسانہ نگاری پر بھی طبع آزمائی کی ان کا ایک افسانہ اکادمی ادبیات اسلام آباد کے میں شائع ہوا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

پشاور کے قیام میں وہ ادبی مجالس میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اور ان کا حلقہ ادب وسیع ہوتا چلا گیا۔ بعد میں جب دوبارہ ان کا تبادلہ پشاور ہوا تو انہوں نے حلقہ اربابِ ذوق پشاور کی بنیاد ڈالی اس حلقے کے قیام پر تمام احباب نے انہیں پہلا سیکرٹری مقرر کیا۔ ان کی سیکرٹری شپ میں باقاعدگی سے حلقے کے تنقیدی اجلاس اور مشاعرے منعقد ہوئے۔

۱۹۵۱ء میں انہوں نے حلقہ اربابِ ذوق پشاور کے زیرِ اہتمام پہلا کل پاکستان مشاعرہ منعقد کیا جس میں ملک کے ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ پشاور میں قیام کے دوران ان کے حلقہ احباب میں ضیاء جعفری، شوکت واسطی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، محسن احسان شامل تھے۔ راول پنڈی کے قیام میں عبدالعزیز فطرت،، قتیل شفائی، باقی صدیقی اور جمیل ملک تھے جب کہ لاہور کے قیام کے دوران احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو اور ن م راشد سے ملاقاتیں رہیں۔ جہلم میں ان کا یارانہ عبدالحمید عدم سے ہوا جو تا دیر قائم رہا۔ ۱۹۹۴ء میں انہوں نے عبدالحمید عدم کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کو ''عدم کی نجی و مجلسی زندگی'' کے عنوان سے سوانح کا روپ دیا۔ خلش ہمدانی نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو دل کا دورہ پڑھنے

سے وفات پائی۔

مطبوعات:

۱۔خون میں ڈوبے تو سحر دیکھی (ناول)۱۹۶۸ء

۲۔تنویر لہو کی (ناول)۱۹۷۰ء

۳۔روئے دکھ کا ساگر (ناول)۱۹۷۰ء

۴۔اک آبلہ پا تنہا سا (آپ بیتی)۱۹۹۲ء

۵۔بات چھپائے گوری (ناول)۱۹۹۴ء

۶۔عدم کی نجی و مجلسی زندگی (سوانح)۱۹۹۴ء

۷۔لمحوں کی آگ (ناول) ۱۹۹۶ء

۸۔سنگِ ملامت (ناول)۱۹۹۶ء

۹۔پیاس کا صحرا (ناول)۱۹۹۶ء

۱۰۔محمد خان ڈاکو (سوانح)۱۹۹۷ء

۱۱۔کتاب عمرِ رفتہ (آپ بیتی)۱۹۹۸ء

۱۲۔پیار تو آگ کا دریا ہے (ناول)۲۰۰۰ء

۱۳۔رسوائیاں کیا کیا (ناول)
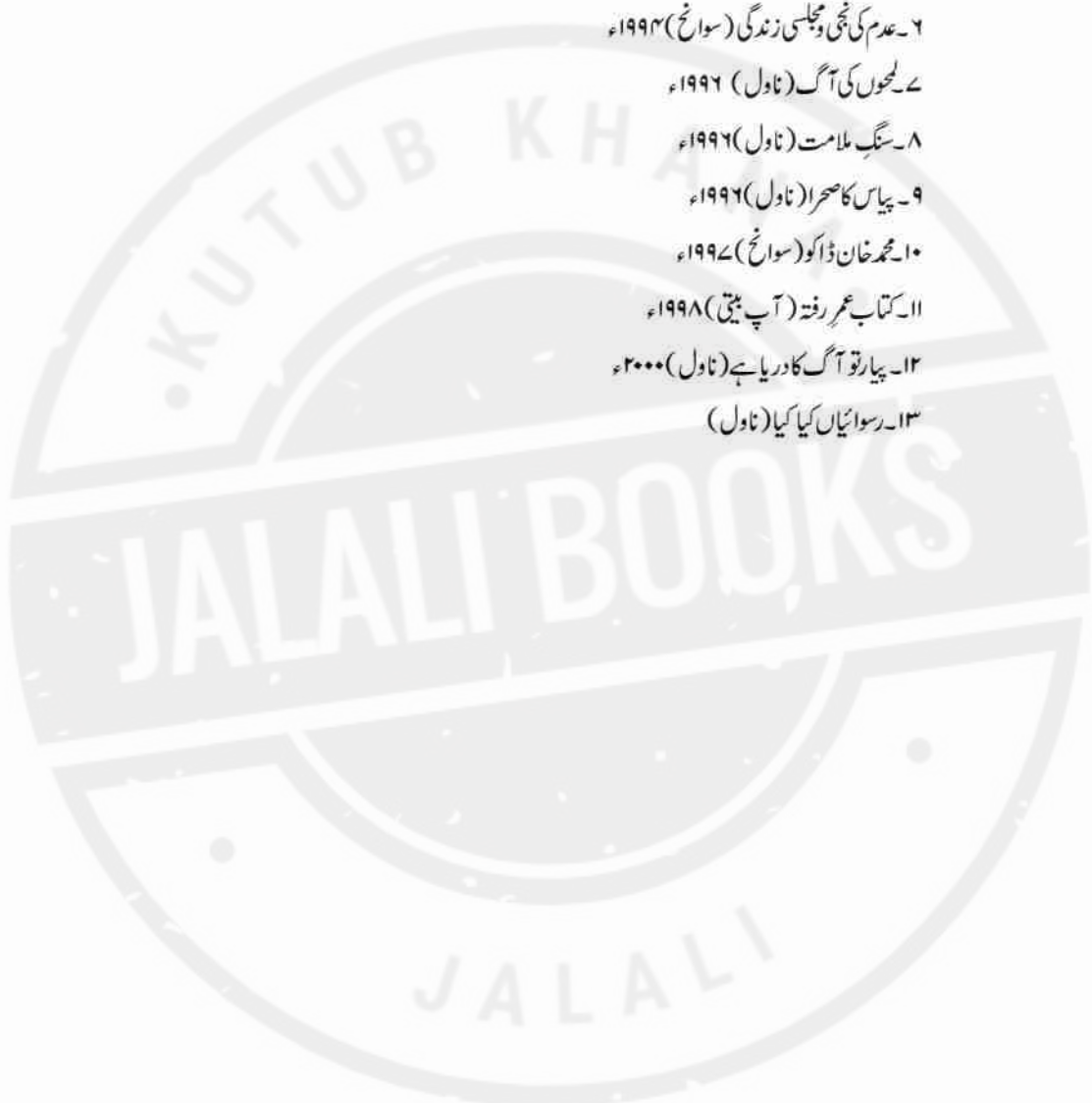
کفن بیچنے والے

خلش ہمدانی

محاذ جنگ سے زخمی ہو کر جب وہ فوجی ہسپتال میں پہنچا تو ایک میجر آپریشن کے ذریعے اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ اسی ہسپتال میں زیرِ علاج اور پھر
ILimb Centre سے مصنوعی ٹانگ لگوا کر فوج سے مستقل طور پر سبکدوش ہو کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے پتہ چلا کہ ملک نے اس کے باپ کو قتل کروا دیا ہے۔ ان کے مکان جلا دیئے ہیں اور ان کے ڈھور ڈنگر ہانک کر اس کے آدمی لے گئے ہیں۔ اس کی جواں سال بہن کو ملک نے اپنی ہوس رانی کے لیے محبوس کر رکھا ہے اور اب اس بات کا قوی امکان ہے کہ جونہی ملک کو اس کی آمد کا پتہ چلا وہ اسے بھی قتل کروا دے گا۔ چنانچہ اس نے مکمل ارادہ کر لیا کہ وہ کل ہی لاہور واپس چلا جائے گا اور وہاں جا کر کوئی عارضی سی ملازمت تلاش کر لے گا۔

دوسری صبح علی خان پہلی لاری سے لاہور جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا جو اس نے پہن رکھا اور اب بہت ہی میلا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے میاں نگر سے ایک جوڑا کپڑوں کا اور بنوا لیا اور پھر شام کی گاڑی سے وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن طلوع آفتاب کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔ وہ تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ کدھر جاوں اگلا قدم کیا اٹھاؤں؟ اس کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہ تھا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا بے مقصد نظروں سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ جب اکتا گیا تو ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ سٹیشن کے بالمقابل ایک ہوٹل میں جا کر ناشتہ کیا۔ اب وہ یہ سوچ جا رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟ اگر چہ اس کیپونٹ لاہور چھاونی ہی میں تھی۔ لیکن وہ وہاں نہ جانا چاہتا تھا۔

شام تک بیساکھیوں پر ادھر ادھر گھسٹتا رہا۔۔۔ آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ کہاں جائے؟ کس کے پاس جائے۔ وہ دو نمبر بس کے سٹاپ پر کھڑا تھا کہ اچانک اس کی نظر اپنی

یونٹ کے ایک پرانے ساتھی مشتاق احمد پر پڑ گئی۔ وہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب مشتاق کو یہ پتہ چلا کہ علی خان اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ وہ کہاں جائے اور رات کہاں بسر کرے تو وہ اسے بصد منت سماجت اپنے ساتھ اپنی یونٹ میں لے گیا۔

وہ دونمبر بس پر سوار ہو گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پاک فورسز سینما کے پاس اتر گئے۔ وہاں سے ان کی یونٹ نزدیک تھی۔ وہ جب اپنی بیرک میں پہنچے تو سب ساتھی باری باری آ کر علی خان سے گلے ملے۔ علی اپنے ماضی کی سب تلخیاں بھول چکا تھا۔ اب وہ اپنے ان جیالے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ رات کے دس بجے تک خوب دھما چوکڑی رہی۔ علی تین روز تک اپنے انہی ساتھیوں کے پاس رہا۔ اس عرصے میں وہ لمب سنٹر بھی گیا۔ اس نے وہاں کے آفیسر انچارج کو بتایا کہ اس کی مصنوعی ٹانگ سفر کے دوران گھو گئی ہے اس لیے وہ دوسری ٹانگ لگوانے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا چونکہ پہلی ٹانگ کی معیاد ابھی پوری نہیں ہوئی اس لیے نئی ٹانگ کی قیمت ادا کرنے کے بعد لگ سکتی ہے۔ چنانچہ نئی ٹانگ اچھی خاصی رقم دے کر اس نے دوبارہ حاصل کی۔

وہ جس دن نئی ٹانگ لگوا کر واپس اپنی پرانی یونٹ میں آیا تو اس کے سب ساتھی بہت خوش ہوئے۔ علی کا زخم مصنوعی ٹانگ کا زخم قبول نہ کرتا تھا، اس لیے معمولی سے رگڑ سے پھر ہرا ہو گیا اور بے احتیاتی سے Septic ہو گیا جس کے باعث اسے پھر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ روزانہ صبح ناشتہ کر کے ہسپتال جاتا اور وہاں سے انجیکشن لگوا کر اور ڈریسنگ کروا کر آتا۔

اب یونٹ میں آئے ہوئے اسے دس دن ہو گئے تھے۔ وہ سوچتا اب زیادہ دیر یہاں رہنا مناسب نہیں۔ ہر جگہ کچھ اچھے لوگ ہوتے ہیں تو کچھ برے۔ وہ سوچنے لگا۔ ابھی تک تو کسی نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی لیکن جلد کچھ لوگ باتیں کرنا شروع کر دیں گے۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ مگر جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ اس بھری دنیا میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ وہ سکون کے ایک لمحے کے لیے بھٹک رہا تھا اور سکون اس سے کوسوں دور تھا۔

اپنے پرانے ساتھیوں سے رخصت ہو کر علی خان اپنی بیساکھیوں پر آہستہ آہستہ چل کر شاہراہ سرور پر دونمبر بس کے سٹاپ پر آ گیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں بینچ پر بیٹھے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ بس آئی تو بڑی مشکل سے اس پر سوار ہوا بس پر سوار ہوتے وقت مسافروں کی دھکم پیل میں ایک دفعہ تو گر پڑا۔ وہ حیران

تھا کہ لوگ اس افراتفری کے عالم میں بسوں پر اس طرح یلغار کرتے ہیں کہ ان کو خواتین، بچوں بوڑھوں اور معذور لوگوں کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ وہ سب کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ وہاں سے سوار ہونے کے تھوڑی دیر بعد راستے میں اتر گیا اور پھر کسی نامعلوم جذبے کے تحت آہستہ آہستہ ایک زیارت کی طرف چل پڑا۔۔۔ کوئی آدھے گھنٹے میں وہ وہاں جا پہنچا۔ اس کو بچپن سے زیارتوں پر حاضری دینے کا شوق تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں تھا تب بھی ہر جمعہ کے دن حضرت شاہ بلاول کے مزار پر حاضری دیتا اور ایک گھڑا نالہ گھمبیر سے لا کر حضرت کے مزار سے ملحقہ مسجد میں رکھتا۔

علی جب اس نئے مزار کے صدر دروازے پر پہنچا تو اس نے بہت سے بھکاری اور ملنگ دیکھے۔ وہ تھوڑی دیر وہاں ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ وہ بھکاری اور درویش نما ملنگ ہر نئے آنے والے کو چاروں طرف سے گھیر لیتے اور جب تک اس سے بخشیش نہ لے لیتے اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔ سادہ لوح دیہاتی اور ستم رسیدہ لوگ جو صاحب مزار سے منتیں مانگنے آتے، ان کا آسانی سے شکار ہو جاتے۔ ان ملنگوں میں عجیب و غریب وضع کے آدمی تھے۔ بعضوں نے تو بڑی بڑی جٹائیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اول تو بات ہی نہ کرتے تھے اور اگر کسی سے کرتے بھی تو عجیب بے تکی باتیں، جن کا نہ سر ہوتا نہ پاؤں۔ سادہ لوح دیہاتی کہتے ''سائیں جی معرفت کی باتیں کر رہے ہیں۔'' اور پھر وہ لوگوں سے پیسے بٹور کر چرس پینے میں مشغول ہو جاتے اور اپنے نئے شکار کی تاک میں لگ جاتے۔

علی خان تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد اندر مزار کے احاطے میں چلا گیا۔ حضرت کے مزار کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا مزار اور اس سے ملحقہ مسجد اور متعلقہ عمارتیں مغل فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ ایک مغل شاہزادے نے حضرت سے قلبی ارادت اور عقیدت کے باعث مقبرہ، مسجد اور یہ عمارتیں تعمیر کروائی تھیں۔ علی خان حضرت کے مقدس مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد باہر چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا اور ان تعمیرات کو بڑی گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے پہلے ایک دفعہ اپنے والد کے ساتھ لاہور آیا تھا تو اس نے حضرت داتا گنج بخش ہجویری کے مزار پر حاضری دی تھی۔ اس کے والد کو حضرت داتا گنج بخش سے بڑی عقیدت تھی اور اس طرح کی محبت، احترام اور عقیدت اب علی کے دل میں بھی تھی۔

وسیع اور کشادہ چبوترے والی عالیشان مسجد دیکھنے کے بعد اسے ایک گونہ مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کا دل ہلکا ہو گیا اور وہ اپنے غموں اور ناکامیوں سے چھٹکارہ پا کر مغل عہد حکومت کے متعلق

سوچنے لگا۔اس زمانے میں تو شہنشاہ بھی اللہ کے ان برگزیدہ درویشوں کے آستانے پر جبہ سائی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے اور آج کا ایک معمولی آدمی بھی ان درویشوں کی عظمت کا قائل نہیں۔اکثر لوگ آج کل یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ موت کے بعد یہ لوگ بھی ہماری طرح مٹی ہو جاتے ہیں۔مر جانے والوں سے بھلا کیا فیض حاصل ہو سکتا ہے۔وہ ایسے لوگوں کی بدنصیبی پر افسوس کرنے لگا۔وہ سوچنے لگا کہ یہ نتیجہ ہے مادہ پرستی کا۔جتنے ہم مادیت کی طرف جھکتے جائیں گے۔اتنا ہی روحانیت سے دور ہوتے جائیں گے اور پھر اتنے ہی انسانی مصائب بڑھتے جائیں گے۔اس نے ظہر اور عصر کی نمازیں حضرت کے مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا کیں اور دن بھر ان بھکاریوں اور مجذوب نما فقیروں کو دیکھتا رہا۔جن کا کام صرف پیسے بٹورنا اور چرس پینا تھا۔وہ سوچنے لگا ہمارے اس معاشرے میں لوگ دیوانوں اور مجنون آدمیوں کو پہنچا ہوا بزرگ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ان کی ہر بے تکی بات میں معرفت نظر آتی ہے۔یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتے،خدا کو کیا پہنچانے گے۔

سورج غروب ہو رہا تھا شفق کی سرخی اسے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی دوشیزہ ستی کی آگ میں جل رہی ہو۔یہ سوچتے ہوئے اس کا من دکھ اور اداسی میں ڈوب گیا۔اسے اس ان دیکھی ستی ورتا دوشیزہ پر اس کی بے بسی پر اور سماج کے ان رسم و رواج پر غصہ آ گیا۔وہ ابھی تک حضرت کے مزار اور مسجد کے درمیان والے چبوترے پر بیٹھا تھا۔اس کا کوئی نصب العین نہ تھا،اس کے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔وہ ایک بھٹکا ہوا مسافر تھا جو حوادث کے تھپیڑے سہنے کے لیے ابھی زندہ تھا۔وہ گویا ہوا ''میں نے تو آج عملی زندگی میں قدم رکھا ہے''۔اس نے اپنی زندگی کی ناؤ شورش طوفان کے حوالے کر دی تھی۔

صبح سے اب تک ہزاروں لوگ مزار پر آ چکے تھے کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہ تھا۔جیسے وہ کوئی گندہ کیڑا ہو،جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو اور وہ آہستہ آہستہ گندی نالی میں رینگ رہا ہو۔وہ اس طرح کی بے سروپا باتیں سوچتا ہوا وہاں سے اٹھ کر صدر دروازے سے باہر آ گیا۔اب لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔بھکاری اور فقیر لوگ باہر اپنی اپنی کوٹھریوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔جن کے پاس کھانے کو کچھ تھا،وہ کھا پی رہے تھے اور جن کے پاس کچھ نہ تھا وہ بیٹھے سلفا پی رہے تھے۔شاید انہوں نے کھانا کھا لیا ہو۔علی خان وہاں ہی دیوار کا سہارا لے کر تھوڑی دیر کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جب اس نے ان مجذوبوں کو جو دن میں معرفت کی باتیں کر رہے تھے،ان کو اچھے

خاصے تندرست آدمیوں کی طرح روزمرہ کی باتیں کرتے سنا۔ سوچنے لگا۔ ہر آدمی اپنے معاملات میں کتنا ہوشیار ہوتا ہے، ان لوگوں نے روٹی کمانے کے لیے یہ لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ وہ شرافت کا، پاک دامنی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ان کے اندر کا حریص اور کمینہ آدمی ان کی شخصیت کے اندر جھانکنے والوں کو نظر آجاتا ہے تو ان کا پول کھل جاتا ہے۔ اور وہ بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں اب دلچسپی لے رہا تھا، اس نے داتا صاحب جانا تھا لیکن سوچا آج یہاں ہی ٹھہر جاتا ہوں۔ اب تو پوری عمر داتا صاحب کے قدموں میں رہنا ہے، چلو ان لوگوں کے طور طریقے، ان کی بود و باش تو دیکھوں۔

وہ اپنی بیساکھیوں کے سہارے آگے بڑھا اور ایک غلیظ کوٹھڑی کے سامنے جا کر رک گیا، اندر طاق میں ایک مٹی کا دیا جل رہا تھا اور ایک جھلنگا سی چار پائی پر ایک قبیح صورت، ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ کوٹھڑی سے باہر دو تین بھکاری سلفا میں چرس بھر کر پی رہے تھے۔ وہ باری باری سلفا ایک دوسرے کی طرف بڑھا دیتے۔ اس عورت نے کالے رنگ کے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر پر رنگ برنگی پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ اس کے نقش بتا رہے تھے کہ وہ کسی زمانے میں اچھی خاصی خوش شکل عورت ہو گی۔ لیکن اب تو حوادث کے تھپیڑے سہتے سہتے اس کے نقوش خاصے کھردرے اور بے رنگ ہو گئے تھے۔ اس عورت کی آنکھ میں بلا کی چمک تھی۔ علی نے ایک نظر میں اندازہ لگا لیا کہ یہ بڑی جہاندیدہ عورت ہے۔ وہ اس کی کٹیلی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور وہیں جامد و ساکت بت کی طرح کھڑے کھڑے آنکھیں جھکا لیں۔ جیسے کوئی اپنے گناہ کا اعتراف کر لے۔ اس عورت نے حقہ کی نے ہٹاتے ہوئے۔۔۔ علی سے کہا

''نئے معلوم ہوتے ہو''۔

''جی ہاں''۔

''آج کتنے پیسے کمائے ہیں؟''

''ایک بھی نہیں''

''گھبراؤ نہیں آہستہ آہستہ تمہیں بھی یہ سب ڈھنگ آ جائیں گے''۔

''کتنے عرصے سے یہ پیشہ کر رہے ہو؟''

''ابھی تک تو نہیں کیا۔ آگے کی خبر نہیں''۔

''تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' اس نے یکا یک اپنا لہجا تبدیل کرتے درشتی سے کہا

''کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بے آسرا ہوں''

''تو کسی محتاج خانہ میں چلے جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے کوئی لنگر تو نہیں کھلا ہوا''۔

''بی بی۔ چلا جاؤں گا آپ ناراض نہ ہو''۔

''نہیں اس میں نارضگی کی کوئی بات نہیں۔'' وہ یکا یک لہجہ بدلتے ہوئے نرم پڑ گئی۔۔۔'' داتا صاحب چلے جاؤ۔ یہاں پہلے ہی بہت آدمی ہیں ان کی گزر بسر بھی بڑی مشکل سے ہو رہی ہے۔'' اور پھر اس عورت نے نزدیک بیٹھے ہوئے فقیروں میں سے ایک کو آواز دی۔ ''سائیں فضلو''

''جی مائی جی۔''

''کوئی بچے کھچے ٹکڑے ہوں تو اس نووارد کو دے دو۔''

''نہیں مائی جی۔ کوئی نہیں ہیں۔ اب سو جاؤ کل مالک دے گا تو یہ بھی کھا لے گا۔''

علی نے لجاحت آمیز لہجے میں اس عورت سے کہا۔ ''مائی جی میں پیسے دے دیتا ہوں۔ آپ کوئی آدمی بھیج کر بازار سے کھانا منگوا دیں۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''نہیں ما جی میں نے کہا تھا کہ میں نے کوئی پیسے نہیں کمائے۔''

''تو پھر یہ پیسے اب کہاں سے آئے ہیں۔''

''پہلے کے میرے پاس تھے۔''

''تو دو سائیں فضلو کو'' اور پھر سائیں فضلو سلفا کا ایک کش لگا ان کے پاس آ گیا۔''

علی نے قمیض کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا باہر نکالا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ سائیں فضلو کو دے دیا۔ سائیں کی آنکھوں میں ایک عجیب حریصانہ چمک عود آئی۔ اس نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں مائی گاموں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بات کی۔ مائی گاموں نے بازاری عورتوں کے انداز میں سائیں فضلو کو آنکھ ماری اور جیسے وہ اس کے پس پردہ مقصد کو پا گیا ہو۔ سائیں فضلو نے وہ نوٹ احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور سامنے والی شکستہ سڑک کی جانب چل پڑا۔

تھوڑی دیر میں سائیں فضلو پشاوری نان اور چپلی کباب لے کر آ گیا۔ جب وہ روٹی علی کو دے چکا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف کاغذ کی بنی ہوئی ایک گولی پھینکی اور پھر جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور پھر دوسری جیب سے سگریٹ کی ایک ڈبیا اور دو پان نکالے اور یہ سب چیزیں مائی گاموں کو دے دیں۔ اس نے تشکر آمیز لہجے میں سائیں فضلو کو کہا ''بڑے کام کے آدمی ہو'' اور پھر سائیں فضلو اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا جو اس کی لائی ہوئی چرس کو تمبا کو میں ملانے کے بعد ہتھیلی پر اسے رگڑ رہے تھے۔ ساتھیوں نے اسے استفسارانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مال کہاں سے مارا۔''

''خواجہ نے بھیجا ہے۔'' اس کا اشارہ صاحبِ مزار کی طرف تھا۔ وہ سب سلفا کی تیاری میں لگ گئے۔ علی کھانا کھا چکا تو اس نے سائیں فضلو سے پوچھا۔ ''سائیں جی کتنے پیسے باقی بچے ہیں۔''

''ایک بھی نہیں۔''

''ایک بھی نہیں؟ علی نے حیرت کا اظہار کرت ہوئے کہا۔۔۔ ''میں نے تو آپ کو دس کا نوٹ دیا تھا۔''

''دیا ہوگا۔۔ میں انکار تو نہیں کر رہا۔''

''کھانا تو یہ زیادہ سے زیادہ ایک روپے کا ہوگا۔ باقی نو روپے۔''

''جی۔ مائی جی کے لیے ایک پوا اور سگریٹ پان لایا ہوں۔ خود بھی بھوکا تھا، کھانا کھایا ہے۔'' اور پھر ساتھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ان کو بھی راشن پانی چاہئے تھا۔ ان کے لیے سوٹا لایا ہوں۔ بس اتنے ہی پیسے تھے اگر بچتے تو میں تمہیں دے دیتا۔ میں نے کیا کرنے تھے۔ کل خواجہ پیر دے گا۔ فکر نہ کرو۔''

علی نے مائی گاموں کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔

وہ کہنے لگی۔ ''کوئی بات نہیں۔ کل تمہارے پاس نہیں ہوں گے تو ہم دیں گے۔ گھبراتے کیوں ہو؟ آخر دس روپے ہی تو ہیں کون سی بڑی رقم ہے۔''

علی شرم کے مارے چپ ہو گیا۔

مائی گاموں نے سائیں فضلو کو بازاری عورتوں کے لہجے میں بلایا اور کہا۔ ''سائیں جی۔ آج رات چن جی کو اپنی کوٹھڑی کے ساتھ سلانا۔''

''اچھا بی بی جی'' اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیئے۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھتے ہیں۔ اور پھر مائی گاموں نے اپنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر لیا۔

سائیں فضلو اور اس کے ساتھی کوئی گھنٹہ بھر تک اپنے شغل میں مصروف رہے۔ پھر جمائیاں لینے لگ گئے اور ان کی آنکھیں بوجل ہوتی گئیں۔ علی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ ان کی محفل جب برخاست ہوئی تو سائیں فضلو نے آہستہ سے مائی گاموں کا دروازہ کھولا اور اس سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں اور پھر اپنی کوٹھڑی کی طرف کسی بہکے ہوئے شرابی کی طرح بوجل قدموں سے چل پڑا۔

سائیں فضلو اس کے دو ساتھی اور علی خان تنگ و تاریک سی کوٹھڑی میں آ گئے۔ جس میں سے ایک عجیب سے بدبو آ رہی تھی۔ علی اس نئے ماحول میں بے حد گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ سوچنے لگا۔ ''آخر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں اس نے دل پر جبر کیا اور اپنے آپ کو حالات کے نئے دھارے کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ سائیں فضلو نے دیا سلائی جلا کر ہلکی سی روشنی کی۔ اسے ایک لمحے کے لیے کوٹھڑی کے اندر کا حصہ نظر آیا۔ وہاں دو تین گدڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ سب ٹٹول ٹٹول کر اپنی اپنی گدڑیوں میں گھس گئے۔

سائیں فضلو نے ایک کونے میں اپنے ساتھ پڑی ہوئی گدڑی علی کو دی، وہ چپکے سے اس میں لیٹ گیا اس گدڑی سے اسے بہت گندی بو آنے لگی لیکن وہ اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی، وہ اپنے ماضی کو یاد کرنے لگا سب واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے۔ وہ سوچنے لگا ایک وقت تھا میں کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ مستقبل کی تین حسین آرزوں تھیں۔ بہتر زندگی گزارنے کے حسین خواب تھے۔ لیکن حالات کے حصار نے اس ے زندگی کے کس موڑ پر لا کھڑا کیا۔ وہ آج بھکاریوں اور کنگلو کا محتاج بن کر سر چھپانے کے لیے اس تعفن زدہ کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔ اسے کنڈ کی ہری بھری چرا گائیں، اپنا ریوڑ ایک ہنستا بستا گھر ماں باپ حالی یاد آ رہے ہیں۔ وہ حالات کی ستم ظریفی پر غور کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا بلکہ مستقبل کی اندھیاری خلائیں تھیں۔

اس کے ساتھ اس کوٹھڑی میں دوسرے سوئے ہوئے آدمی خراٹے بھر رہے تھے۔ سامنے مائی گاموں کی کوٹھڑی سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں اب تک پھوٹ رہی تھیں۔ سائیں فضلو نے کروٹ بدلی اور علی خان کے بالکل قریب آ گیا۔ علی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور چپ سادھے پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد

سائیں فضلو نے اپنی ایک ٹانگ اس پر ڈال دی۔ جیسے کوئی گھوڑے پر سوار ہوتے وقت رکاب کا سہارا لے کر گھوڑے پر پلٹتے ہوئے ڈالتا ہے۔علی خان تھوڑا پرے کھسک گیا اور سائیں فضلو کی ٹانگ نیچے زمین پر آرہی۔اب تک علی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب انجانے میں ہوا ہے۔وہ تھوڑی دیر اسی حالت میں پڑا رہا کہ پھر سائیں فضلو نے تھوڑا آگے کو کھسکتے ہوئے اس کے ازار بند پر جا ہاتھ مارا۔علی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر اسے دو تین لاتیں زور سے ماریں۔

'' کتے کے بچے تو نے مجھے کیا سمجھا ہے۔میں کوئی آوارہ لڑکا ہوں۔۔۔نہیں۔۔''

سائیں فضلو نے چپ سادھ لی کوٹھڑی میں سونے والے ملنگ بیدار ہو گئے تھے۔انہوں نے جب علی سے صورتحال پوچھی تو اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔علی خان اٹھ کر کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔مائی گاموں نے جو شور سنا تو وہ بھی نکل آئی اس نے علی کو یوں کھڑا دیکھا تو پوچھنے لگی۔

''کیا بات ہے۔کیوں باہر کھڑے ہو؟''

''تمہارے ان پالتو کتوں نے مجھے لڑکی سمجھ لیا ہے۔''

''آخر بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے۔''

'' کیا بتاؤں ،تو خود نہیں سمجھ سکتی کہ کیا ہوا ہے۔سائیں فضلو حرامی اپنے سفلی جذبات کی تسکین چاہتا تھا،اور کیا ہوا ہے۔''

''گھبراؤ نہیں ،ادھر اندر میرے پاس آ جاؤ۔یہ ساتھ گھر والے لوگ خواہ مخواہ اکٹھے ہو جائیں گے۔بیکار میں سبکی ہو گی۔''

''اکٹھا ہو جانے دو لوگوں کو،تا کہ میں ان کو بتا سکوں کہ اولیائے کرام کے مزارات پر رہنے والے یہ ملنگ اور بھکاری کتنے ذلیل اور گندے ہوتے ہیں۔''

''چھوڑ وان کو تم ادھر آ جاؤ میرے پاس۔اور پھر مائی گاموں نے آگے بڑھ کر علی خان کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں لے گئی۔اسے چار پائی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔''تم ان کی بات کو دل میں جگہ نہ دو۔۔وہ تو کمینے بھکاری ہیں۔اب عزت اسی میں ہے کہ خاموشی اختیار کر لو۔ورنہ زیارت بدنام ہو جائے گی۔اور پھر محکمہ اوقاف والے ہمیں بھی یہاں سے اٹھا دیں گے۔

''زیارت کو بدنام کرنے والے کمینے اور ذلیل آدمی ہیں۔ایسے آدمیوں کو یہاں سے بھگا دینا

چاہیے۔تم فکر نہ کرو میں سویرے ہی ان کا بندوبست کرتی ہوں۔''اور پھر مائی گاموں نے علی خان کو کہا کہ تم میرے بستر میں ہی سو رہو میں کل ان کنجروں کو یہاں سے نکلوا دوں گی۔''

علی ایک ڈرے ہوئے سہمے ہوئے کبوتر کی طرح چارپائی پر پائینتی کی طرف بیٹھا رہا۔مائی گاموں جو کہ دارو کی چسکی لگا کر اب کافی بے باک نظر آ رہی تھی،پیڑھی سے اٹھ کر علی کے پاس چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔علی نے شام کو جو ادھیڑ عمر کی مائی گاموں دیکھی تھی وہ اب اس سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔ان بوسیدہ کپڑوں کے اندر جو عورت چھپی ہوئی تھی،اس کی جو جنسی جبلت تھی وہ اب اپنا مصنوعی خول اتار کر باہر آ چکی تھی۔وہ کھسک کر علی کے اور قریب ہو گئی۔علی اپنے فطری شرمیلے پن کی وجہ سے ابھی تک سہما ہوا بیٹھا تھا۔ادھیڑ اور تماش بین عورتوں کو جب اس طرح کے ناتجربہ کار اور اناڑی لڑکے مل جائیں تو وہ باولی ہو جاتی ہیں۔ایسی حالت میں وہ جنسی جذبے کی شدت اور تپش سے جل اٹھتی ہیں۔علی کو یوں لگا جیسے یہ عورت کسی اندرونی تپش سے جل رہی ہے یا جیسے اسے کسی زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے اور اس کی سانسیں اب اکھڑی جا رہی ہیں۔

ہوس اور جذبات کی ملی جلی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے پھوٹنے لگی تھیں۔علی خان نے اپنی سادگی اور شرمیلے پن کی وجہ سے جھجک کر آنکھیں جھکائے ہوئے اپنی بیساکھی سے کچے فرش پر لکیریں بنانی شروع کر دیں۔جیسے اپنی قسمت کی لکیروں کو وہ نئے سرے سے ترتیب دے رہا ہو۔ادھر وہ اجنبی عورت اپنے آپ میں ایک نئی زندگی اور روح میں ایک نئی تڑپ محسوس کر رہی تھی۔بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جب اس نے خود کو لباس سے آزاد کرنا شروع کیا تو علی دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کی ایک مجرمانہ کوشش کرنے لگا۔وہ باوجود جھجک اور شرمیلے پن کے بھی اس میں ایک عجیب سا کیف محسوس کر رہا تھا۔مائی گاموں نے ٹمٹماتے ہوئے دیئے ہلکی سی پھونک سے بجھا دیا''ڈرتے کیوں ہو آخر مرد ہو۔میں کوئی سائیں فضلو تو نہیں۔''

''سائیں فضلو اور تم میں کیا فرق ہے۔مجھے تو تم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے ہو۔''

''فرق کیوں نہیں ہے وہ تمہیں جذبات سے لبریز ایک دلربا لڑکا سمجھ رہا تھا۔جس سے وہ اپنی شہوانی جذبے کی تسکین چاہتا تھا۔میں تو تمہیں ایک مرد سمجھ رہی ہوں اور اپنے آپ کو عورت۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ کردار کی ادائیگی مختلف ہے ورنہ گناہ کی آلودگی تو ایک ہی طرح کی ہے۔صاحب

مزار کے تقدس اوراس کی پاکیزگی کا تو کچھ خیال کرو۔تم حضرت کے قدموں میں پڑی ہوئی ہو۔ان کی عظمت کو نہ بھولو۔''

''پاگل ہو۔۔۔۔''

''تمہارے پاس مردوں کی کیا کمی، یہ مشٹنڈے جو تم نے پال رکھے ہیں ۔تمہارے کسی کام کے نہیں۔''

''بندہ روز روز ایک ہی طرح کا کھانا نہیں کھا سکتا،کبھی منہ کا ذائقہ بدلنا پڑ جاتا ہے۔''

''میں رات کی اس تاریکی میں نکل جاؤں گا۔''

''سردی بہت زیادہ ہے نمونیہ ہو جائے گا۔''

''میں رات سڑکوں پر چلتے چلتے ہی گزار لوں گا۔''

''پولیس آوارہ گردی میں دھر لے گی۔''

''اس سے تو اچھا ہے۔''

چھوڑو بھی اور پھر اس بے راہرو عورت مائی گاموں نے ایک معصوم اور ننھے پھول کو مسل ڈالا۔ایک بے سہارا اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے انسان کی مجبوری کو خرید لیا تھا۔مائی گاموں بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی،علی کو یوں لگا جیسے کسی خونخوار دیو نے اپنے فولادی پنجوں میں اسے جکڑ لیا ہو اور اب وہ کبھی اس کی آہنی گرفت سے آزاد نہ ہو سکے گا۔اس کی ہڈیاں کڑ کڑا اٹھیں۔علی خان اب برف کی ایک بے جان سل تھا۔اس عورت نے دیکھا کہ اب اس سے آسودگی حاصل نہیں کر سکتی تو اس نے ایک مشتعل رنڈی کی طرح اسے ایک بھرپور لات ماری اور وہ چارپائی سے نیچے گر گیا۔اور کہنے لگی ''مجھے کیا پتہ تھا کہ تو بالکل زنخا ہے،زنخا۔سائیں فضلو نے ٹھیک ہی کہا ہے،ابھی تیرے چہرے پر بال نہیں آئے۔جا کمائی کر۔۔ابھی وقت ہے۔''اور پھر وہ دروازہ کھول کر کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔اس نے جا کر سائیں فضلو کی کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''سائیں فضلو نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔کیوں مائی خیریت ہے۔''

''چل زرا میری کوٹھڑی میں۔تجھے آسمان کی سیر کراؤں۔''وہ اپنی وضع کردہ اصطلاحیں استعمال کر رہی تھی۔''میں نے تو مائی اپنا کام نبیڑ لیا ہے۔''

''تو پھر تخی ملنگ کو بھیج دے۔''

''اچھا مائی۔''

مائی گاموں جب اپنی کوٹھڑی میں واپس آئی تو علی خان لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے باہر نکل رہا تھا۔ اس عورت نے پیچھے سے ایک بار پھر اسے بھرپور لات ماری اور علی لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ وہ عورت جلدی سے اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

علی کوٹھڑی کے سامنے کچے فرش پر گر گیا تھا۔۔وہ اٹھ کر ابھی کپڑے جھاڑ رہا تھا کہ تخی ملنگ اس کے پاس سے گزر کر مائی گاموں کی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ مائی گاموں نے دروازے سے منہ باہر کی طرف نکال کر ایک سرسری جائزہ لیا اور پھر اندر سے دروازے کی کنڈی لگا لی۔

(سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، جلد ۷، شمارہ ۳۰۔۲۷، ۱۹۹۴ء)

نام	دیوندر اِسر
ولدیت	شری ناتھ اسر
پیدائش	۱۴اگست ۱۹۲۸ء
جائے پیدائش	حسن ابدال (کیمبل پور، اٹک)
تعلیم	ایم اے (معاشیات)

اصل نام دیویندر ناتھ اِسر ہے ان کی پیدائش ۱۴اگست ۱۹۲۸ءکو اپنی پھوپھی کے ہاں تحصیل حسن ابدال ضلع کیمل پور (اٹک) میں ہوئی۔ وہ اپنی شائع شدہ کتب میں جائے پیدائش کا صدر مقام کیمبل پور شہر ہی لکھتے رہے لیکن بہ قول نند کشور وکرم اس بات کا انکشاف بعد میں دیوندر اسر کے والد شری ناتھ اِسر کے تحریر کردہ ایک پوسٹ کارڈ سے ہوا جو انہوں نے دیویندر اِسر کی پیدائش پر ان کے نانا کو راول پنڈی کے پتے پر لکھا اس بابت وہ اپنے ایک مضمون میں رقطراز ہیں:

''یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دیویندر اسر کی ولادت ۱۹۲۸ء میں ۱۴اگست کے دن ہوئی تھی جو ۱۹سال بعد برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن بن گیا اور جسے برصغیر کے عوام شاید کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ء میں یہ دن پاکستان کی ولادت اور اس کی آزادی کا دن بننے کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تقسیم اور برطانوی سامراج کی غلامی سے آزادی کا دن بن گیا۔ مگر جہاں تک ان کی جائے پیدائش کا سوال ہے نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے خود اسے متنازعہ بنا دیا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی شروع کی اکثر کتابوں میں جائے پیدائش کیمبلپور (حال اٹک) لکھ دی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی پیدائش کیمبلپور میں نہیں بلکہ حسن ابدال میں ہوئی تھی جسے پنجہ صاحب کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ غالباً جائے ولادت کیمبلپور وہ اس بنا پر لکھتے رہے کہ وہاں بچپن اور لڑکپن گزرنے کی وجہ سے انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ وہیں پیدا ہوئے لیکن بعد میں ان کے کسی رشتہ دار سے میں نے سنا کہ وہ کیمبلپور میں نہیں بلکہ حسن ابدال میں پیدا ہوئے ہیں جہاں ان کی پھوپھی سکونت پذیر تھیں۔ اور اس کی تصدیق بعد میں ان کے والد کے تحریر کردہ

ایک پوسٹ کارڈ سے بھی ہوگئی جو بعد میں اسر صاحب کو پرانے کاغذات میں اتفاق سے مل گیا تھا اور جو ان کی پیدائش کی اطلاع دینے کے لیے ان کے نانا جی کو راول پنڈی کے پتے پر لکھا گیا تھا۔''

(ماہنامہ چہار سو، مئی جون ۲۰۰۶ء ص ۳۳)

ان کے نانا پنڈت لکشمی نارائن راول پنڈی کے نامی وکیل تھے۔ والد شری ناتھ اسر بھی وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ والدہ اتم دیوی ان کے بچپن ہی میں آنجہانی ہوگئیں تھیں اور پرورش والد نے کی۔ بچپن کیمبل پور (اٹک) حسن ابدال اور راول پنڈی میں گزرا انہوں نے پرائمری سے بی اے تک یہیں سے تعلیم حاصل کی۔ میٹرک۔ ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج کیمبل پور (حال) پوسٹ گریجویٹ کالج (اٹک) سے کیا۔ یہیں سے ان کی ادبی تربیت کا آغاز ہوا ''منٹو ایک ادبی جراح'' '' کچھ ٹیگور کے بارے میں'' ''انسانی زندگی کا معمار اعظم: ٹیپو سلطان'' '' مداوا'' اور دیگر مضامین و تبصرے کالج میگزین ''مشعل'' میں شائع ہوئے۔ وہ ''مشعل'' کے طالب علم اڈیٹر بھی رہے۔ دیویندر اسر کے شفیق اساتذہ میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ڈاکٹر محمد اجمل اور صدیق کلیم شامل ہیں جنہوں نے ان کی ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ کیمبل پور کے قیام کے دوران ہی انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں ان کی پہلی کہانی اگست ۱۹۴۶ء میں 'چوری'' کے عنوان سے دہلی کے پرچہ '' نسوانی دنیا'' میں شائع ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد اگست ۱۹۴۷ء کو '' ساقی'' کے افسانہ نمبر میں دوسری کہانی '' ردِ عمل'' شاملِ اشاعت ہوئی۔ تقسیم سے قبل ہی وہ اردو ہندی کہانیاں اور مضامین طواتر سے لکھنے لگے تھے۔

تقسیم ہند پر کیمبل پور سے ہجرت کر کے کانپور درشن پورہ بھارت میں رہائش اختیار کی۔ ۱۹۴۹ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے معاشیات کیا اسی دورانیہ میں صحافت کو ذریعہ معاش بنایا اور روز نامہ '' امرت '' سے منسلک ہوئے بعد ازاں ماہنامہ '' ارتقا'' اور ماہنامہ '' شعلہ'' میں کام کیا ۱۹۵۰ء میں دہلی چلے آئے اور یہاں پرائیویٹ کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۳ء میں دہلی یونی ورسٹی سے بی ایڈ کیا۔ ۱۹۵۹ء میں انہیں محکمہ صحت میں سرکاری ملازمت مل گئی جہاں انگریزی رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۸۶ء کو اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

دیویندر اسر کالج کے زمانہ سے کیمونسٹ تحریک میں شامل ہوئے اور طلبا کی تحریکوں میں شریک ہوتے رہے اور اسی کی پاداش میں انہیں ۱۹۵۰ء کو کانپور میں کچھ دن جیل کی ہوا کھانا پڑی لیکن بعد ازاں ۱۹۵۳ء

میں اس تحریک سے الگ ہو گئے ۔ وہ ترقی پسند مصنفین الہ آباد اور کانپور کے سیکرٹری اور انجمن ترقی پسند مصنفین اتر پردیش کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے دہلی میں انہوں نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد بھی رکھی جسے ''کلچر فورم'' کا نام دیا اس انجمن کے اجلاسوں میں بھشم ساہنی، دیویندر ستیارتھی، پریم ناتھ درد، نرمل ورما، رام کمار ورما، گوپی چند نارنگ، سریندر پرکاش اور دیگر ممتاز ادبی شخصیات شرکت کرتیں۔ جدیدیت کے پیش رو دیویندر اسر ممتاز افسانہ نگار، نقاد، ناول نگار اور دانش ور تھے۔ انہوں نے وفات سے قبل مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی میری کتاب ''تذکرہ شعرائے اٹک'' کا مقدمہ میری خواہش پر انہوں نے تحریر کرنا تھا لیکن شدید علالت نے انہیں مہلت نہ دی۔ ۶ نومبر ۲۰۱۲ء کو وہ آنجہانی ہو گئے ۔ انہیں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبان پر دسترس حاصل تھی ان زبانوں میں ان کی چالیس سے زاہد کتابیں شائع ہوئیں ان کے علاوہ بیس کتابیں ترتیب و تدوین پر بھی شائع ہوئیں ان کا یہ کام بھی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے خصوصاً منٹو کے حوالے سے کتب۔ ان کی ادبی خدمات پر کئی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ۶ نومبر ۲۰۱۲ء کو نئی دہلی میں آنجہانی ہوئے ۔

اردو کتب:

افسانے:

گیت اور انگارے (۱۹۵۲ء) شیشوں کا مسیحا (۱۹۵۵ء)

کینوس کا صحرا (۱۹۸۳ء) پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (۱۹۹۲ء)

ناولٹ: خوشبو بن کے لوٹیں گے (۱۹۸۸ء)

تنقید:

فکر و ادب (۱۹۵۸ء) ادب اور نفسیات (۱۹۶۳ء) ادب اور جدید ذہن (۱۹۶۸ء)

مستقبل کے روبرو (۱۹۸۶ء) ادب کی آبرو (۱۹۹۲ء) نئی صدی اور ادب (۲۰۰۰ء)

ہندی کتب:

افسانے: پھول بچہ اور زندگی (۱۹۵۵ء) کالے گلاب کی صلیب (۱۹۷۵ء)

کراس پر لٹکی تصویریں (۱۹۷۵ء) کہانی کا انت (۱۹۸۰)

پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (۱۹۸۱ء) آدمی پرندہ (۱۹۹۴ء)

انوکھا اُپہار(۱۹۷۹ء) سدھارتھ(۱۹۹۶ء)

تنقید:

چنتن اور ساہتیہ(۱۹۵۸ء) ساہتیہ اور منووگیان(۱۹۶۳ء)

ساہتیہ اور آدھنک یگ بودھ(۱۹۷۳ء)

ساہتیہ مکتی اور سنگھرش(۱۹۷۹ء) بھوشیہ سے سمواد(۱۹۸۷ء)

آوارہ ہواؤں کا موسم(۲۰۰۳ء) اُترا آدھنکتا، ساہتیہ اور سنسکریتی کی نئی سوچ(۱۹۹۵ء)

بیتے موسم کی باتیں(۲۰۰۵ء) میڈیا متھس اور مولیہ(۲۰۰۶ء)

ترتیب وتدوین:

جن مادھیم، سمپریشن اور وکاس(۱۹۸۹ء) شبد ستارے(۱۹۹۴ء)

سات رنگ(۱۹۹۶ء) بھارتیہ سنسکرتی اور راشٹرا یکتا(۱۹۸۱ء)

سیکس، ہنسا اور یووا پیڑھی(۱۹۷۵ء) اردو کی چنی ہوئی غزلیں(۱۹۶۳ء)

اردو کی چرچت کہانیاں(۱۹۸۳ء) سم کالین اردو کہانیاں(۱۹۸۸ء)

آدھنک اردو ساہتیہ(۱۹۹۸ء) منٹو کی شریشٹھ کہانیاں(۱۹۸۱ء)

ساہتیہ سنگھرش اور پری ورتن(۱۹۸۲ء) وودودھ اور ساہتیہ

منٹو کی راجنیتک کہانیاں(۱۹۹۰ء) منٹو عدالت کے کٹہرے میں(۱۹۹۱ء)

ماڈرن ہندی شارٹ اسٹوریز(۱۹۷۴ء) مست رنگی تتلیاں(۲۰۰۲)

انگریزی:

IMAGES OF KAMA(1983)

THOUGHT(ED)

COMMUNICATION , MASS MEDIA AND DEVELOPMENT

(1991)

BIRDS FLY NO MORE(Devendra Issar Short Stories)

تراجم: میری جیل یاترا

پنجابی: ساہتیہ تے آدوھنک چیتنا   اثر آدھونکتا

ماخذ

ایک دانشور ایک مفکر (دیویندر اسر) نند کشور وکرم ۲۰۱۲ء

ماہنامہ چہارسو، گلزار جاوید ۲۰۰۶ء

عالمی اردو ادب، نند کشور وکرم ۱۹۹۸ء

مشعل گولڈن جوبلی نمبر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
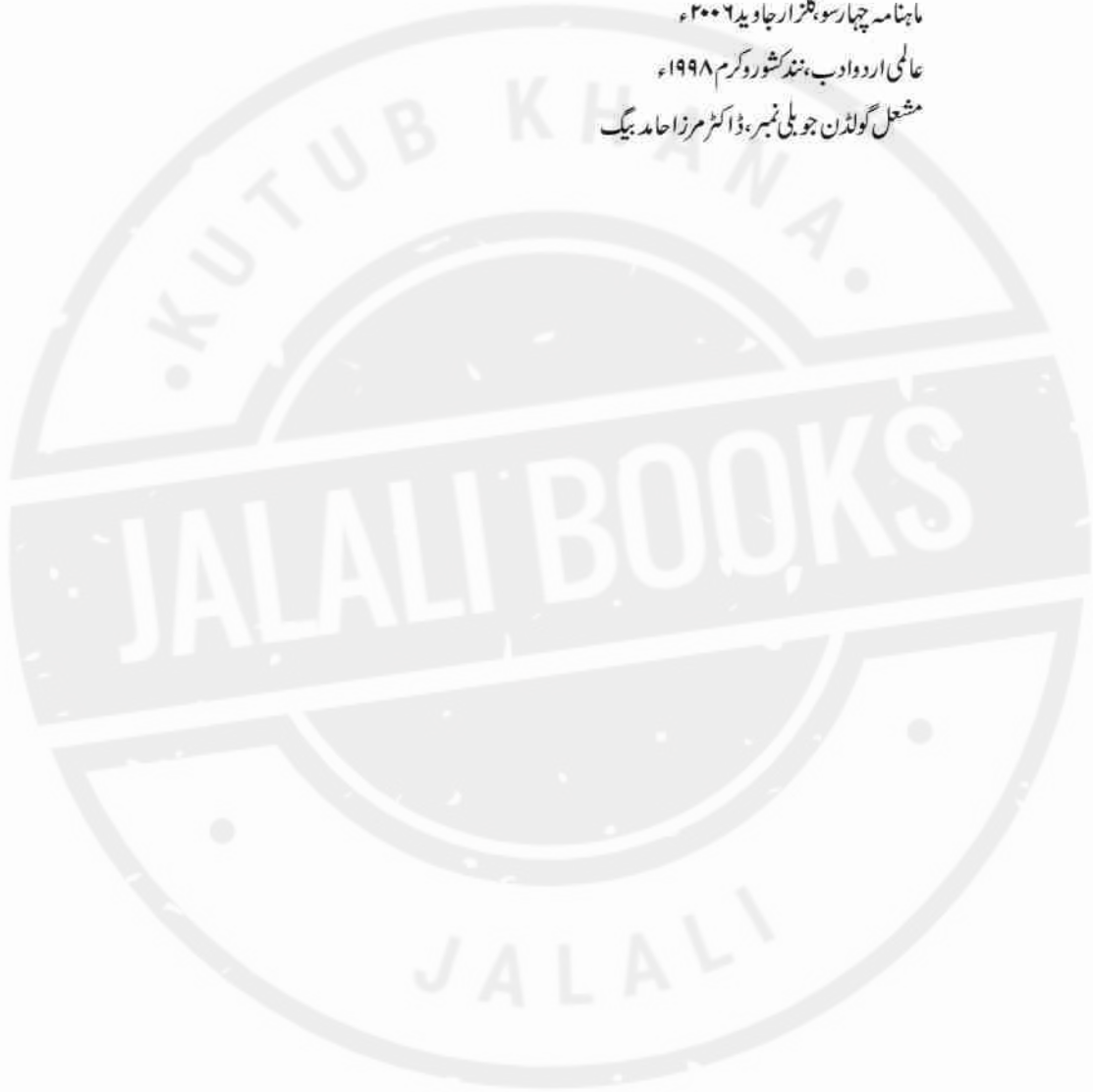
روشو

دیویندراسر

روشو! یہ اُس کا اصلی نام تھا یا۔!
معلوم نہیں۔
کسی نام کی بگڑی ہوئی شکل بھی ہوسکتی ہے۔مثلاً
روشن سیٹھ،سلمان رشدی، آ وشو، راشومان،کرشن، رشی کلپ، ہیروشیما، یروشلم
ممکن ہے۔لیکن ہم اُسے مسٹر روشو کے نام سے ہی جانتے تھے۔
توہاں۔تم اس مسٹر روشو کے بارے میں کچھ بتانے جارہے تھے۔

مسٹر روشو اس چائے خانہ میں ہر روز آتے تھے۔ بلا ناغہ، ہر شام، بارش میں آندھی میں، طوفان میں، بیماری میں، یہاں تک کہ کرفیو میں بھی۔ چھپتے چھپاتے، وہ آتے ضرور تھے سوائے اتوار کے۔تخلیقِ کائنات کے بعد اس دن تو خدا نے بھی چھٹی کی تھی۔

سنا ہے کہ اتوار کی صبح کو وہ شہر سے کہیں بہت دور نکل جاتے تھے۔اور دوسرے دن سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے۔لیکن یہ اسرار ہی رہا کہ وہ کہاں جاتے ہیں، کس سے ملتے ہیں؟ نہ انہوں نے پردہ اٹھنے دیا نہ کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش ہی کی۔ چائے خانہ میں اُن کے آنے کا کوئی وقت طے نہیں تھا۔لیکن وہ آتے تھے جب سورج غروب ہونے کو ہوتا تھا۔ جب روشنی کی آخری کرن سمٹتے سمٹتے ننھا سا نقطہ بن جاتی تھی اور سورج، وہ جو ملگجی پہاڑیاں دیکھ رہے ہیں نا،ان کے پیچھے پھسل جاتا تھا جب آسمان کا رنگ سرخ سے سیاہ ہوجاتا تھا۔ وہ اُس وقت تک چائے خانہ میں بیٹھے رہتے جب تک کہ چائے خانے کے بند ہوجانے کا وقت نہیں ہوجاتا تھا۔کبھی کبھی تو آخری آدمی بھی جا چکا ہوتا تھا۔ میزوں سے پلیٹیں پیالیاں ہٹائی جاچکی ہوتی تھیں۔ کرسیوں کو میزوں پر اوندھے منہ رکھنے کا کام شروع ہو چکا ہوتا تھا۔لیکن تک مسٹر روشو خود اُٹھ کر جانے کے لئے تیار نہیں ہوجاتے تھے ان کی میز کے اوپر والا چھوٹا سا بلب جلتا رہتا تھا۔ اس کی زرد روشنی کے دائرے میں وہ کسی گزرے ہوئے زمانے کا درویش نظر آتے تھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے۔

مسٹر روشو ہمیشہ کافی کے دو پیالے منگواتے تھے۔اپنے لئے بلیک کافی اور سامنے والے کیلئے کریم کافی۔ پھر

وہ اپنے کالے چرمی بیگ سے کوئی کتاب نکالتے اوراُس کے ورق پلٹ پلٹ کر سامنے والے کو سنانے لگتے۔

کیا وہ اُن کا کوئی دوست تھا؟

نہیں۔ یہی تو بات ہے ان کے سامنے کوئی نہیں ہوتا تھا۔ کرسی خالی ہوتی تھی۔ لیکن وہ کتاب اس طرح پڑھتے تھے اِس طرح جھک جھک کر باتیں کرتے تھے، مسکراتے تھے جیسے سامنے وہاں کوئی دوسرا موجود ہے......کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب کوئی ہماری بات سننے والا نہیں ہوگا تو کیا ہم بھی خالی کرسی سے ہمکلام ہوں گے!

اِس کی فکر نہ کرو۔ اِس سے پہلے ہی ہم گونگے ہو جائیں گے۔ تو ہاں تم مسٹر روشو کی داستان سنانے جا رہے تھے۔

کہاں سے شروع کروں؟

کہیں سے بھی شروع کر سکتے ہو۔ سب داستانیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔

ہاں۔ لیکن انجام الگ الگ ہوتا ہے اور مسٹر روشو......

اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا فرق ہوتا ہے تو بس اتنا ہی کہ آخر میں کردار تو سرنگ میں سے نکل رہا ہوتا ہے یا داخل ہو رہا ہوتا ہے۔

لیکن مسٹر روشو تو ایک ہی سرنگ سے نکلتے تھے تو سامنے دوسری سرنگ موجود ہوتی تھی۔

لیکن معاملہ ہر حال میں تو سرنگ پر ہی ختم ہوتا ہے۔

تو چلو بیچ سرنگ سے ہی شروع کرتا ہوں۔ پھر آگے پیچھے۔

''اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے تھے۔ رات کے قریب نو بجے تھے۔ ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ لفظوں کے اندر آواز تھی۔ جس عورت کے ساتھ شام گزار کے آ رہے ہو واپس اُس کے پاس چلے جاؤ، مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ یہ ان کا دستور نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ اُس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا ر رکھتے تھے کہ نہ جانے وہ کب کسی ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے۔ ایک بجے، دو بجے، تین بجے، پو پھٹنے کے وقت......اور اسے دستک نہ دینی پڑے دروازہ بند نہ ملے مسٹر روشو ہولے ہولے بغیر چاپ کئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں وہی بیگ تھا۔''

کون سا بیگ؟

وہی کالا چرمی بیگ جو اُن کے ہاتھ میں تھا جب اُنہوں نے پہلی بار گھر چھوڑا تھا۔ جب انہوں نے اپنا شہر اور وطن چھوڑا تھا۔

اُس نے پہلی بار گھر کب چھوڑا تھا؟

بتاتا ہوں۔ پہلے اس گھر کا قصہ ختم کرلیں۔ جو انہوں نے خود بسایا تھا پہلی اور آخری بار'' تو ہاں، جب وہ سڑک پر آ گئے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔ اور بس اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہوگئی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک بس میں سوار ہوگئے۔ بازار ابھی پوری طرح بند نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے زیر تعمیر مکان میں رات گزارنے (پناہ لینے) جا رہے تھے۔ جب وہ اس کے نزدیک والے اسٹاپ پر اُترے تو بارش بہت تیز ہوگئی تھی سب جل تھل ہوگیا تھا۔ مکان کے سامنے پانی اور کیچڑ بھر گیا تھا۔ گیٹ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے، آنگن بھی پانی سے بھر گیا تھا۔ انہوں نے تالے میں چابی لگائی، گھمانے کی کوشش کی اٹک گئی۔ نہ جانے تالے کو کب سے زنگ لگ چکا تھا۔ وہ بارش میں بھیگتے رہے اور تالا کھولنے کی کوشش کرتے رہے۔ ٹک کی آواز آئی اور تالا کھل گیا۔ کنڈی بھی بڑی مشکل سے کھلی دروازہ بھی دیوار بن چکا تھا۔ لیکن دو چار ٹھوکریں کھانے کے بعد کھل گیا۔ مسٹر روشو بارش میں بھی پسینہ پسینہ ہوگئے تھے۔ اندر سے بند کمرے کی گرم باسی ہوا ان کے بدن کے ہر مسام میں داخل ہوگئی اور ناک سے ہوتی ہوئی ان کے پھیپھڑوں میں بھر گئی۔ وہ تھوڑی دیر یونہی دروازے سے لگے کھڑے رہے اور پھر چپکے سے دبے پاؤں اندر داخل ہوئے جیسے اپنے ہی گھر میں چوری کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں، گیلے کپڑے اتارے نچوڑے اور کھڑکی پر لٹکا دیئے اور ایک کونے میں فرش پر سمت کر بیٹھ گئے۔ فرش پر سیلن بھری پرانی گرد جم گئی تھی۔ ننگا فرش، ننگا بدن، نہ ایشور، نہ روشنی، نہ ماضی نہ مستقبل بس خلا اور سناٹا قبر کی سی تاریکی اور تنہائی۔''

(خاموشی...... داستان رک گئی۔ سکوت طاری ہوگی اور وہ جیسے کمرے میں داخل ہوگئے تھے)

''گھر اُس نے پہلی بار نہیں چھوڑا تھا لیکن اس طرح کبھی اکیلا نہیں ہوا تھا۔ جب پہلی بار اس نے گھر چھوڑا تھا تو وہ 'کمیون' میں آ گیا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ 'کمیون' نہیں تھا۔ پبلک لائبریری تھی جس میں لکڑی کے ایک میک شفٹ کیبن میں ایک کامریڈ رہتا تھا۔ یار دوست وہیں ملتے تھے۔ ہر شام محفلیں لگتی تھیں۔ اسٹڈی سرکل ہوتے تھے رات کو شعر و شاعری ہوتی تھی۔ اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے...... حسن و عشق کے سچے جھوٹے قصے سنائے جاتے تھے۔ کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ کرشن چندر، منٹو۔ کارل مارکس، قصے کہانیاں، قہقہے، کافی، کومکس، کام سوتر......''

لیکن اُس نے گھر کیوں چھوڑا؟

بس ایسے ہی یوں ہی۔ اسٹالن گراڈ، پرحملہ ہوا تو ریڈ آرمی بنالی۔ اگست انقلاب ہوا تو دیواروں پر عبارت لکھ دی۔ انگیریزو ہندوستان چھوڑو...... بنگال کا قحط پڑا تو گلی کوچوں میں بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، گاتے ہوئے کپڑے لتے، آٹا چاول جمع کرنے لگا۔ جب شہر کی فضا بگڑنے لگی تو اُس نے طالب علموں کا جلوس نکالا۔ 'امن مارچ' شہر میں اس سے بڑا جلوس پہلی کبھی نہیں نکلا تھا اور لوگوں نے اس طرح ایک ساتھ مارچ نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی نہیں جب شہر کی سڑکوں پر جھوں اُبل پڑا تھا۔ لال قلعے سے آئی آواز۔ ڈھلوں' شاہنواز' کچہری کے پاس پولیس نے جلوس کو روک دیا۔ روشو اور اُس کے ساتھ دو اور طالب علموں کو حراست میں لے لیا گیا۔ بس اس کے بعد اُس نے گھر چھوڑ دیا......

اُس وقت اُسکی عمر کیا رہی ہوگی؟

یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس۔ لیکن 'کیمون' بھی بکھرنے لگا تھا شہر کی ہوا پھر گرم ہونے لگی۔ چھپٹ پٹ چھُرے بازی کی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ روشو کو اس کے دوستوں نے ہوسٹل پہنچا دیا اور پھر دو دن بعد وہاں سے رات کے اندھیرے میں چوری چھپے ریلوے اسٹیشن ......اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر سرحد کے اس پار آ گیا۔

اُس وقت بھی اندھیرا تھا۔ اجب بھی اندھیرا تھا۔ اُس رات بھی بارش ہو رہی تھی۔ اب بھی بارش ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب جا رہا تھا۔ اب بھی وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب جانے والا تھا کمرے کے خاموش اندھیرے میں وہ راستے کی تلاش کر رہا تھا کہ بادلوں کے گڑگڑانے کی آواز سے کمرے کا سناٹا ٹوٹ گیا۔ بجلی زور سے کڑکی اور کمرے کے اندھیرے کو چیر گئی اور اس شور اور عین روشنی کے ساتھ روشندان سے برف کی ایک چمکتی ہوئی سل سی کمرے میں داخل ہوئی اور بالکل اس کے پاس اس کے سامنے میلے فرش پر چاندنی سی بچھ گئی۔ برف کی سل دھیرے دھیرے پگھلنا شروع ہوگئی۔ جہاں جہاں سے برف پگھل رہی تھی نیلی نیلی رگیں اُبھرنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے برف کی سل ایک انسانی پیکر میں بدل گئی۔ ہونٹوں میں ہلی سی لرزش ہوئی، جسم میں حرکت پیدا ہوئی گہری سبز نیلی آنکھیں جھیل سی چمکنے لگیں صوفیوں کا سفید ڈھیلا ڈھالا لبادہ۔ مسٹر روشو مسحور سا اس نورانی ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک جیسے کسی جادوئی عمل سے جاگ کر وہ خوشی سے چلایا۔ پروفیسر صاحب۔" کیسے ہو روشو!' ہونٹ سرگوشی کے انداز میں ہلے۔ 'اور آپ پروفیسر صاحب!' پائی لیر پرانی وانگوں تنگ گئی وچ کیکراں،۔ وہی آواز' وہی آہنگ، وہی کھنک، وہی مجسپارہ سی بے چین آنکھیں۔ وہی مسکراہٹ ہوا کو تازہ بناتے، مہکاتے۔ سب کچھ وہی تھا بس جسم اک شفاف آئینہ تھا۔ مسٹر روشو۔ اس جسم کے گرد سیاہ شیروانی اور سر پر فیض ٹوپی کا تصور کر رہا تھا۔ یہ اُس کے فلاسفی کے پروفیسر تھے۔ اس شہر میں جو اُس سے چالیس برس پہلے

چھوٹ گیا تھا۔ جس مکان میں روشو رہتا تھا اُس سے دومکان چھوڑ کر وہ رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے گھر میں اور کبھی شام یا رات کو ٹہلتے ہوئے ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ زندگی جینے اور سمجھنے کا شعور اُن کے قریب بیٹھ کر اور اُن کے ساتھ باہر کھلے میں گھوم کر اُسے ملا تھا۔ ایک بار جب وہ سخت بیمار ہوئے اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا تو روشو اس وقت تک ان کے ساتھ رہا تھا جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اِس شہر میں اکیلے تھے۔ روشو نے اسپتال میں ایک دوسرے ہی شخص کو دیکھا تھا۔ جو مارکس، فرائیڈ اور آئن اسٹائین کے بجائے حیات وموت اور اسرار کائنات پر اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے کوئی عالم جذب میں بول رہا ہو۔ روشو یہ سب سن کر بڑے تذبذب میں تھا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے اُسے جدلیاتی مادیت کا درس دیا تھا اور وہیں اسپتال میں پہلی بار اُسے اُن کی شاعری سننے کا موقع ملا تھا۔ جس میں گھن گرج کے بجائے رومانی افسردگی تھی۔ اور اب وہ اَلفی دیکھو برخوردار!

''جب تک ہم اَنا کے حیلوں بہانوں اس کی فریب افروزی سے پوری آگہی پیدا نہ کریں، ہم اپنے اندر اُس تخلیق سرچشمہ کو پھوٹنے نہیں دیں گے جو ہمارے اندر فطرح کی آواز ہے یہی آگہی تخلیق سرمستی ہے۔ اِسی آگہی کی بدولت انسان پتھروں، درختوں، پھول، کانٹوں اور پرندوں سے ہم کلام ہوسکتا ہے...... اِسی آگاہی سے انا زائل ہوتی ہے اور وہ بے وقت کا سناٹا جو تخلیق کے دریا میں تموج اور طوفان پیدا کرتا ہے ۔ظہور میں آتا ہے لفظوں کی اس مجبوری کی آگہی ہی خاموش آگہی پیدا کرتی ہے جس میں کسی جذبہ کسی احساس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ افکار اور جذبات ایک دوسرے میں اس طرح بستے ہیں کہ ان کے محبوب لفظ تخلیق کی اس بہار میں بے برگ وبار نظر آتے ہیں......''

مسٹر روشو کو محسوس ہوا کہ وہ پرندے کی طرح پرواز کرنے لگا ہے وہ زمینوں اور زمانوں کے پار پہنچ گیا ہے جہاں نہ منیشہ ہے نہ ایشور، ماتر شونیہ......بس ایک ہی صدا، اُن حد ناو بن کر گونج رہی ہے۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ مسٹر روشو نے دیکھا کہ برف کی سل روشنی کا ہالہ بن کر روشندان سے باہر نکل کر بادلوں میں گم ہوگئی ہے......لیکن اُن کی موت کو تو کئی برس بیت گئے تھے۔

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی تھی...... باہر بارش کی بوندوں کا شور تھا۔ اندر بھی اندھیرا تھا اور باہر بھی اندھیرا تھا۔ مسٹر روشو پاؤں پھیلا کر دیوار کے سہارے نیم دراز ہوگیا......اور جیسے عالم جذب میں چلا گیا ہو......اُسے ہلکا سا محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ نیم خوابی نیم آگہی میں اُسے دستک کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ آواز قریب آتی گئی اُس نے آنکھیں کھولیں اور باہر کی طرف دیکھا ۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے۔ جو آیا ہے اُسے ایک دم کیسے معلوم ہو گیا کہ مکان میں کوئی آ گیا ہے۔ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا۔ کوئی بھوت پریت

تونہیں، کہتے ہیں کہ جوجگہیں سنسان پڑی رہتی ہیں اُن میں بھوت بسیرا کر لیتے ہیں لیکن بھوتوں کے لئے دروازے کیا اورا کھلے کیا! وہ تو دیواروں کے بیچ سے بھی پر گٹ ہوجاتے ہیں بھوت ہو یا دوست یا دشمن اُسے دیکھنا تو ہے ہی۔ جس دروازے پر دستک ہورہی تھی وہ تو اُس کمرے کا دروازہ ہے۔ اس سے پہلے تو گلی کا دروازہ آتا ہے۔ یہ شخص دیوار پھاند کر پیچھے والی گلی سے کیوں آیا ہے؟ مسٹر روشو نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ روشو صاحب...... میں ہوں...... ورما۔ ورما! کون ورما؟...... ایک اورادھیڑ عمر کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایر بیگ تھا۔ مسٹر روشو کواندھیرے میں دیکھنے کی کچھ کچھ مشق ہوگئی تھی۔ مسٹر روشو کونووارد کو پہنچاننے میں مشکل پیش آئی۔ لیکن اُسے اتنا احساس ضرور ہوگیا تھا کہ یہ چہرہ اس نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ کب، کچھ یادنہیں آرہا تھا۔ لیکن اب ڈر کی جگہ اشتیاق نے لے لی تھی۔ 'اگر آپ مجھے نہ بچاتے تو میں یہاں آپ کے پاس نہ ہوتا۔ وہ لوگ مجھے مارڈالتے۔'' کون لوگ؟'' وہی جیل میں بند ہمارے ساتھی، مسٹر روشو کو کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ وہ لڑکا جیل میں اُس کے ساتھ اُسی بیرک میں تھا۔ ابھی اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اب اُس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہورہے تھے۔ مسٹر روشو کو یاد آیا کہ ایک دن وہ ابھی پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا کہ اسے مارو۔ مارو۔ مارو سالے کو' مخبری کرتا ہے' کی آوازیں سنائی دیں مسٹر روشو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب مل کر اس لڑکے کو بُری طرح پیٹ رہے تھے۔ وہ اسلحہ یعنی جوتو لیے میں لوٹا باندھ کر پولیس سے مڈبھیڑ کیلئے بنایا گیا تھا اس پر آزمایا جارہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اٹھا اور بیچ بچاؤ کرنے لگا۔ ' کیوں ماررہے ہو بیچارے کو؟'' یہ بیچارہ ہے یا سی آئی ڈی کا ہرکارہ ہے۔ اسی نے پولیس کو ہمارے انڈرگراؤنڈ ٹھکانے بتائے ہیں اور ہمارے کی ساتھی گرفتار ہوگئے۔'' لیکن اس کی بات بھی سن لو، 'کیا سنیں اسکی بات اسے باہر سے ہداتیں آتی ہیں اور یہ ہماری ساری کارروائیوں کی رپورٹ بارہ بھیج دیتا ہے۔ بیرک میں جواتوار کو چھاپا پڑا تھا۔ یہی ذمہ دار ہے۔ باتیں بھی ہورہی تھیں اوراس کی پٹائی بھی جاری تھی۔ تھوڑی دیر میں ہنگامہ تھم گیا وارڈن آگیا تھا اور اس نے اُس لڑکے کو دوسری بیرک میں ٹرانسفر کردیا تھا جس میں عادی مجرم بند تھے۔ شام کو بیرک بند ہونے سے پہلے مسٹر روشو اس سے ملنے گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر چھپائے گم سم بیٹھا تھا۔ سچ مچ بتاؤ کہ بات کیا ہے' مسٹر روشو نے اُس سے پوچھا۔ میری ماں بہت سخت بیمار ہے۔ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ میں تھا لیکن گرفتار ہوگیا۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو ابھی پرائمری اسکول میں پڑھتی ہے میں نے وارڈن سے اپنی مصیبت بیان کی۔ میں کبھی کاغذ کے ٹکڑے پر سگریٹ کی ڈبیا پر اپنا سندیسہ لکھ کر وارڈن کو دے دیتا ہوں۔ وہ اُسے میری ماں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ کسی نے وارڈن کو میرے گھر جاتے دیکھ لیا تھا۔ بس یہی بات ہے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں مخبری کررہا ہوں۔ ان کیخفیہ میٹنگوں کی خبریں پولیس تک پہنچا تا ہوں۔ مسٹر

روشو نے اس کے کندے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مسٹر روشو جیل کی یادوں کے دھند لکے باہر آ گیا تھا۔ آج کل کہاں ہو! کیا کر رہے ہو؟ اس نے بتایا کہ اس نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ اب امریکہ میں سیٹل ہو گیا ہے۔ بڑا بزنس پھیلا لیا ہے۔ ہر سال ایک بار دیوالی پر انڈیا آتا ہے اپنے گاؤں کی مٹھی بھر مٹی لے جاتا ہے۔ بس یہی رشتہ رہ گیا ہے اسکا اس سرزمین سے...... مٹھی بھر مٹی......شادی وادی کی ہاں 'ایک میکسیکن لڑکی سے۔ میرے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔'' اور بچے 'دو۔ ایک لڑکی ایک لڑکا'' تمہاری ماں اور بہن تمہارے ساتھ ہیں! 'ماں نہیں رہی، بہن نے ساتھ چلنے سے منع کر دیا' یہاں کیا کرتی ہے۔' پہلے تو اَپ روٹڈ فوکس (Uprooted folks) کے دوبارہ بسانے کے لئے کام کرتی تھی۔ بے گھر لوگوں کے لئے جن کی بستیاں اُجڑ گئیں ہیں باڑھ میں، بھوکمپ میں، باندھ بننے سے، دنگے فساد میں جلنے سے، لیکن اب کہتی ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ اب اتنی دوڑ دھوپ نہیں ہو سکتی۔ اب وہ گری جنوں کی ایک بستی میں کہیں بس گئی ہے۔ ایک ہاتھ میں کتاب لئے دوسری میں دوا۔ اچھا تو چلتا ہوں۔ میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ بارش میں یوں بھی سڑکوں کی خستہ حالت ہے دروازہ اچھی طرح بند کرلیں۔ آج کل کچھ پتا نہیں۔ کون کس بھیس میں اندر گھس آئے۔ لوٹ لے یا پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔ ایسے ہی عادتاً جسٹ فار تھرل، بڑا آدم خور دور ہے۔'' اس نے مسٹر روشو کے پاؤں چھوئے پرنام کیا اور چلا گیا۔

سامنے والا آدمی داستان سناتے رک گیا' کا گی کا گھونٹ بھرا۔ اور کرسی پر پیچھے جھک گیا۔ چائے خانہ میں شور تھا۔ سب لوگ سب لوگوں سے اونچے اونچے باتیں کر رہے تھے۔ بزنس کی باتیں، سیاست کی باتیں، فلموں کی باتیں، کرکٹ کی باتیں، سکیم اور سیکس اسکینڈل کی باتیں، باتیں، باتیں، باتیں، اب آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔ مسٹر روشو نے عمر بھی لمبی پائی تھی اور اس کی داستان بھی بڑی طویل ہے۔

نہیں میر بڑے شوق سے سن رہا ہوں۔ ایک دور کافی کا اور ہو جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مسٹر روشو دروازہ بند کر کے ابھی کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہا نہیں کھڑکی میں ایک پرچھائیں سی تھرکتی دکھائی دی۔ بارش کی بوندوں کی چلمن کے پیچھے کسی کا چہرہ چاند سا جھلکا۔ چھن چھن چھن چھن۔ کھڑکی کے شیشے سے نکل کر ایک پھول سا بدن میلے فرش پر ننگے پاؤں سے نرتیہ کرنے لگا۔ ٹین کی چھت پر گرتی بوندیں ننھی ننھی گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں۔ اور پھر دھرتی اپنے محور پر گھومتے گھومتے جیسے ایک دم رک گئی ہو۔ پھر پدماسن کی مدررا میں وہ لڑکی مسٹر روشو کے سامنے بیٹھ گئی۔ نمسکارم۔ مندر کی گھنٹی بجی۔ 'تم' گلاب کی پنکھڑی کھل گئی۔ یہ وہی تھی جو مسٹر روشو کو جب وہ ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے تھے ہر روز ایک پھول پیش کرتی تھی۔ نت نیا پھول۔ اور ہر پھول کے ساتھ ایک پرشن لپٹا ہوتا تھا۔ نت

نیا پرشن ۔ میرے من میں سنشے (تشکیک) ہے ۔ پروفیسر صاحب ۔ ہر بار اس کے من میں سنشے پیدا ہوتا تھا۔ ہر روز مسٹر روشو اس کے پرشن کا جواب دیتے' اس کا سنشے دور کرنے کی کوشش کرتے ۔ پھول اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا سنشے اس کے من میں ۔ مسٹر روشو نے ایک دن اس سے پوچھا یہ تمہارے من میں ہر روز ایک نیا سنشے کیوں پیدا ہوتا ہے ۔ اس نے کہا جب تک سنشے ہے جیون کی گتی ہے ۔ جس روز سنشے ختم ہو جائے گا جیون کا اَنت ہو جائیگا ۔ ہر یدھ پرشنوں کو ختم کرنے کے لئے لڑا جاتا ہے ۔ یدھ سماپت ہو جاتا ہے پرشن شیش رہ جاتا ہے اور رَہ جاتے ہیں سبھیتاؤں کے اوشیش (کھندر) مسٹر روشو سوچ میں پڑ گئے تھے ۔ بہت کتابیں پڑھ لی تھیں ۔ لیکن یہ نئی کتاب تھی جس میں کوئی جواب نہیں تھا ۔ بس سوال ہی سوال تھے ۔ اس نے کہا تھا جن کے پاس تمام پرشنوں کے جواب ہوتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ سوال کیا ہیں ۔
مجھے سقراط کا ایک قصہ یاد آ رہا ہے ۔ سقراط سے مصر کا ایک پروہت کہتا ہے ۔ 'مصر مر گیا ہے ۔ ہم مر گئے لیکن تم زندہ ہو ۔ یونان زندہ ہے ۔ ایتھنز زندہ ہے' جانتے ہو کیوں؟ کیوں کہ میں ایتھنز کے ہر باشندے میں، ہر معمر عورت میں ایک متجسس بچے کو دیکھتا ہوں ۔ جس دن یہ بچہ مر جائے گا ایتھنز بھی مر جائے گا مصر کی مانند ۔"

سامنے بیٹھا ہوا آدمی جو مسٹر روشو کو داستان سنا رہا تھا سوچ میں پڑ گیا ۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

یہ اَب سمجھ میں آیا کہ اس لڑکی کے من میں جو سوال تھا جو سنشے تھا وہ دراصل ایک محو حیرت بچہ ہے مجھے یاد آتا ہے کہ اس لڑکی نے کہا تھا کہ اگر ارجن کے من میں سنشے شیش رہ جاتا تو مہابھارت نہ ہوتا ۔ کرشن نے تمام سنشیوں کو سماپت کر دیا تھا ۔ اسی لئے سورج کو دھوئیں کے غبار نے نگل لیا تھا ۔ اسی لئے دھرتی پر پھول نہیں کھلتے تھے آگ اُگتی تھی ۔ پرندے نہیں اڑتے تھے موت منڈلاتی تھی ۔ لاشوں کے منچ پر تانڈو نرتیہ ہوتا تھا ۔ یدھ سماپت ہونے پر گاندھاری نے اپنی آنکھوں سے کالی پٹی کھولی تھی ۔ اس نے مرگھٹ بنی دھرتی دیکھ کر کرشن کو شاپ دیا تھا ۔ 'سنو کرشن! پربھو ہو یا پرماتما کچھ بھی ہو ۔ سارا تمہارا ونش اسی طرح پاگل کتوں کی طرح ایک دوسرے کو پرس سپر پھاڑ کھائے گا ۔ تم خود ان کا وناش کر کے کئی ورشوں بعد کسی جنگل میں سادھارن ویادھ کے ہاتھوں مارے جاؤ گے ۔ پربھو پر مارے جاؤں گے پشو کی طرح شاید کرشن کے من میں پہلی بار سنشے پیدا ہوا اور وہ مارا گیا ایک سنسان جنگل میں رات کے اندھیرے میں ۔ تنہا ۔ بالکل اکیلا ۔ سنشے گرست ۔ مسٹر روشو نے کہا تھا ۔ یہ سنشے مجھے بار بار کیوں سانپ سا ڈستا ہے کیوں میں اس لڑکی کے سامنے خاموش ہو جاتا تھا ۔ کیوں میری ساری کتابیں ایک ایک کر کے بند ہو جاتی تھیں ۔ اس لڑکی کے من میں کون سا رشی ششو بن کے بیٹھ گیا ہے اور پھر جو کچھ مسٹر روشو نے بتایا شبدوں سے نہیں آنسوؤں سے کہا ۔

انہوں نے بتایا کہ ایک دن اس لڑکی نے ایک کے بجائے دو پھول پیش کئے میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کیوں آج دو پرشن ہیں۔ وہ مسکرادی۔ نہیں کل شاید میں نہ آپاؤں۔ وہ دوسرے دن نہیں آئی۔ تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ ایک دن اور بیت گیا۔ پھر دن بیتتے چلے گئے۔ وہ نہیں آئی۔ (خاموشی) لیکن یہ بات تو ادھوری رہ گئی۔

''ہاں ادھوری زندگی کی بات ادھوری رہ جاتی ہے''

''پھر بھی''

ہوا یہ کہ اس دن کے بعد وہ لڑکی آئی۔ مسٹر روشو نے اس سے پوچھا جب وہ اس رات ان کے کمرے میں آئی تھی'' تم اچانک کہاں غائب ہوگئی تھیں'' اس لوک۔ میں۔ یعنی۔ جہاں نہ اتیت ہوتا ہے نہ بھوشیہ۔ بس سمے ہوتا ہے اور ایشور معاف کرنا دوست! یہ ایشور والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایشور نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ اگر کبھی تھا تو اب وہ مر چکا ہے۔ تم نے نتشے کا نام سنا ہے۔

ہاں سنا ہے اور تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے

اس نے ایک پاگل کا کردار پیش کیا تھا جو ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے بازار کی طرف چلاتا ہوا دوڑتا ہے۔ مجھے خدا کی تلاش ہے مجھے خدا کی تلاش ہے لوگ اس سے کئی طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ وہ پاگل چیختے ہوئے کہتا ہے تم پوچھتے ہو کہ خدا کہاں چلا گیا کہ تمہیں اس کی تلاش ہے میں تمہیں بتاتا ہوں ہم لوگوں نے کیا کیا۔ ہم قاتلوں کے قاتل ہیں۔

بالکل بجا فرمایا آپ نے یہی تو وہ لڑکی مسٹر روشو سے کہہ رہی تھی۔

''یعنی''

وہ لڑکی اکثر گایا کرتی تھی۔ کلی نی یار دی سُرگ واجھوٹا۔ آگ لا واں محلاں نوں۔ یا'' کلی نی یار وی اللہ ہو دا آوازہ آوے۔'' اس لڑکی کے والہانہ عشق سے مسٹر روشو کو عرفان ہوا کہ عشق ہی عبادت ہے عشق ہی خدا ہے۔ عشق اور عبادت دونوں جنون ہیں۔ عشق مجازی ہی عشق حقیقی کی جانب لے جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہیر وارث شاہ کو محض ایک داستانِ عشق کے بجائے صوفیانہ کلام نہ کہا جاتا۔ جب عشق نہیں رہتا تو خدا کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اسرار و رموز کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مسٹر روشو کو آ گئی ہوں تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نہ مرد کامل ہوں نہ فوق البشر نہ اَتی مانس۔ بس ایک عام آدمی ہوں بہر حال لڑکی والی بات تو بیچ میں رہ گئی۔

مسٹر روشو نے اس لڑکی سے پوچھا پریت آتمائیں خواب میں ہی کیوں ملتی ہیں۔ لیکن وہاں تو کوئی نہیں تھا لڑکی سمٹتے سمٹتے ایک ہندو بن گئی تھی اور فضا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ لیکن مسٹر روشو کے خواب میں وہ اسی طرح

نرتیہ کررہی تھی۔ وہی سفید شلوار قمیض وہی بسنتی چنری۔ وہی بالوں میں زردو پھول وہی تھرکتے پاؤں میں مندروں کی گھنٹیاں۔ اچانک گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی اور مسٹر روشو کا خواب منتشر ہوگیا۔

یہ گاڑی بیچ میں کہاں سے آگئی

میں نے بتایا نہیں کہ جب آدمی سرحد پار کرنے لگتا ہے تو سنٹشے پیدا ہوتا ہے۔ سرحد زمین کی ہو یا زندگی کی ۔ جب مسٹر روشو کی گاڑی سرحد پار کرنے لگی تھی تو اس کے من میں سنٹشے پیدا ہوا تھا جب لڑکی حقیقت سے ماورائے حقیقت کی سرحد پار کرنے لگی تو وہ گاڑی کے نیچے آگئی وہ سنٹشے گرست تھی اس وقت ۔

یہ تو ذہنی مرض ہے۔

شاید آپ صحیح کہتے ہیں کچھ لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ لڑکی اسکیز وفرینا کی شکار تھی۔ خود اور خدا کے بیچ جھول رہی تھی۔ کچھ کہتے تھے کہ دراصل وہ X زون میں چلی گئی تھی۔ جب خود اور خدا میں کوئی فرق نہیں رہتا

یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایسے لوگوں پر کوئی عذاب نازل ہو چکا ہوتا ہے ہوسکتا ہے کہ ایسے لوگ اسے وردان سمجھتے ہوں۔

جیسا کہ مسٹر روشو (ہنستا ہے) خیر اپنی فنتاسی جاری رکھو۔ وہ کیا کہتے ہیں آج کل کے پاپولر محاورے میں جادوئی حقیقت نگاری آپ اسے جو چاہے کہیں ۔ جنونی ہیجان' مریضانہ افسردگی' بصارت کا نقص، وہم یا ہذیانی خبط لیکن اس رات ان کا کمرہ یادوں کا مسکن بن گیا تھا۔ یا مرگھٹ لیکن پھر اُس کمرے میں مسٹر روشو نے کسی کو نہیں آنے دیا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ ٹین کی چھت پر کوئی بلی بین کر رہی تھی۔ اچانک وہ بلی کود کر کمرے میں آگری اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کون کون اس اندھیرے میں منہ لپیٹے رو رہا تھا اس کمرے میں اس رات (چائے خانے سے لوگ رفتہ رفتہ جانے لگے تھے۔ چائے خانے کے بند ہونے کا وقت قریب آرہا تھا اور مسٹر روشو کی داستان انجام کو پہنچنے والی تھی۔)

صبح مسٹر روشو نے کھڑکیاں کھولیں ۔ آسمان صاف ہوگیا تھا۔ دھوپ کی ایک کرن کمرے میں دیوار سے اترتی فرش پر چلنے لگی۔ نیلے آسمان پر قوسِ قزح کے رنگ چھا گئے تھے دن بھر مسٹر روشو اس شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے رہے اور رات کی گاڑی پر سوار ہو کر اس شہر میں آگئے ۔ جوان دنوں ایک قصبہ تھا۔ خیر اب تو یہ خوب بس گیا ہے۔ مل کارخانوں' کاروں' ٹرکوں اور بارود کا' دھواں شہر کے گلی کوچوں اور گھروں میں غبار رہنا گھومتا رہتا ہے۔ مسٹر روشو نے محسوس کیا کہ اس دھوئیں میں انہیں اپنا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس شور میں انہیں اپنی آواز سنائی نہیں دیتی اگر ان کو کہیں سکون ملتا تو اس چائے خانے میں۔ اس دن وہ چائے خانے میں بڑی دیر تک بیٹھے رہے ۔ جب چائے خانہ بند ہونے لگا تو وہ اپنی کرسی سے اس طرح اٹھے جیسے کہ ان کی پیٹھ پر کوئی بھاری چٹان رکھ دی گئی ہو۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ وہ بوڑھے تو تھے

ہی لیکن اس دن وہ اپنی عمر سے کئی برس اور پرانے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی گلی کی طرف واپس جانے لگے جو اس چوراہے کے پار اس باغ کے پیچھے تھی۔ وہ اپنے کمرے کو گلی ہی کہتے تھے۔ اس دن شہر میں بڑا تناؤ تھا جس چوراہے کو پار کر کے وہ اپنے کمرے میں جاتے تھے اس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ شہر کے دو گروہوں میں اس چوارہے پر بت نسب کرنے پر تناؤ بڑھ گیا تھا۔ ایک گروہ کے مطابق چوراہے کی زمین شہر بننے سے کئی برس پہلے ان کی ملکیت تھی جب یہ نیا نیا قصبہ بنا تھا اور دوسرا گروہ اس پر ایک یادگار مجسمہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک سڑک پر چائے خانہ ہے۔ اور چوراہے کو پار کر کے اس کے مقابل سڑک پر پولیس کی بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دائیں اور بائیں کی سڑکوں پر مخالف گروہ شام سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دن میں چھرا گھونپنے کی دو چار واردا تیں ہو چکی تھیں۔ پہلے تو پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو اس نے لاٹھی چارج کیا۔ پھر آنسو گیس چھوڑی اور آخر گولی چل گئی۔ گولی باری میں کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ دو کی جائے واردات پر ہی موت ہو گئی۔ تیسرے نے اسپتال جاتے ہوئے ایمبولنس میں ہی دم توڑ دیا۔ اس تیسرے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ لہٰذا لاوارث قرار دے کر اس کی لاش جلا دی گئی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ اور اتوار کو مسٹر روشو چائے خانے نہیں آتے تھے۔ جب کہ اس کے اگلے دن بھی نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہوئی۔

ممکن ہے جہاں وہ جاتے تھے وہیں رہ گئے ہوں۔ بائی دے وے وہ ہر اتوار کو جاتے کہاں تھے؟ شاید کچھ پتا چل جائے

'یہ تو معلوم نہیں' کچھ کا خیال ہے کہ وہاں جنگلوں میں ان کا کوئی دوست روپوشی کی زندگی بسر کر رہا ہے اس سے ملنے جاتے ہیں۔ اس پر تشدد آمیز کارروائی کرنے کا الزام ہے۔ پولیس اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

'دہشت گرد یا نکسل وادی؟'

معلوم نہیں۔ کسی کی رائے ہے کہ وہاں کسی لڑکی سے ملنے جاتے ہیں۔

''محبوبہ!''

''معلوم نہیں۔''

لیکن وہ وہاں پہاڑی علاقوں میں گری جنوں میں سوشل ورک کرتی ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے آئی ہے لیکن وہیں بس گئی ہے

یہ معاملہ کچھ سنجیدہ نظر آتا ہے

لیکن کئی لوگوں کا ماننا ہے کہ وہاں کسی پیر فقیر کی قبر ہے۔ جب جنگل کٹ رہے تھے اور بارشیں شروع ہو گئیں تو ایک چٹان کھسک کر ان پر گر پڑی اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب گئے۔ وہیں ان کی قبر بن گئی۔ مسٹر

روشو ہراتوار کو اس فقیر کی قبر پر پھول چڑھانے جاتے ہیں سچ کیا ہے کوئی نہیں جانتا
آخر مسٹر روشو کی شناخت کیا ہے؟ میرا مطلب ہے آخر اس کی کوئی نہ کوئی آئی ڈینٹٹی تو ہوگی، شاید یہ جان کر اس کے اس طرح غائب ہوجانے پر کچھ روشنی پڑے۔
یہاں سوال تو ہم سب کو پریشان کر رہا ہے کہ اس کی آئی ڈینٹٹی کیا ہے جب وہ آخری بار چائے خانے میں آئے تھے تو جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ اس روز وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہے تھے۔ سچ کیا ہے میں نہیں جانتا۔ ہاتھ میں بم' بندوق' بارود و لئے ان لوگوں کی ہتیا کردینا جنہیں ہم اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ یا ایک ہاتھ میں کتاب لئے اور دوسرے میں دوا کی شیشی۔ دن رات ان لوگوں کی خدمت کرنا جنہیں روگ اور اندھیرے سے نجات چاہیے۔ یا جسم سے پرے روح کی نجات لیکن سچ یہ بھی ہے کہ روح کی نجات کا راستہ جسم سے ہوکر گذرتا ہے یا اپنے جسم کو فنا کردینا عشق میں عبادت میں۔ میرے من میں اتنا سنشے کبھی نہیں تھا۔ جتنا آج ہے اس پل۔ تھوڑی دیر مسٹر روشو خاموش رہے پھر بولے شاید سفرنگ (Suffering) سے بڑا سچ کوئی نہیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔
سوچ رہا ہوں۔ یہ خواب ہے یا حقیقت' فنتاسی یا فسانہ۔ یا زندگی سے بھاگنے کا بہانہ
یہی ہوتا ہے جب گم شدہ پرندے کا بکھر جاتا ہے آشیانہ
ہاں تو یہ بتائیے کہ مسٹر روشو کا کوئی پتا چلا
نہیں۔ چوراہے اور سڑکوں پر ہر چیز ٹوٹی پھوٹی بکھری پڑی تھی۔ ہاکیوں، لوہے کی چھڑوں، چاقوؤں، چھروں اور گنڈاسوں کے بیچ۔ ایک گروہ کی بنائی ہوئی چار دیواری کی اینٹوں اور دوسرے گروہ کے نصب کردہ مجسمے کے ٹوٹے پتھروں، چپلوں، جوتوں، آنسو گیس کے خالی کینوں اور خالی کارتوسوں اور ہتھ گولوں کے بیچ ایک بیگ ملا اور اس سے تھوڑی دور ایک تصویر پڑی تھی۔
اس بیگ سے کچھ پتا ملا۔ آپ نے بتایا تھا کہ مسٹر روشو جب چائے خانے آتے تھے تو ان کے پاس ایک کالا چرمی بیگ ہوتا تھا وہی بیگ جو ہر بار گھر اور شہر چھوڑنے کے وقت ان کے پاس ہوتا تھا۔
یہ تو ٹھیک ہے لیکن!
اس بیگ کی اندر کی چیزوں سے تو یقیناً کوئی سراغ مل سکتا تھا
بیگ تو خالی تھا۔ بس ایک کتاب تھی۔ ورق ورق۔ اس کے پنے پت جھڑ کے پتوں کی طرح پیلے پڑے تھے' بالکل خستہ۔ چالیس پینتالیس برس تو پرانی ہوگی ہی۔ اس کی عبارت بھی نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔ اور پھر اردو میں تھی۔
''اور تصویر!'' تصویر تو بالکل ہی نہیں پہچانی جاتی تھی۔ سیپیا رنگ تصویر تھی۔ دھول میں اٹی ہوئی مٹی میں سنی

سی۔ بارود کے دھوئیں سے سیاہ۔ کئی پھٹی۔ خون کے جمے ہوئے کالے دھبے۔ جوتوں تلے روندی ہوئی
۔اس تصویر پر کس کا چہرہ تھا۔ کچھ صاف نہیں تھا۔ اس پر جیک بوٹوں کی چھاپ تھی۔
لیکن آپ مسٹر روشو کے بارے میں یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں۔
اصل بات یہ ہے کہ وہ میں ہی تھا جوان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ جس سے وہ باتیں کرتے تھے۔ جس کے لئے وہ کافی منگواتے تھے۔ لیکن آپ تو کہتے تھے کہ وہاں دوسرا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ کرسی خالی ہوتی تھی۔ وہ شخص یعنی داستان گو کچھ نہیں بولا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ دھول اور مٹی میں اٹا ہوا مٹا ہوا۔ بارود کے دھوئیں سے سیاہ، چہرے پر جمے ہوئے خون کے کالے دھبے، جوتوں تلے روندا ہوا۔ اور۔ اور اس پر جیک بوٹوں کی چھاپ تھی۔ اس کا چہرہ تصویر بن گیا تھا۔ میں نے دہشت میں آنکھیں بند کر لیں۔ جب دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور انگلیوں کے بیچ سے جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ چہرہ نہ تصویر۔ کرسی خالی پڑی
تھی۔ میز پر کافی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ چائے خانہ بند ہونے جا رہا تھا۔ لوگ باگ اٹھنے لگے تھے۔ بتیاں بجھنا شروع ہو چکی تھیں۔ ایک آخری بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کا گولہ میز پر پڑا تھا۔ اور اس گولے کے آئینے میں ایک شخص کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ بالکل ویسی ہی تصویر سے اچانک وہ چہرہ مسکرا دیا۔ اوہ مائی گاڈ۔ یہ میرا چہرہ تھا۔ میز کے اوپر والا بلب ایک دم بجھ گیا اور وہ چہرہ اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔ میرے کندھے پر کسی نے ہلکے سے ہاتھ رکھا۔ تو پھر چلیں مسٹر روشو۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اچانک زور کا دھماکہ ہوا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ چائے خانہ کھنڈر بن چکا تھا۔
اور میں اس میں کسی بوسیدہ خانقاہ میں کسی عمر رسیدہ فقیر کی طرح بیٹھا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے کرسیوں ،میزوں اور ملبے کے بیچ سے گذرتا بار بار ٹھوکریں کھاتا چائے خانے سے باہر نکل آیا۔
میرے پیچھے چائے خانے کی سب بتیاں بجھ چکی تھی اور باہر سامنے سڑک پر اماوس کی لمبی رات سیاہ سانپ سی بل کھائے پڑی تھی۔
اور اس سانپ کا منہ ایک انت ہین اندھی سُرنگ کی طرح کھلا تھا۔

(ماہنامہ چہارسو، شمارہ مئی جون، ۲۰۰۶ء)

نام	اندر سروپ دت
تخلص	نادان (برائے شعر)
ولدیت	گوراندتامل دت
پیدائش	نومبر ۱۹۲۷ء
جائے پیدائش	ٹھی دتاں ضلع کیمبل پو(راٹک) حال (چکوال)

افسانہ نگار اور شاعر اندر سروپ دت نومبر ۱۹۲۷ء میں ایک گاؤں ٹھی دتاں تلہ گنگ ضلع کیمبل پور اٹک (حال چکوال) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام گوراندتامل دت تھا۔اندر سروپ دت ایک تعلیم یافتہ انسان تھے۔

تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہو گئے۔۱۹۸۵ء کے لگ بھگ انڈر سکریٹری ٹرانسپورٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔رام پر کاش راہی ان کے خاندانی پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نادان صاحب موہیال برہمنوں کے اس خانوادے کے چشم و چراغ تھے جسے قدرت نے جسمانی سے ''جزی القامتی'' اور ذہنی طور سے فوق البشری جیسی نادر صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ہندوؤں کا یہ واحد طبقہ ہے جسے حضرت امام حسین اور دیگر شہدائے کربلا سے عقیدت مندی اور وفا پیشگی کا شرف اور امتیاز حاصل ہے۔یہ ایک تاریخی واقع ہے اسی وجہ سے موہیال لوگ شیعہ برہمن کہلاتے ہیں۔ان کے یہاں بہ یک وقت غیر معمولی brain and brawn کی بدولت بیش تر کسب و کردار اور علمی معیار و ماہیت کی کارفرمائی رہی۔''[1]

اندر سروپ دت نادان کا شماران ہندو شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نعت کے اشعار بھی لکھے۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا بعد ازاں شاعری کی جانب راغب ہوئے ان کے افسانے ''بیسویں صدی'' ''شمع'' اور کئی جرائد میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔رام پر کاش راہی اپنے ایک

مضمون میں اندر سروپ دت کے فن پر رقمطراز ہیں:

''اردو میں تخلیقی صلاحیت ان میں لڑکپن سے ہی موجود تھی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ افسانہ نگاری کے دلدادہ رہے اور برسوں تک ان کی کہانیاں ''بیسویں صدی'' اور ''شمع'' جیسے موقر رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ ایک فطری لا ابالی پن میں جب نادان صاحب کے یہاں شاعری کی پھڑک اٹھی تو پھر وہ شاعری کے ہی ہو کر رہ گئے'' ۲ اندر سروپ دت نادان کی رحلت حرکت قلب بند ہو جانے سے ۶ دسمبر ۱۹۹۹ء کو دہلی میں ہوئی۔

حوالہ

ا۔ نند کشور وکرم، عالمی اردو ادب، کرشن نگر دہلی، ۲۰۰۰ء ص ۳۳۰

۲۔ ایضاً، وفیات، ص ۳۵۹

گوپی چند نارنگ، ہندوستان کے اردو مصنفین و شعراء ۱۹۹۶ء

شرارت

اندرسروپ دت

المار ی کھلی دیکھ کراس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا!

اس کے سامان کی عجیب درگت بنی ہوئی تھی۔ذاتی خطوط جسے اس نے تہہ کر کے نہایت احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا، بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے،البم بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا،اخباروں کے میٹریمونیل کالم سے کاٹے ہوئے تراشے جن پر دیئے ہوئے پتوں پر وہ خط و کتابت کرتا رہا تھا، وہاں سے غائب تھے۔غصے سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔آنکھیں انگارہ ہوگئی اور ہاتھ یوں پھڑ کنے لگے جیسے وہ اس نازیبا حرکت کی ذمہ دار ہستی کو مروڑ دینا چاہتا ہو۔لیکن یہ خیال آتے ہی کہ یہ شرارت سریکھا کے علاوہ کون کرسکتا ہے،اس کا غصہ کافور ہوگیا۔خون کا ابال بیٹھ گیا لیکن آنکھیں پرنم ہوگئیں جیسے اس کے اندر دبتا ہوا غصہ پگھل کر آنکھوں کی رہ بہہ نکلا ہو۔

ایک بار پھر اس نے الماری کی چیزوں کا جائزہ لیا، چیزیں اسی طرح بکھری پڑی تھیں۔انہیں سنبھالنے کے لیے وہ آگے بڑھا تو اس کی نظریں الماری کے دروازے پر چسپاں ایک کاغذ پر پڑیں جس پر لکھا تھا۔ضرورت ہے ایک پچیس سالہ بڈھے نما نوجوان کے لیے ایک ادھیڑ عمر عورت کی۔۔۔۔موٹی ہو،قد لمبا ہو،آبنوسی رنگ اور سر کے بال اتنے ہوں کہ چوٹی باندھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔۔۔۔ان پڑھ ہوتو کوئی مضائقہ نہیں۔ذیل کے پتہ پر لکھئے یا خود ملئے۔

سریش شرما، عارضی کلرک ملٹری اکونٹس ڈیپارٹمنٹ۔ ۱۷ لین روڈ۔

اس کی پرنم نظریں ان کے الفاظ پر دوڑ گئیں۔اندر ہی اندر سلگتی ہوئی غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔اس کے جی میں آیا کہ آج وہ سریکھا کی ایسی مزاج پرسی کرے کہ پھر زندگی بھر ایسا بھونڈا مذاق کرنے کی جرات نہ کر سکے،اوراسی جذبہ کے زیر اثر وہ باہر صحن کی طرف اس طرح بڑھنے لگا جس طرح جلاد قاتل کو پھانسی چڑھانے جارہا ہو۔دروازے پر پہنچ کر اس کی نظر سریکھا پر پڑی تو نہ جانے کیوں اس کے قدم

رک گئے۔۔شاید اس لیے کہ سریکھا سے اُلجھ کر وہ اپنے اُوپر طعنوں کی بوچھاڑ نہیں کروانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ سریکھا اس ہتھیار کو بے دریغ استعمال کرتی تھی اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زہر آلود تیر، جو وہ سریکھا پر چھوڑنے جا رہا تھا، اس کے ترکش سے نکل نہ سکے۔ وہ تیز و تلخ فقرے جو اس کے ذہن میں دوڑ رہے تھے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس چلا آیا اور ایک کوچ میں دھنس کر اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگا۔۔۔اُسے نمی کی یاد آ گئی۔۔۔۔

وہی نمی جسے کبھی اس نے اپنی امید و آرزو کا مرکز بنا لیا تھا۔ جسے وہ ایک ایسا پھول سمجھتا تھا جو اس کے جیون کی پھلواری کی زینت بن کر اسے سورگ بنا دیتا، اور جس کے سہارے اس نے ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈالنے کا تہیہ کیا تھا۔۔۔ایک حسین و رنگین دنیا بسانے کا منصوبہ باندھا تھا۔ لیکن نمی اس کے ساتھ اس راہ پر چل نہ سکی جس پر سکھ اور ارمان تو کیا اپنی ہستی کو قربان کرنا پڑتا ہے، وہ اس لیے سپنوں کا دھن ثابت ہوئی جسے خواب و خیال کی دنیا میں تو اس نے پالیا لیکن حقیقت کی دنیا میں کھو کر کنگال کا کنگال رہ گیا۔

نمی اس سے بچھڑ گئی لیکن ایک خلش، ایک میٹھا درد اسے دے گئی۔ اور شاید وہی اس کی ناکام محبت کا انعام بھی تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ نمی تو ایک پرچھائیں تھی جسے حاصل کرنے کی اس نے ناکام کوشش کی۔ وہ کتنا نادان تھا کہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا عکس شیشے میں دیکھ کر اسے حاصل کرنے کے لیے مچل پڑا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود وہ نمی کی یاد کو دل سے محو نہ کر سکا۔ خاص کر جب وہ گھریلو زندگی سے اُکتا جاتا تو اسے نمی ضرور یاد آ جاتی۔

اس نے یہ سوچ کر شادی کی تھی کہ شاید نمی کی جدائی کے زخم اس طرح مندمل ہو جائیں لیکن قسمت نے سریکھا جیسی بد مزاج، تنگ نظر اور طعنہ زن عورت بیوی کے روپ میں اس کے دامن سے باندھ دی تھی جس نے اس کے جذبات کا احترام کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ اور اس طرح اس کے زخموں پر پھاہا رکھنا تو دور، انہیں اور بھی گہرا کر دیا تھا، اور جب یہ تاریکیاں گہری ہو جاتیں اور اس کا دل گھبرا جاتا تو وہ نمی کی یاد کی شمع روشن کر لیتا اور اس طرح حال کی تلخیوں کو خوشگوار ماضی کی یاد میں تحلیل کر دیتا۔

یوں تو شادی ہونے کے بعد سے آج تک ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب سریکھا نے اسے اپنی تنگ نظری اور طعنہ زنی کا نشانہ بنا کر اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائی ہو، لیکن آج تو اس نے اسے تنگ کرنے کا ایک نیا ڈھنگ ایجاد کر لیا تھا۔ نمی کے بچھڑنے کے بعد اور سریکھا کے ساتھ شادی ہونے سے پہلے کی بات

تھی کہ اسے اخباروں کے میٹریمونیل کالم میں چھپے ہوئے پتوں پر خط وکتابت کرنے کا ایک خبط سا ہو گیا تھا۔ جتنے اخبارات مل جاتے خرید لیتا۔

وہ شہر کے دور دراز حصوں میں واقع لائبریریوں کے چکر کاٹتا اور وہاں پڑے ہوئے اخباروں سے پتے نوٹ کر لاتا۔ دوستوں اور واقف کاروں سے بھی اخبار مانگ لاتا اور زیادہ سے زیادہ پتے اکٹھے کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا مقصد شادی کرنا نہ تھا بل کہ نمی کا ایک فوٹو حاصل کرنا تھا۔ نمی کی ماں نے ایک دن کہا تھا کہ اگر نمی کے لیے مناسب رشتہ نہ ملا تو اخبار مین اشتہار دلوا دونگی اور اس خیال کے زیرِ اثر کہ شادی کہ شاید نمی کے لیے رشتہ نہ ملا ہو اور وہ اخبار میں اشتہار دیں۔ وہ ہر اس اشتہار میں دیئے ہوئے پتہ پر خط وکتابت کرتا جس میں دیا ہوا حلیہ ذرا بھی نمی سے ملتا جلتا ہوتا، پہلے ہی خط میں وہ لڑکی کا فوٹو منگوا بھیجتا۔ اور اس طرح اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اچھا خاصا البم تیار کر لیا تھا۔ لیکن البم میں نمی کے فوٹو کے لئے خالی چھوڑی ہوئی جگہ خالی ہی رہ گئی۔

بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس نے خط وکتابت کا یہ سلسلہ منقطع کر دیا اور اخباروں سے تراشے ہوئے پتے، خطوط اور وہ البم اپنی الماری میں رکھ دیا۔ لیکن آج اس کی غیر موجودگی میں سریکھا نے اس بھولی بسری بات کا سہارا لے کر مذاق اُڑایا تو اس کے اندر دبا ہوا وہ جذبہ پھر بیدار ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا نمی تو اس کا ایک فوٹو سہی۔ اسے دیکھ دیکھ کر ہی دل بہلا لیا کروں گا وہ پورچ سے اٹھا اور الماری سے البم نکال کر وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا۔ البم کھولتے ہی اس کی نظر نمی کے فوٹو کے لیے خالی چھوڑی ہوئی جگہ پر پڑی۔، وہاں لکھا تو کچھ بھی نہ تھا، لیکن اس نے دیکھا جیسے یہ الفاظ وہاں لکھے ہوں۔۔۔۔ ''اسی نمی کے لیے جیسے میں دل وجان سے چاہتا تھا اور چاہتا ہوں!'' نمی کے خیال نے نمی کی حسین تصویر اس کی نظروں کے سامنے لا کھڑی کر دی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی، اور نگاہوں میں وہی شوخی!! بال دلفریب انداز میں بندھے ہوئے، سیاہ بالوں کی ایک آوارہ سی لٹ اس کے چہرے پر اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ وہی ایک لٹ جسے۔۔۔ سنوارتے ہوئے اس نے ایک دن نمی سے کہا تھا۔

''نمی، اگر سیاہ بختی ہی میرے نصیبوں میں لکھی تھی تو مجھے تمہاری آوارہ اور شوخ لٹ ہی بنا دیتا۔ میں تمہارے ان پیارے پیارے رخساروں کو چوم تو سکتا۔۔۔ دنیا کی نظروں سے چھپ کر نہیں بل کہ سب کے سامنے۔۔۔''

اور جس کے جواب میں نمی صرف مسکرا کر رہ گئی تھی۔

نمی کے حسین تصورات میں وہ کچھ اتنا کھو گیا کہ اسے سریکھا کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی، جب تک وہ خود ہی ایک آتش فشاں کی طرح پھٹ نہ پڑی۔

''تو آج پھر اس نک کٹی نمی کا رونا رویا جا رہا ہے۔۔ میں کہتی ہوں، کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی!۔۔۔ اس کی ماں نے عقلمندی کی کہ اس کا بیاہ تمہارے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا، نہیں تو عیش و آرام کے جھولے میں جھولنے والی لاڈو بھوکوں مر جاتی۔۔۔ اور سچ ہی تو ہے ڈیڑھ سو روپے میں آجکل کوئی پیٹ بھر کھانا کھا سکتا ہے۔۔۔؟

ان باتوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا، اور وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر سریکھا نے دوسرا وار کیا۔۔

''اور اب تو اس کی یاد میں آنسو بہانا بھی بے سود ہے۔۔۔ کون جانے وہ پاکستان سے آئی بھی ہے یا نہیں۔۔۔ شاید وہیں کسی کی جورو بنی بیٹھی رنگ رلیاں منا رہی ہو۔۔''

تیر نشانے پر بیٹھا، سریش زخمی سا ہو کر کراہ اٹھا۔۔۔

''سریکھا تم حد سے تجاوز کر گئی ہو۔۔۔ اب میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکے گا!''

''مجبور کون کرتا ہے تمہیں میرے ساتھ نباہ کے لیے۔۔۔ میرا تو خود ہی ناک میں دم آ گیا ہے۔۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ مفت میں مری رہوں، آج ہی میکے چلی جاؤں گی۔ اپنی نیند سوؤں گی اپنی نیند جاگوں گی، تم بھی جب چولہا پھونکو گے تو ہوش آ جائے گا۔۔۔ کان کھول کر سن لو، تمہیں مجھے خرچ دینا ہو گا، نہیں دو گے تو مقدمہ کر کے لے لوں گی۔۔ اور ہاں تم میرے جیتے جی دوسری شادی بھی نہیں کر سکتے، کوڈ بل پاس ہونے والا ہے۔۔۔ سمجھے۔۔! !! !!''

سریکھا اس تیزی سے زبان چلاتی گئی کہ قینچی بھی شرما کر رہ جائے۔ لیکن سریش ایک لفظ بھی نہ بولا۔ سریکھا بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

اسی دن سریکھا اپنے میکے چلی گئی۔

سریکھا کو میکے گئے ہوئے پانچواں دن تھا، سریش اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ سریکھا کی اس بات پر غور کر رہا تھا جو اس نے جاتے وقت کہی تھی۔ اس دن تو غصے میں اس نے کچھ خیال نہ کیا تھا

لیکن آج نہ جانے اس کا دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ سوچتا۔۔شاید نمی سچ مچ ہی پاکستان رہ گئی ہو۔، یہاں نہ آئی ہو! لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے اندر سے آوازیں بلند ہوتیں۔۔۔نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔نمی ضرور یہاں آ گئی ہوگی۔'' وہ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ اخبار والے کی آواز کان میں پڑی۔ وہ بھاگتا ہوا گلی میں گیا اور ایک پرچہ خرید لایا۔ پہلے صفحہ پر لکھی ہوئی موٹی موتی سرخیوں پر اس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر ورق الٹ دیا۔ اب اس کی نظریں میٹریمونیل کالم پر دوڑ رہی تھیں۔۔۔

''ضرورت ہے ایک نوجوان لڑکی کی۔۔۔۔۔''

''ضرورت ہے ایم بی بی ایس نوجوان ڈاکٹر کے لیے میڈیکل سٹوڈنٹ لڑکی کی۔۔۔''

''ضرورت ہے ایک نوجوان لڑکے کے لیے جو آرمی میں آفیسر ہے۔۔۔۔۔''

اس نے یہ تینوں اشتہار ایک ہی نظر میں پڑھ لیے۔۔۔''ضرورت ہے ایک لڑکی کی۔۔اونہہ!'' وہ زیرِلب بڑبڑایا۔ وہ اخبار کو پرے پھینکنے لگا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی جو دوسرے کالم میں تھا۔

''ضرورت ایک آزاد خیال باروزگار نوجوان کی جو۔۔جو پاکستان سے برآمد شدہ ایک مغویہ لڑکی سے شادی کرنے کے لیے رضا مند ہو، لڑکی کا قد لمبا ہے، رنگ گورا۔ گھر کے کام کاج سے بخوبی واقف ہے۔ ایف اے پاس اور سنگیت کی دلدادہ ہے، خط و کتابت پی۔ بی نمبر ۳۷۲۔۔''

اخبار میں دیا ہوا حلیہ ہو بہو نمی سے ملتا تھا۔ اسے پڑھتے ہی سریش کو یقین ہو گیا کہ نمی اب اسے ضرور مل جائے گی، اس نے فوراً ہی ایک خط دیئے ہوئے پتہ پر لکھ دیا جس میں اس نے لڑکی کی تصویر بھیجنے کی تاکید کی۔۔۔ مصلحتاً اس نے اپنا نام سریش کی جگہ ایس شرما لکھ دیا تھا۔

دوسرے دن کی ڈاک میں اس کا جواب بھی آ گیا۔ لفافہ کھول کر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔۔۔''سریش بابو! خط کے لیے شکریہ، فوٹو نہ بھیج سکوں گی، کیونکہ میرے پاس فوٹو ہے ہی نہیں۔ آپ نے میرے بارے میں مفصل حالات جاننے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ ایک درد بھری لمبی کہانی ہے جسے میں خط میں لکھنا نہیں چاہتی۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے نہیں جو ایک مجبور و بے سہارا لڑکی سے اس لیے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ اور اگر آپ واقعی میرے درد کی دوا بننا چاہتے ہیں تو اتوار شام چار بجے مجھے ٹریننگ اینڈ ایمپلائمنٹ سنٹر کے قریب ملئے، میں وہیں آپ کا انتظار کروں گی۔ اوہ معاف کرنا

میں انجانے میں آپ کو ایس شرما کی جگہ سریش بابو لکھ گئی۔۔کاش آپ وہی ہوں۔۔۔ایک دکھیاری"

اس مختصر سے خط میں دکھ کی ایک درد بھری کہانی پڑھ کر سریش کا دل بھر آیا، کتنی مجبور ہے یہ لڑکی! وہ سوچنے لگا پھر اسے خط کے آخری حصہ میں لکھے ہوئے الفاظ کا خیال آیا، اس نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔اور اس کی نظریں ان الفاظ پر جم کر رہ گئیں۔۔"سریش بابو۔۔۔کاش کہ آپ وہی ہوں۔۔"اسے یقین ہو گیا کہ یہ خط نمی کا ہی ہے۔

اتوار کو مقررہ وقت پر وہ ٹریننگ اینڈ ایمپلائمنٹ سنٹر کے قریب پہنچ گیا، لیکن پریشانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے وہاں سریکھا کو کھڑی دیکھا۔واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ سریکھا چلائی۔۔۔ "بھاگ کہاں چلے ہو۔۔۔؟"

"میں کہتی ہوں نمی سے نہیں ملو گے کیا؟۔۔۔بیچاری بہت مظلوم ہے۔۔"

"ٹھہریئے۔۔۔فوٹو تو لیتے جایئے۔۔۔کیا البم میں چھوڑی ہوئی جگہ یوں ہی خالی پڑی رہے گی۔۔؟" لیکن وہ وہاں ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہ رکا اور اتنے تیز قدم اٹھانے لگا جیسے سریکھا کی مزید شرارت آمیز آواز کانوں میں پڑنے سے پہلے ہی وہ بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔

(مطبوعہ مئی ۱۹۵۱ء بیسویں صدی دہلی)

نام	ستیہ پال آنند
ولدیت	رام نارائن آنند
پیدائش	۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء
جائے پیدائش	کوٹ سارنگ ضلع کیمبل پور (حال) چکوال
تعلیم	ایم اے (انگریزی)
	ڈاکٹریٹ انگریزی ادب، فلسفہ

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے آباواجداد ضلع اٹک کی سابق تحصیل تلہ گنگ کے ایک گاؤں کوٹ سارنگ سے تھے۔ والدہ ودیا وتی پنجابی زبان کی شاعرہ اور سکھ سکالر تھیں۔ والد رام نارائن آنند ہندو مذہب کے پیروکار تھے ان کے آباواجداد کا تعلق ہندوؤں کی ایک شاخ لکھرائن سے تھا۔ رام نارائن آنند پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور نوشہرہ میں اپنی پیشہ ورانہ خدمات انجام دیتے رہے۔

ستیہ پال آنند کو ابتدائی تعلیم کے لیے کوٹ سارنگ کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ نوشہرہ ہائی اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔

شعر گوئی کا آغاز اسی دوران ہوا اور ان کی پہلی نظم ''ویکلی پشاور'' میں بہ عنوان ''سرحدی سماچار'' شائع ہوئی بعدازاں راول پنڈی تشریف لے آئے جہاں پہلے موہن پورہ اور پھر آریہ محلہ میں رہائش اختیار کی مشن ہائی اسکول راول پنڈی میں زیر تعلیم رہے اور ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کی۔ یہاں انہیں تلوک چند محروم کی راہ نمائی میسر آئی۔

تقسیم ہند پر لدھیانہ تشریف لے گئے۔ دوران ہجرت والد کا انتقال ہوا۔ باقی ماندہ خاندان کی کفالت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۹۵۱ء میں ادیب فاضل اردو آنرز، ۱۹۵۲ء میں انٹرمیڈیٹ ۱۹۵۴ء بی اے آنرز فلسفہ ۱۹۶۰ء انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد شعبۂ تدریس سے منسلک ہو گئے اور ڈی اے وی کالج پنجاب یونی ورسٹی چندی گڑھ سے ریٹائرڈ ہوئے۔

دورانِ ملازمت'' changning concept of reality and literary
''teohniques of expression
کے موضوع پرڈاکٹریٹ کی. بعدازاں Trinity University Texas سے فلسفہ پرڈاکٹریٹ کی دوسری ڈگری حاصل کی۔

جامعیات کی سطح پر برطانیہ،سعودی عرب، یواے ای اور کینڈا میں پڑھاتے رہے۔۲۰۰۵ءکو یونی ورسٹی آف کولمبیا واشنگٹن ڈی سی سے ریٹارڈ ہوئے۔

برطانیہ اورامریکہ کی یونی ورسٹیوں میں بہ طور وزٹنگ اسکالر کام۔علاوہ ازیں عالمی سطح پر بے شمار ادبی سیمنارز میں بہ طور شاعر، ریسرچ اسکالر شرکت فرما چکے ہیں۔تلوک چند محروم کی صحبت میسر رہی اور انہوں نے نظم کی جانب راغب کیا بعدازاں جوش ملسیانی نے اس پر مہرثبت کی۔

ناول،تنقید اور افسانہ نگاری پر بھی طبع آزمائی کی ابتدا میں ان کے افسانے ''مست قلندر'' مستانہ جوگی'' وغیرہ میں شائع ہوئے بعد ازاں انڈو پاک کے معتبر جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔نثر نگاری کے ساتھ انہوں نے جدید نظم میں اپنا نام پیدا کیا۔

مطبوعات:

۱۔جینے کے لیے (افسانے)۱۹۵۳ء
۲۔اپنے مرکز کی طرف (افسانے)۱۹۶۲ء
۳۔ اپنی اپنی زنجیر (افسانے)۱۹۸۷ء
۴۔پتھر کی صلیب (افسانے)۱۹۸۹ء
۵۔دل کی بستی (افسانے)۱۹۵۷ء
۶۔موت عشق اور زندگی (ناول)۱۹۵۵ء
۷۔آہٹ (ناول)۱۹۵۸ء
۸۔ چوک گھنٹہ گھر (ناول)۱۹۵۸ء
۹۔ شہر کا ایک دن (ناول)۱۹۹۱ء
۱۰۔جائزے (شاعری)

۱۱۔ دستِ برگ (شاعری) ۱۹۹۱ء

۱۲۔ وقت لاوقت (شاعری) ۱۹۹۳ء

۱۳۔ اپنے والی سحر بند کھڑکی ہے (شاعری) ۱۹۹۴ء

۱۴۔ لہو بولتا ہے (شاعری) ۱۹۹۷ء

۱۵۔ مستقبل آ مجھ سے مل (شاعری) ۱۹۹۹ء

۱۶۔ میرے اندر ایک سمندر (شاعری) ۲۰۰۷ء

۱۷۔ بزمِ عمر (شاعری) آخری چٹان تک (شاعری) ۲۰۰۰ء

۱۸۔ مجھے نہ کرو داغ (شاعری) ۲۰۰۵ء

۱۹۔ کتھا چہار جنموں کی (یادداشتیں) ۲۰۱۳ء

اس کے علاوہ ہندی پنجابی اور انگریزی کی ۲۰ سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک کتاب ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی شامل ہے۔

ماخذ

ادب ساز، سہ ماہی، نصرت ظہیر، دہلی ۲۰۰۸ء

چہار سو، ماہنامہ، گلزار جاوید، راولپنڈی ۲۰۰۴ء

شاعر، ماہنامہ، افتخار امام رضوی، دہلی

انگلش چینل کا پیراک

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف تہہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی۔ ایک لمحہ کے لیے ہوائی اڈے کی ٹرانزٹ لاونج کی بوجھل فضا میں معلق رہی، پھر شیشے کے وزنی دروازوں کو توڑ کر باہر ہوائی پٹڑی کی طرف بڑھی۔۔۔۔اور پھر اُڑان بھرتے ہوئے ایئر انڈیا کے طیارے کے پیچھے پرواز کر گئی۔

جب اس نے میری طرف آنکھیں گھمائیں تو وہ بے جان تھیں۔اتنی دیر کے بعد میں نے کہا''اجیت سنگھ تم بہت بدل گئے ہو۔''

''ہاں بھائی صاحب'' وہ بولا''تبدیلی تو قدرت کا اصول ہے۔اگر ہم بدلیں نہیں تو جامد ہو جائیں۔۔۔ہم ملے بھی تو پندرہ برسوں کے بعد ہیں۔آیئے،ایک بیئر ہو جائے۔''

ہیتھرو کا ہوائی اڈہ یوروپ کے مصروف ترین اڈوں میں سے ایک ہے۔ ہر طرف گہما گہمی۔قسم قسم کی زبانوں میں گفت گو چہل پہل،لیکن ریل پیل نہیں۔ٹرانزٹ لاونج کا ماحول خود میں ایک کشش رکھتا ہے۔گدے دار کرسیوں پر لوگ بیٹھے یا اونگھتے ہوئے۔کچھ لوگ ڈیوٹی فری دکانوں کا طواف کرتے ہوئے کچھ وقت کٹی کے لیے بے ارادہ ٹہلتے ہوئے اور کچھ میری طرح اخبار پڑھتے ہوئے۔میں وارسا سے لندن تک پولیشین ایئر لائنیز کی صبح کی فلائٹ سے پہنچا تھا اور مجھے دس منٹ کے انتظار کے بعد ائیر کنیڈا کی فلائیٹ ٹورنٹو کے لیے پکڑنی تھی۔ابھی چار گھنٹے ہی گزرے تھے۔مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔میں نے اخبار کو تہہ کیا۔اپنی پڑھنے والی عینک اتاری۔تبھی مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ سے دس قدم دور کھڑا ہوا،ایئر پورٹ سیکورٹی کی وردی میں ملبوس ایک شخص مجھے بہ نظرِ غور دیکھ رہا ہے۔رنگ اور چہرے کے خدوخال سے وہ ہندوستانی نژاد تھا۔لیکن اس کی غیر معمولی توجہ میرے لیے سردرد کا سبب بن گئی۔طیاروں کے اغوا اور بین الاقوامی دہشت گردی کے اس زمانے میں کون ایسا ہوائی مسافر ہوگا،جو ہوائی سیکورٹی کے

کسی کارندے سے الجھنے کی کوشش کرے گا؟ میں نے پہلو بدلا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی لیکن لا پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اخبار پھر پوری طرح کھول کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ ایک منٹ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ائیر پورٹ سیکورٹی کا کارندہ میرے سامنے آ کھڑا ہو گیا ہے اور مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اخبار ہٹا کر اس کی طرف دیکھا، ''جی۔۔۔؟'' میں نے انگریزی میں کہا ''کیا بات ہے؟''

خلاف توقع وہ پنجابی میں بولا، ''بھرا جی۔ آنند صاحب؟''

''جی۔۔۔'' میں نے ہڑبڑا کر کہا، ''آپ کو پہچانا نہیں میں نے!''

وہ آگے بڑھ آیا۔ ''اوئے بھرا جی۔۔۔ آپ نے اجیت سنگھ کو نہیں پہچانا؟ جیتو کو؟ اپنے چھوٹے بھائی کو؟ اپنے غلام کو؟''

اپنے ہاتھوں سے میرے گھٹنے چھوتے ہوئے اس نے احترام کا مظاہرہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے مجھے اٹھاتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

''میں جی، میں آپ کا جیتو، آپ کا چھوٹا بھائی۔ آپ کا غلام جی!'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''آپ نے مجھے نہیں پہچانا جی؟ آپ کو تو میں روز یاد کرتا ہوں۔ اب پنجاب میں میرا کون ہے، آپ بھی مجھے بھول گئے جی؟''

''اجیت سنگھ'' میں نے کہا ''ارے تم ہو میرے بھائی! میں نے تو سوچا کوئی سیکورٹی کا افسر میری تلاشی لینے کے درپے ہے۔'' میں نے پھر اسے گلے لگا لیا۔ ''تمہیں کیسے بھولوں گا۔ میرے عزیز! کیا میں پنجاب کے سب سے بڑے پیراک اور اپنے دوست کو بھول سکتا ہوں؟'' وہ میرے پاس بیٹھ گیا، ''جب میں نے دیکھا آپ کو تو میں نے کہا، دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے، میں غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے بھرا جی ہیں۔ تب میں نے سوچا، دیکھوں مجھے پہچانتے ہیں بھی کہ نہیں!''

میں نے بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ بیس برس پہلے کا اجیت میری آنکھوں کے سامنے ابھر آیا۔ یوں تنا ہوا سینہ، بھرا ہوا چہرہ جس پر ابھی مسیں پھوٹی ہی تھیں۔ آنکھوں میں شروع جوانی کی گلنار مستی اور اس پر بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں جو ایک پیراک کی خاصہ تھیں۔ اجیت سنگھ عرف جیتو جو سارے دیہاتی علاقے کا مانا ہوا پیراک تھا۔ جس نے ہر سال دیہات کے صوبائی کھیلوں کے مقابلوں میں تالاب کی دودو

سو بار لمبائیاں تیر کر کھلاڑیوں اور منتظمین سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ اجیت سنگھ جس پر گاؤں کی الھڑ دوشیزائیں مرتی تھیں، جو الجبرے اور جیومیٹری میں تو بارہا فیل ہوا تھا لیکن تیراکی کے مقابلوں میں ہر بار پہلا انعام جیتا کرتا تھا۔

جیتو! وہی جیتو تھا۔ لیکن کتنا مختلف! جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس کے گال پچکے ہوئے تھے، سر کے بال پتلے ہوتے ہوئے غائب ہونے لگے تھے۔ اس کا سینہ بھرا ہوا تھا لیکن سانس ایک دمے کے مریض کی طرح تھی۔ چالیس ایک برس کا ہوتے ہوئے بھی وہ پچاس پچپن سے کم کا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ ہاں اس کی آنکھوں ایک چمک تھی۔ زندگی کی روشنی وہ لہر تھی جو مدوجزر کے انخلاء کے بعد آتی جاتی رہتی ہے۔۔۔ جب اس کی روشنی کی لہر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو میں نے پوچھا،''پندرہ برسوں میں ایک بار بھی واپس وطن نہیں گئے ؟''

اور تب مجھے ایک لمحے کے لیے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف، تہہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوا میں معلق رہی ہو اور۔۔۔ پھر ائیر انڈیا کے طیارے کے پیچھے اُڑ گئی ہو۔

ہم نے ایک بیئر پی۔ پھر اس نے کہا'' بھرا جی۔ آپ تھوڑی دیر بیٹھیے میں آدھ گھنٹے کی شارٹ لیو (قلیل المدت چھٹی) لے کر آتا ہوں۔ پھر تسلی اور دل جمی سے بیٹھیں گے۔''

جب وہ چلا گیا اور میں نے بیئر کا ایک اونگ سامنے رکھ لیا تو یادوں کے ریلے ہیتھرو کے ہوائی اڈے کی بار کا ماحول بہہ گیا اور میں نے پندرہ بیس برس پہلے کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں میں یونی ورسٹی پروفیسر نہ تھا اور اجیت سنگھ ایئر پورٹ سیکورٹی کا کارندہ نہ تھا۔ جہاں ہم دونوں بچپن کے رفیق تھے۔

اجیت سنگھ مجھ سے تین برس چھوٹا تھا۔ صوبے دار ہردت سنگھ کا لڑکا۔ الھڑ، اکھڑ، تند مزاج لیکن بہت ہی پیارا۔ دوستوں کا دوست یاروں کا یار۔ اس کے والد کو اٹلی کے مورچے پر لامثال بہادری کے لیے وکٹوریا کراس ملا تھا جو برطانوی سلطنت کا سب بڑا فوجی اعزاز تھا۔ مشہور تھا کہ صوبے دار ہردت سنگھ اپنا داہنا ہاتھ دستانے میں ہمیشہ اس لیے رکھتے تھے کہ جس ہاتھ کو تمغہ سینے پر آویزاں ہونے کے بعد فرماں روائے انگلستان سے ملانے کا اعزاز عطا ہوا ہو وہ اب کسی اور معمولی شخص سے ملانا ہتک عزت ہے۔ صرف اجیت سنگھ یا اس کے قریبی دوستوں کو ہی اس بات کا علم تھا کہ صوبے دار صاحب کا داہنا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور

اس کی جگہ ربڑ کا مصنوعی ہاتھ تھا جس پر وہ ہمیشہ دستانہ چڑھا کر رکھتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس مصنوعی ہاتھ کی انگلیاں قدرتی ہاتھ کی طرح چلتی تھیں۔ اس میں وہ گلاس پکڑ سکتے تھے۔ گانٹھ کھول سکتے تھے۔ ستر برس سے اوپر کی عمر ہونے کے باوجود اپنے بڑھاپے کی اولاد اجیت سنگھ کی پٹائی کر سکتے تھے۔ اجیت سنگھ کی ماں تو اسے پیدا کرتے ہی مر گئی تھی۔ ایک بوڑھی پھوپھی نے اسے پالا تھا لیکن وہ بھی اجیت سنگھ کی کم عمری میں ہی خدا کو پیاری ہو گئی تھی۔

جیتو پہلی بار چھٹی جماعت میں فیل ہوا۔ میں تب نویں جماعت میں تھا۔ نتیجے کے دن گھر پر اس کی خوب پٹائی ہوئی، لیکن ایک ہفتے کے بعد ضلع کے پیراکی کے مقابلوں میں اول آنے پر اسے تمغہ سرٹیفکیٹ اور دو سو روپے کا نقد انعام میں ملا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے ذاتی اختیار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ساتویں جماعت میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد جب محکمہ تعلیم سے کھیلوں جسمانی مقابلوں اور پی ٹی کا اختیاری مضمون وجود میں آ گیا تو جیتو کے دن بدل گئے۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم سب نے جلوس کی شکل میں جیتو کو پھولوں کے ہار پہنا کر بس پر بٹھایا تھا کہ وہ ضلع کے صدر مقام پر پر جا کر اپنی تیراکی کا مظاہرہ کر سکے۔ مقابلہ مختلف ضلعوں کے کھلاڑیوں میں تھا۔ گاؤں کے تالاب کے نواحی گاؤں کی جھیلوں اور نہروں میں تیرنے والے جیتو نے نہ صرف ہر مقابلہ جیتا اور کئی ریکارڈ توڑ دیئے بلکہ تماشائیوں کی خاص فرمائش اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے ایک خاص ذاتی انعام کے اعلان کے بعد سوئمنگ پول کے چھ گھنٹوں میں ۱۸۰ چکر پورے کر کے صوبائی ریکارڈ بھی توڑ ڈالا تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں تو ان کے تراشے کئی مہینوں تک ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں دیواروں پر آویزاں رہے۔ اس کے والد نے تراشوں کو فریم کروا کے اپنی فوجی تصویروں کے ساتھ لٹکایا۔ اور وہ دن میں کیسے بھول سکتا ہوں جب آدھی رات کے وقت میری بیٹھک کے باہر گلی میں کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو جیتو کو کھڑے پایا۔ اس کے پیچھے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے ایک شبیہ تھی جو سردی سے کانپ رہی تھی۔

''جیتو۔۔۔ اندر آ جاؤ۔ کیا بات ہے کون ہے تمہارے ساتھ؟''

''بھرا جی، ہربنس کور ہے، جرن سنگھ کی بہن۔'' اس نے کہا ''میں اندر نہیں آؤں گا۔ مجھے آپ کی موٹر سائیکل چاہیے۔ اسے شہر لے جانا ہے۔''

''جیتو۔۔ اندر تو آؤ''میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔اس کے پیچھے ہربنس بھی جھینپتی، کپکپاتی ہوئی اندر آ گئی۔

''بیٹھ جاؤ۔۔ ہربنس کور''میں نے کہا''ہاں اب بتاؤ بات کیا ہے؟''

''اس کی شادی کرر ہے ہیں جی، پرسوں۔ ماناوالے کے زمیندار جوگندر سنگھ کے ساتھ۔ جوگندر پچاس سال کا ہےاوراس کے بھائی نے پانچ ہزارروپے لیے ہیں اس سے۔۔۔۔ میں نہیں ہونے دوں گا جی یہ سادی!واہگورو کی سوگند کبھی نہیں ہونے دوں گا!''

''شہر میں کہاں سے لے جار ہے ہو؟''

''ڈی سی صاحب کے پاس جی۔۔۔۔ابھی پچھے ہفتے توانہوں نے کہا تھا،جیتو جب جی چاہے میری کوٹھی آجایا کرو۔۔۔۔ میں ان کے لڑکے کو تیرنا سکھاتا ہوں۔ بھراجی۔۔۔ بڑے اچھے افسر ہیں۔ خود تیراک رہے ہیں۔ مجھے مدارس مقابلے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ کہتے ہیں روس بھی بھیجیں گے۔انہیں کہوں گا ، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اٹھارہ برس کی لڑکی کا بیاہ اس کی مرضی کے بغیر ہی کر دیا جائے؟ عدالت میں اس کی شادی کروں گا جی!''

جیتو ہربنس کو لے کر ڈی سی صاحب کے پاس نہیں گیا کیونکہ اس وقت میری ماں اور میرے والد اندر آ گئے اور انہوں نے چرن سنگھ کو بلا کر اس کی بہن کو اس کے حوالے کر دیا۔صوبیدار ہردت سنگھ بھی آ گئے اور جب سمجھانے بجھانے کے بعد جیتو بھی چپ چاپ ان کے ساتھ چلا گیا تو میں نے سوچا یہ جیتو کی زندگی کی سب سے بڑی شکست ہے،اب وہ کبھی تیراکی کے مقابلے نہیں جیت سکے گا۔کبھی سر اٹھا کر گاؤں کی گلیوں میں نہیں چل سکے گا۔اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ریت کی طرح خشک ہو کر نیم جان ہو جائیں گی، وہ ٹوٹ جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔معلوم ہوا کہ اس نے کسی کلب کے سوئمنگ پول میں لائف گارڈ کی نوکری کر لی۔ چھ ماہ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ گاؤں لوٹا تو میں یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے شہر جا چکا تھا۔لیکن کچھ دنوں بعد وہ میرے ہوسٹل میں مجھ سے ملنے آیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ایک سنجیدگی تھی۔ایک ٹھہراؤ تھا۔زندگی نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔

''کیا پروگرام ہے اب؟'' میں نے پوچھا۔

''بھرا جی۔'' اس نے کہا تھا'' میں مدراس بھی گیا تھا۔ دھنش کوٹی کے ساحل سے لنکا تک تیرا جا سکتا ہے کئی لوگوں نے یہ فاصلہ عبور بھی کیا ہے۔ مجھے مدراس کی ایک کلب سے آفر بھی ہے میں آپ کی دعا سے یہ دوری طے کر لوں گا۔''

''بہت خوب اجیت۔'' میں نے کہا تھا'' وہ دن بھی آئے گا جب تم انگلش چینل بھی پار کرو گے۔''

''وہ کہاں ہے بھرا جی؟'' اس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی۔ اور تب میں نے اسے انگلستان اور فرانس کے ساحلوں کو دھوتے ہوئے اس چھوٹے سمندر کا ذکر کیا تھا جو ۲۴ کلومیٹر چوڑا ہے اور جسے تیر کر پار کرنے والے ایک نہیں درجنوں ایسے تیراک ہیں جو کئی برس کی مشق اور کئی بار کی کوشش کے بعد کامیاب ہوئے ہیں۔ میں نے اٹلس نکال کر اسے پوری تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

''ان ہی دنوں۔۔۔۔'' میں نے اسے بتایا تھا'' ایک بنگالی نوجوان نے بھی یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اور شاید ایک یا ایک سے زیادہ عورتیں بھی اسے تیر کر پار کر چکی ہیں۔''

''اور ہاں'' میں نے کہا'' ویزا بھی لینا پڑے گا جو ذرا زیادہ مشکل کام ہے۔''

بائیس تئیس برس کا جیتو، جسے تیراکی کے سب چیلنج پسند تھے، جو عورت کے پیار کی بازی ہار چکا تھا۔ وہ جب میرے کمرے سے گیا تو پوری تفصیل لکھ کر لے گیا اس امید کے ساتھ جو اسے ایک دن انگلستان لے جا کر یہ مقابلہ جیتنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

یادوں کے بادل گہرے ہوتے گئے۔ میں نے بیئر اور منگوائی اور پھر ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔ میں جب گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دو بار گاؤں گیا تو جیتو کی خبریں ملیں۔ وہ فلاں مقابلے میں اول آیا۔ اسے فلاں انعام ملا۔ فلاں افسر یا وزیر نے اسے ولایت بھیجنے کا وعدہ کیا اور صوبائی صدر مقام پر آ کر ملنے کے لیے کہا۔ فلاں جگہ بھرے ہوئے جلسے میں یہ کہا گیا کہ جیتو تو دنیا کا سب سے عمدہ تیراک ہے اور اگر اسے باقاعدہ ٹریننگ ملے تو وہ اولمپک کھیلوں کے مقابلے میں سونے کا تمغہ جیت سکتا ہے۔۔۔۔ لیکن ہر بار یہ بھی سننے کو ملتا کہ بیسار کوشش کے باوجود جیتو کی سنوائی سرکار کے ان طبقوں تک نہ ہوئی جو ان کاموں کے لیے رقمیں مخصوص کرتے ہیں یا کھلاڑیوں کی فہرست کو آخری شکل دیتے ہیں۔ ہر بار اس کی جگہ کسی سفارشی کا نام ڈال دیا جاتا ہے۔ یا کھلاڑیوں کی فہرست کو آخری شکل دیتے ہیں۔ ہر بار اس

کی جگہ کسی سفارشی کا نام ڈال دیا جاتا اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر، اس کی تعریف کے پل باندھ کر افسر لوگ اسے کہہ دیتے کہ اگلی بار تمہارا نام ضرور سرِ فہرست ہوگا۔

یونیورسٹی میں لیکچرر بننے کے بعد میرا گاؤں میں آنا جانا بالکل ہی بند ہوگیا۔ زندگی ایک دوسری ڈگر پر چلنے لگی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے امریکہ گیا تو تین برس لگ گئے۔ اس کے بعد بھی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کے لیے کئی بار بیرون ملک جانا پڑا۔ اس لیے جیتو سے تعلق تو ایک طرح اختتام کی منزل تک پہنچ گیا۔

کئی برسوں کے بعد گاؤں کے اسکول سے ایک ٹیچر کسی ذاتی کام سے یونیورسٹی میں آئے اور مجھے از راہِ عنایت ملے تو انہوں نے بتایا کہ جیتو انگلستان پہنچ گیا۔ میں بہت حیران ہوا، ''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت مایوس ہوگیا تھا بے چارہ۔'' وہ بولے ''بھارت سے سری لنکا تک کا فاصلہ ایک بار نہیں، دو بار اس نے طے کیا۔ اودے پور، راجستھان کی اودے ساگر جھیل کا گولائی میں چار بار طواف کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا لیکن اسے باہر جانے کے لیے مالی امداد کسی نے نہ دی۔ وزیروں، افسروں اور کھیل مقابلوں کے کارکنوں کے وعدے کبھی پورے نہ ہوئے۔ بے چارے کو قدم قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر ایک دن گاؤں آ کر اس نے اپنے کھیت اور اپنا مکان بیچ دیئے اور جو تیس چالیس ہزار ملے وہ ایک ٹریول ایجنٹ کو دے کر جعلی ویزے پر ایران اور وہاں سے ترقی پہنچ گیا۔ وہاں مغربی جرمنی اور کئی مہینوں کے بعد، انگلستان۔ نہ معلوم یہ سارا سفر اس نے کیسے طے کیا۔ لیکن مجھے اس کے خط باقاعدگی سے ملتے رہے اور مجھے علم ہوتا رہا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔۔ میرے خیال میں اب اسے انگلستان میں قانونی طور پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔'

''یہ تو بہت مزے کی خبر ہے۔'' میں نے کہا ''اس کی بچپن کی یہ خواہش تھی کہ وہ تیر کر انگلش چینل کو پار کرے۔ ابھی اخبار میں تو کوئی خبر نہیں آئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔''

''بھرا جی۔۔۔۔'' جیتو مجھے یادوں کے گہرے دھندلکے سے واپس ہیتھرو کی بار کیا حول میں کھینچ لایا، ''معاف کریں، مجھے دیر ہوگئی۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ میری فلائیٹ میں دو گھنٹے باقی تھے۔ آپ کی فلائیٹ گیٹ نمبر ۱۲ پر

ہے، ہمارے پاس وقت ہے۔آئیے کچھ پیٹ پوجا کر لیں۔''

ہم دونوں ٹرانزٹ لاؤنج کے ریستوران میں چلے گئے۔وہ اداس تھا۔لیکن اس اداسی کی مہیب چادر کے اوپر بھی ایک دبیز پردہ پڑا ہوا تھا جس سے وہ بار بار اپنے دل کی کشمکش کو چھپا رہا تھا۔

''آپ کے لیے کیا تحفہ لاتا بھرا جی۔۔۔'' اس نے کہا'' آپ تو اتنی دنیا گھوم چکے ہیں، آپ کے لیے کون سی چیز نئی ہے؟ بس میری تو دعا ہے کہ واہگورو آپ کو سکھی رکھیں۔''

''جیتو۔۔پنجاب لوٹ جاؤ۔۔۔یہاں کی آب و ہوا نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

''کہاں جاؤں گا بھرا جی وہاں اب میرا کون ہے؟ یہاں سبھی اپنے دوست یار، بھائی بند، میری زبان بولنے والے۔۔۔۔۔ایئرپورٹ پر کئی علاقے کے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔''

''تمہاری صحت کو کیا ہوا جیتو؟ میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''بھرا جی۔صحت تو ترکی میں ہی خراب ہونے لگی تھی۔کئی مہینے ہوٹلوں میں برتن دھوئے۔کاریں صاف کیں۔عمارت سازی کے کارخانوں میں کام کیا۔کام کا پرمٹ نہ ہونے کی وجہ سے جرمنی میں جیل بھی کاٹی پھر یہاں جعلی پاسپورٹ پر پہنچا۔اجیت سنگھ تو ایک عام نام ہے اس نام کے پاسپورٹ اور ویزے تو عام ملتے ہیں۔۔۔۔یہاں آکر پہلے کپڑوں کی ملوں میں کام کیا۔کچھ مہینے کوئلے کی کانوں میں بھی کام کرنا پڑا، تب نمونیہ ہو گیا پھر پیلو رسی ہوگئی اور ایک پھیپھڑے میں پانی بھر گیا۔علاج ٹھیک ہو گیا۔۔۔۔ڈاکٹر کہتے تھے میں نے تیر تیر کر اپنے پھیپھڑوں کی بناوٹ ہی خراب کر لی۔۔۔۔'' وہ ہنسا''خیر علاج ہو گیا۔پھر لندن آ گیا اب آٹھ برس سے یہاں ہوں۔ایئرپورٹ سیکورٹی میں اچھی نوکری ہے چھ سات سو پاونڈ مل جاتا ہے اور گزارہ مزے سے ہو رہا ہے۔''

''اور تمہارا تیراکی کا شوق جیتو؟'' اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی سی لہرا گئی۔لیکن وہ چپ رہا۔''اور انگلش چینل کو عبور کرنے کا عزم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔۔۔اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، انگلش چینل تو میں نے عبور کر لی بھرا جی۔'' اس نے کہا''پوری طرح عبور کر لی۔۔۔۔۔وہ دیکھئے۔۔۔۔''

اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔کچھ دوری پر ایک گوری انگریز عورت مسکراتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔

''آپ کوملوانے کے لیے اسے کام سے بلوایا ہے۔خاص طور پر کہا کہ آ جائے اور اپنے جیٹھ بھائی سے مل لے۔''اس سے پہلے کہ میں حیرات میں ڈوبا ہوا اس سے کچھ پوچھ سکتا،قریب آنے والی عورت کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ میرے سامنے کر دیا۔

''یہ میگی ہے جی! مارگریٹ سنگھ! میری بیوی۔۔۔۔۔۔۔میرے بیٹے کی ماں۔۔۔۔۔اینڈ دِس از مائی برادر، مائی فرینڈ، مائی بھراجی۔''

اس نے انگریزی میں میرا تعارف دیا، ہماری شادی بھراجی آٹھ برس پہلے ہوئی تھی، میگی ہسپتال میں نرس ہے اس نے میری بیماری کے دنوں میں میری خدمت کی تھی۔''

اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھا'' بھراجی از آن ہز وے ٹو کینیڈا۔''اس نے اسے انگریزی میں بتایا۔میں نے کہا'' مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔۔۔۔۔میری دعا ہے کہ آپ دونوں خوش رہیں۔''

میگی نے انگریزی میں کہا، میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اجیت ملا۔میں اسے پیار کرتی ہوں اور اس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔''اور گیٹ نمبر ۱۲ کی طرف بڑھتے ہوئے جیتو نے کہا'' بھراجی! اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ کہ میں نے انگلش چینل عبور کر لیا ہے۔۔!''

''ہاں۔۔''میں نے کہا'' گاؤں کے تالاب سے انگلش چینل تک کا فاصلہ تم نے بخوبی پار کر لیا جیتو!''

(سہ ماہی ادب ساز، دہلی ۲۰۰۸ء)

نام	مختار احمد
قلمی نام	وقار بن الٰہی
پیدائش	۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء
جائے پیدائش	کیمبل پور (اٹک)
تعلیم	ایم اے اردو (گولڈ میڈلسٹ)

وقار بن الٰہی کا اصل نام مختار احمد ہے ان کی ولادت ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو کیمبل پور (اٹک) میں ہوئی سرکاری اندراج کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۲۴ مئی ۱۹۳۷ء ہے۔ چھٹی جماعت تک کیمبل پور (اٹک) میں زیرِ تعلیم رہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب انگریز سرکار نے ان کے والد کا تبادلہ انبالہ کیا تو وہ بھی انبالہ چلے گئے۔ تقسیمِ ہند پر پاکستان واپس چلے آئے۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۲ کوہاٹ سے ۱۹۹۵۲ء میں کیا۔ میٹرک کے بعد والدین کے ہمراہ روال پنڈی چلے آئے اور راول پنڈی کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگئے جہاں ۱۹۵۴ء میں ایف۔اے گورنمنٹ کالج اصغر مال راول پنڈی سے پاس کرنے کے بعد جب ان کے والد کی ٹرانسفر کیمبل پور ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۷ء میں یہاں سے بی۔اے کیا۔

۱۹۵۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے صحافت میں ڈپلومہ کیا۔ اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم رہنے کے دوران انہوں نے اپنی ذہانت کے خوب جوہر دکھائے اور ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ایم اے اردو میں گولڈ میڈل لیا۔

ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد ۱۹۵۹ء میں انہیں گورنمنٹ کالج ہری پور میں بہ طور لیکچرر ملازمت مل گئی یہاں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ان کا پہلا تبادلہ ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ کالج گوجر خان میں ہوا یہاں تقریباً دو سال قیام رہا اور پھر اپنی جنم بھومی کے شہر میں زمانہ طالب علمی کی یادیں تازہ

کرنے ۱۹۹۶۱ء کو گورنمنٹ کالج کیمبل پور چلے آئے ۔ یہاں انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران پہلی بار تقریباً پانچ سال تک کسی کالج میں قیام کیا اس سے قبل وہ جہاں بھی گئے دو سال سے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کا موقع نہ ملا ۱۹۶۶ء تک انہوں نے کیمبل پور میں تدریسی خدمات کو بخوبی انجام دیا ۔اس کے بعد گورنمنٹ کالج اسلام آباد ٹرانسفر ہوئی جہاں لیکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے ۔جلد ہی مرکزی وزارتِ تعلیم شعبۂ ثقافت اسلام آباد میں اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر کام کرنے لگے یہاں چھ سال تک رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۸۰ء میں بہ طور لینگوئج ایکسپرٹ براڈ کاسٹر ریڈیو پیکنگ بیجنگ عوامی جمہوریہ چین بھیج دیا گیا جہاں اس کے علاوہ جز وقتی مترجم رسالہ چین با تصویر میں ۱۹۸۲ء تک کام انجام دیا۔

ریڈیو تراڑ کھل آزاد کشمیر سے نوجوانوں کے لیے ہفتہ وار پروگرام ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک براڈ کاسٹ کیا۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۳ء تک ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر رہے اس کے بعد ایک سال جوائنٹ اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر کام کیا۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء سیکریٹری پرائم منسٹر لٹریسی کمشن اسلام آباد رہے پھر ایک سال جوائنٹ اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر اور ۱۹۹۷ء میں چیئرمین فیڈرل ایجوکیشن بورڈ اسلام آباد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۶۰ کی دہائی میں افسانہ نگاری سے کیا ان کی پہلی کہانی ''سائے'' اگست ۱۹۵۵ء میں بچوں کے رسالہ ''بھائی جان'' میں اس وقت شائع ہوئی جب گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں زیرِ تعلیم تھے۔ بعد ازاں اسی دہائی میں ان کے افسانے ماہنامہ ''بیسویں صدی'' ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' ماہنامہ ''نقاد'' ماہنامہ ''نگارش'' اور کیمبل پور کالج میگزین ''مشعل'' میں شائع ہوئے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد جب ممتاز مفتی نے اسلام آباد میں ''رابطہ'' کی بنیاد رکھی تو وقار بن الٰہی بھی اس میں شامل ہوئے اور اس کے اجلاسوں میں اپنی کہانیاں پیش کیں۔ علاوہ ازیں وہ حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے اجلاسوں میں بھی پیش پیش رہے۔

۷۰ کی دہائی میں بیشتر افسانہ نگار تجریدی و علامتی انداز میں افسانے لکھتے رہے لیکن وقار بن الٰہی بیانیہ کی روایت سے جڑے رہے اور انڈو پاک کے مقبول جرائد میں تواتر سے ان کے افسانے چھپتے رہے۔ تاہم اس وقت ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا تھا بعد ازاں ۱۹۹۲ء میں ان کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ تحقیقی مضامین، فیچر، رپورتاژ، تراجم، تبصرے اور طنز و

مزاح بھی لکھی۔

مطبوعات:

ا۔کس سے کہے وہ (افسانے) عتیق پبلشنگ ہاوس اسلام آباد (۱۹۹۲ء)

۲۔اُتر نا دریا میں (افسانے) لٹریری بکس اینڈ ساوئنڈ لاہور (۱۹۹۲ء)

۳۔چاہ درپیش (افسانے) نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد (۲۰۰۰ء)

۴۔اُمید کی کرن (بچوں کے لیے طویل کہانی) نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد (۲۰۰۳ء)

۵۔پہلے پہلے خواب (افسانے) نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد (۲۰۰۴ء)

۶۔ماں میں تھک گیا ہوں (آپ بیتی) نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد (۲۰۰۶ء)

تراجم:

ا۔سمندر کے نیچے (طویل سائنسی کہانی) فیروز سنز لاہور (۱۹۵۸ء)

۲۔چین باتصویر (ماہنامہ) عوامی جمہوریہ چین بیجنگ (نومبر ۸۰ سے دسمبر ۱۹۸۲ء)

۳۔کوریئر (ماہنامہ) یونیسکو (بیس شمارے، ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء)

ماخذ

گلزار جاوید، ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء

وقار بن الٰہی، ماں میں تھک گیا ہوں، خودنوشت، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

مکتوب بنام راقم ۲۰۰۹ء

ادنیٰ سی خواہش

وقار بن الٰہی

یہاں تک تو خیریت ہی گزری تھی لیکن قبرستان میں اندھیرا اور قبروں کی بہتات کی وجہ سے ایک نامعلوم سا خوف سب کو گھیرے ہوئے تھا۔ بعضوں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں قدرے سنسناہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ جانتے سبھی تھے کہ منوں مٹی تلے لیٹے لوگ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن اَن دیکھی دنیا اور اندھیرے میں ڈوبے شہرِ خموشاں کا خوف ہر کسی کو پریشان کر رہا تھا۔ ان کے لیے یہ تصور ہی جان لیوا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اسی شہر کا حصہ ہوں گے۔ قبر کو چار بانسوں کے سہارے تنی ایک معمولی سی ترپال نے ڈھانپ رکھا تھا۔ غالباً مقصد ان گورکنوں کو دھوپ سے بچانا تھا جنہوں نے تپتی دوپہر میں قبر کھودی تھی یا قبر کے گڑھے کو بارش برسنے کی صورت پانی سے محفوظ کرنا تھا۔ بہر حال مقصد جو بھی تھا، اس وقت وہ معمولی سا چھپر اور ایک بانس کے سہارے لٹکتا ہوا روشن بلب سب کو یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ زندہ ہیں اور اسی دنیا میں ہیں۔ سب کے سب قبر کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے، یوں کہ کسی نظر باقی قبروں پر نہ پڑے۔

اس سے پہلے خیریت ہی گزری تھی۔ ہاں تھوڑی سی گڑبڑ ضرور ہوئی تھی۔ ایک تو جنازہ اٹھانے میں خاصی تاخیر ہو گئی کہ ایک برخوردار نے لاہور سے آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی رونے دھونے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ پھر جنازہ مسجد میں پہنچا، تو مولوی صاحب سے تو تو میں میں ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پہلے سب حضرات کو نماز ادا کرنا پڑی، اب بیشتر لوگ تو آئے ہی اس ارادے سے تھے کہ وہ مٹھی مٹی ڈالیں گے اور واپس آ جائیں گے۔ اس لیے جو کوئی وضو سے تھا وہ تو صف میں کھڑا ہو گیا اور دوسرے مسجد کے نلکوں کی طرف بھاگے، لیکن قسمت کہ نلکوں سے آنسو تو بہہ رہے تھے البتہ پانی نہیں تھا۔ اب لوگ امام صاحب سے الجھ پڑے گھر سے چلے تھے تو انہیں وضو کر کے نکلنا چاہیے تھا۔ جب یہ تکرار طول پکڑنے لگی تو امام صاحب نے جماعت کھڑی کر دی، چنانچہ چند ایک تو وضو کے بغیر ہی صفوں

میں گھس گئے اور خاصے ایک طرف کھڑے ہوکر ے نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ الجھن تو مٹ گئی لیکن وقت ضائع ہوگیا۔ پھر جب جنازہ اٹھا کے قبرستان کی طرف چلنے لگے تو امام صاحب نے تنبیہ کی، کہ کلمہ شہادت کی صدا کوئی نہ لگائے کیونکہ کلمہ پڑھتا کوئی نہیں، بلکہ بہت سوں کو آتا بھی نہیں، اس لیے لوگ صرف بڑبڑا کے رہ جاتے ہیں۔ کئی ایک پھر الجھنے کو تیار گئے لیکن خیریت گزری کہ بات نے طول نہیں کھینچا۔ دراصل لوگ تاخیر کی وجہ سے چڑ چڑے ہورہے تھے، ایک تو رات خاصی گزر چکی تھی، دوسرے ہر کسی کی آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں۔

میت کو لحد کے کنارے اتار دیا گیا یوں کہ چار پائی کے دو پاؤں لحد کے کنارے پر آگئے۔ جب کہ دوسرے دونوں پاؤں ہوا میں معلق ہوگئے۔ ایک دو حضرات اگر آگے بڑھ کے تھام نہ لیتے، تو عین ممکن تھا، میت چار پائی سمیت لحد میں لڑھک جاتی۔ مرحلہ میت کو لحد میں اتارنے کا تھا۔ سبھی اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ کسی کا خیال تھا، چار پائی کو اور نزدیک لایا جائے، جب کہ ایک صاحب نے آواز لگائی، کیوں نہ میت کو اٹھا لیا جائے، ایک اور صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً لحد میں چھلانگ لگا دی لیکن یہ دیکھ کے کہ چار آدمی پہلے سے وہاں موجود ہیں، باہر کی طرف لپکے، ان کی مدد کے لیے ایک دو ہاتھ بڑھے لیکن ان صاحب کا پاؤں ایسا الجھا کہ لحد کا کنارہ ٹوٹ کے مٹی اندر جا گری۔ یوں کہیے کہ ایک افراتفری کا عالم تھا، بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، لوگ تاریکی کا خوف اور بھوک بھول گئے، یاد رہا تو صرف یہ کہ میت کو لحد میں کیسے اتارا جائے۔ چند ایک نے پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا، شاید کوئی گورکن ہی نظر آجائیں لیکن وہ تو دور بیٹھے گپ شپ میں مصروف اور اس انتظار میں تھے کہ کب میت لحد میں اترے اور اپنا بقایا کام ختم کر کے گھروں کو جائیں۔ یہ تماشا ہر میت کو قبر میں اتارنے کے وقت ہوتا تھا کیونکہ دیکھنے کو ہر کوئی دیکھنا ضرور تھا لیکن آگے بڑھ کے ہاتھ کوئی بٹاتا نہ تھا اور میت کسی نہ کسی طرح قبر کے پیٹ میں اتر ہی جاتی تھی، پر آج لگتا تھا، آس پاس کوئی لال جھکڑ بھی نہ تھا، جوان کی مدد کو آتا۔

لوگ میت کو بوری کی طرح گھسیٹنے کے لیے تیاری کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے ایک شخص لوگوں کو ہٹاتا ہوا آ گے قبر کے کنارے کھڑے ہوکے اس نے پہلے شلوار کو اڑسا، پھر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے بڑی احتیاط سے قبر میں اترا، کہیں اس کے پاؤں سے ڈھیر کی مٹی اندر نہ گر جائے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے مراحل اس نے سنبھال لیے۔ بیشتر لوگوں نے سکھ کا سانس لیا، گو دو چار پھر بھی بولتے رہے لیکن

صاف ہو رہا تھا محسوس کہ وہ صرف اپنی عادت پوری کر رہے ہیں۔ اس شخص نے پہلے تو چار میں سے تین حضرات کو قبر میں سی باہر نکال دیا اور پھر جیسے حکم دیا۔ گورکن پتھر لاتے گئے اور وہ ترتیب سے انہیں رکھتے گیا۔ آخری پتھر اس نے رہنے دیا۔ پہلے گارے کے ساتھ تمام درزیں بند کیں۔ اگر کہیں بڑا سوراخ نظر آیا تو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے اسے بند کیا اور پھر گارے سے لپائی کر دی۔ ادھر سے فارغ ہو کے اس نے جھک کر اندر ہاتھ ڈالا، اور اضافی کپڑا کھینچ لیا، کفن پر بچھی چادر بھی اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔ اب اس نے پاؤں سے بندھی کفن کی ڈور کو کھولا اور ہٹ کر آ کر ی پتھر بھی اپنی جگہ جما دیا۔ گارا لگانے کے بعد اس نے قبر کے اندر سلوں پر نظر دوڑائی اور اطمینان کر لینے کے بعد اچھل کے باہر نکل آیا اور بولا۔

''دو دو مٹھی مٹی ڈال دیجئے۔'' باہر کھڑے سب لوگ جواب تک اس کی ساری کارروائی بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے چونک پڑے اور جلدی جلدی مٹی ڈالنے لگے۔ پھر ان کی جگہ گورکنوں نے لے لی اور وہ بیلچوں کی مدد سے قبر کا دوزخ بھرنے لگے۔ جب سطح برابر ہو گئی تو اس نے آگے بڑھ کر ایک لکڑی قبر کے سرہانے عین درمیان میں گاڑھ دی تا کہ بقایا مٹی قبر پر ہی پڑے۔ امام صاحب نے چند ایک آیات کی تلاوت کی اور دعا مانگی، اور پھر سب اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے۔ کسی نے پلٹ کے یہ نہ دیکھا کہ اس تاریکی میں منوں مٹی کے نیچے میت کی رات کیسے گزرے گی۔ کسی نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ شخص کون تھا، کہاں سے آیا تھا کہاں رہتا ہے، جس نے آج ان سب کی لاج رکھ لی۔

لیکن یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ روز کا معمول بن گیا۔ شہر نیا نیا آباد ہوا تھا اور بھانت بھانت کے لوگ آ کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دوڑ تو لگی ہوئی تھی لیکن گریڈوں کی، کوٹھیوں کی، بلندی کی طرف لپکنے کی دوڑ زیادہ تھی، بھلا ان معمولی باتوں کی طرف کون توجہ دیتا۔ گو قبرستان میں گورکن موجود تھے لیکن ایک تو وہ بھی اپنا بوجھ دوسروں پر لادنے کی کوشش کرتے اور دوسرے ہر کوئی اپنے عزیز کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارنے کا شوق پورا کرنے کی آرزو کرتا چنانچہ شہر میں کوئی کوچ کر جاتا اور اس کی میت قبرستان پہنچی تو اسے قبر میں اتارنا اور باقی مراحل طے کرنا جیسے جوئے شیر لانا ہو جاتا۔ بولتے سبھی تھے، بلکہ کچھ زیادہ ہی بولتے تھے لیکن آگے بڑھتا کوئی نہ تھا۔ یہ شخص تو جیسے سب کے لیے غیبی امداد ثابت ہوا تھا۔ جونہی کوئی جنازہ قبرستان پہنچتا، وہ جانے کہاں سے نمودار ہوتا۔ چپ چاپ میت کو قبر میں اتارتا سلیں جماتا، گارے کی لپائی کرتا اور مٹی ڈالنے اور دعا مانگنے کے بعد غائب ہو جاتا۔ پہلے پہل وہ اکیلا ہی آتا تھا۔ پھر ایک اور

شخص اس کے ساتھ آنے لگا لیکن وہ بھی تماشائی ہی تھا،اس ساری کارروائی میں اس کی کوئی مدد نہ کرتا ،چپ چاپ اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ جب سب رخصت ہونے لگتے تو وہ دونوں بھی ایک ساتھ چل دیتے۔

آہستہ آہستہ شہریوں کو بھی جیسے اس کی عادت ہوگئی کہ قبرستان پہنچتے اور وہ دکھائی نہ دیتا، تو اس کا انتظار کرنے لگ جاتے۔ انتظار کے وہ لمحے سب کے لیے کسی عذاب سے کم نہ ہوتے تھے۔ اس روز دوپہر تھی جب شہر کے مشہور تاجر شیخ صاحب کا جنازہ لایا گیا۔ شیخ صاحب سخاوت میں صرف مشہور ہی نہ تھے واقعی دریادل تھے۔ ان کا جنازہ قبرستان پہنچا تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ساتھ آنے والوں نے تھوڑی دیر انتظار تو کیا، ادھر اُدھر کی ہانکی بھی لیکن جب اس کی صورت کہیں نظر نہ آئی تو شیخ صاحب کو خود ہی قبر میں اتارنے لگ گئے۔ حاضرین کو آج بولنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ہر کوئی اپنی اپنی بھاشا میں پکارنے لگا۔ لیکن میت اٹھانے والوں کو آج یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی مہم سر کرنے والے ہوں۔ میت انہوں نے لحد میں اتار تو لی لیکن یوں جیسے گٹھڑی اتارتے ہیں۔ گورکنوں کو بھی بلایا گیا لیکن بات نہ بنی۔ دراصل اس بھلے مانس نے سب کو اس ذمہ داری سے آزاد کر دیا تھا۔ پھر وہ چھلاوے کی طرح خود کہیں سے نمودار ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے مرحلے طے کر گیا۔

جب شیخ صاحب ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئے اور لوگ سر جھکائے، رخصت ہونا شروع ہوئے تو پہلی بار ایک دو بزرگوں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

''میاں، آج دیر ہوگئی کیا۔ یا اطلاع نہیں مل سکی''اس نے سر جھکائے رکھا اور چلتا گیا۔

''جی اطلاع تو مل گئی تھی اور میں چل بھی پڑا تھا لیکن راستے میں بارش نے آن لیا، سو دیر ہوگئی۔''وہ بزرگ غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے، کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ دیر تک ساتھ چلتے رہے، پھر بولے۔

''یار تم ہر جنازے میں یوں بھاگم بھاگ پہنچ جاتے ہو، آخر راز کیا ہے۔''جواب میں وہ مسکرایا اور بولا۔

''راز تو کوئی نہیں جی، بس ایک خواہش ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے والوں کو ڈھنگ سے رخصت کیا جائے اور جب میں مروں، تو مجھے بوری کی طرح قبر میں نہ پھینکا جائے بلکہ اسی طرح آرام سے اتارا جائے۔''

بات ختم ہوگئی اور وہ اپنے اپنے راستے کو مڑ گئے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد عجیب حادثہ ہوا کہ دو نوجوان سکوٹر پر کہیں جا رہے تھے کہ ایک ٹرک کی لپیٹ میں ایسے آئے کہ دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ حسب معمول مساجد کے لاؤڈ سپیکر سے جب اعلان ہوا تو جس نے بھی سنا سناٹے میں آ گیا، مرنا تو ہوتا ہی ہے لیکن نوجوانی کی موت ہر کسی کو رلا جاتی ہے۔ اعلان میں بتایا تو گیا تھا کہ کون سے نوجوان تھے، کہاں کام کرتے تھے کہاں رہتے تھے لیکن کسی کو یاد نہ رہا۔ ہاں جنازے کا وقت یاد رہ گیا۔ یوں بھی جب کوئی رخصت ہوتا ہے عام طور پر افسوس کے فوراً بعد یہی پوچھا جاتا ہے، جنازہ کس وقت اور کہاں ہوگا؟

وقت قریب آ گیا تو خاصے لوگ قبرستان میں اکٹھے ہو گئے ابھی نماز شروع ہی ہوئی تھی کہ کالے بادل جو صبح سے ڈرا رہے تھے، یک دم برسنا شروع ہو گئے۔ لوگوں نے جنازہ تو پڑھ لیا لیکن پھر بھاگ کے درختوں کے نیچے پناہ لی۔ دو چار کو اچانک خیال آیا کہ میتیں تو کھلے آسمان تلے رکھی ہیں۔ انہوں نے دوڑ کے چار پائیاں اٹھانے کی کوشش کی لیکن ساتھ ہی بارش بند ہوگئی۔ لوگ کچھ تو اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنے گھروں کو جا چکے تھے، بقیہ نے میتوں کا چہرہ بھی دیکھنے کا تکلف نہ کیا اور چار پائیاں اٹھا تیار قبروں کی طرف ہو لیے۔ چار پائیاں انہوں نے کناروں پر رکھ دیں، کہ ایک بزرگ کی اچانک نظر پڑھ گئی۔

''ارے کیا کرتے ہو بھلے مانسو، ان کا رخ تو درست کرلو۔'' اب دوسروں کی بھی توجہ ادھر ہٹی تو سب نے بولنا شروع کر دیا۔ واہ، واہ بارش کے ڈر سے رخ کا خیال ہی نہ کر سکے اور جنازہ الٹے رخ اٹھا کر لے آئے ہیں۔ لیکن قبروں کے کنارے کھڑے لوگ اس سوچ میں گم تھے کہ قبروں میں جو پانی چلا گیا ہے، سے کیسے نکالا جائے۔ سب نے اِدھر اُدھر دیکھا، گورکن اسی طرف آ رہے تھے، سب نے سکھ کا سانس لیا۔ گورکن اندر اترے، پہلے ہاتھوں کے پیالوں سے پانی باہر نکالا، پھر اپنی پرانی چادروں سے کام لیا اور آخر ریت بچھا کے نمی جذب کی۔ اس کے بعد وہ اچھل کے باہر نکل آئے۔

اصل مرحلہ تو اب طے کرنا تھا، میتوں کو باری باری قبروں میں کون اتارے۔ پہلے تو ہر کسی نے ہجوم کو ٹٹولا، پھر قبرستان میں نظریں دوڑائیں، جب مایوس ہو گئے تو دو چار نے آج یہ کام بھی کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہ اللہ کا نام لے کے اندر کود گئے۔

''ہاں بھئی، پہلے اس میت کا رخ سیدھا کیجئے اور پھر ہمیں پکڑا دیجے۔ لیکن خیال رہے پاؤں نہ پھسلنے پائے پائیں۔'' میت اٹھانے والے چار پائی کے گرد کھڑے ہو گئے لیکن ان کی تعداد زیادہ

تھی۔میت انہوں نے اٹھا لی لیکن اب یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ درمیان سے چارپائی کیسے نکالی جائے۔ایک دو حضرات نے اپنا رخ بدلا تو وہ بمشکل اپنا توازن برقرار رکھ سکے۔بہرحال چارپائی نکل گئی ۔اب وہ میت نیچے پکڑنے لگے تو ایک دو حضرات کا پاؤں پھسل گیا اور میت ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کے نیچے کھڑے لوگوں پر جا گری۔ان بچاروں نے سنبھالنے کی کوشش تو کی لیکن اسی افراتفری میں میت یوں قبر کے فرش پر جا پڑی جیسے کوئی بوری گرتی ہے۔ادھر کفن ہٹ گیا اور میت کا چہرہ ننگا ہو گیا۔سب کی نظریں اس چہرے پر پڑیں تو سارے ہی سکتے میں آ گئے۔

ارے یہ تو اسی نوجون کی میت تھی۔

(سہ ماہی آفاق،راول پنڈی،ستمبر۲۰۰۲)
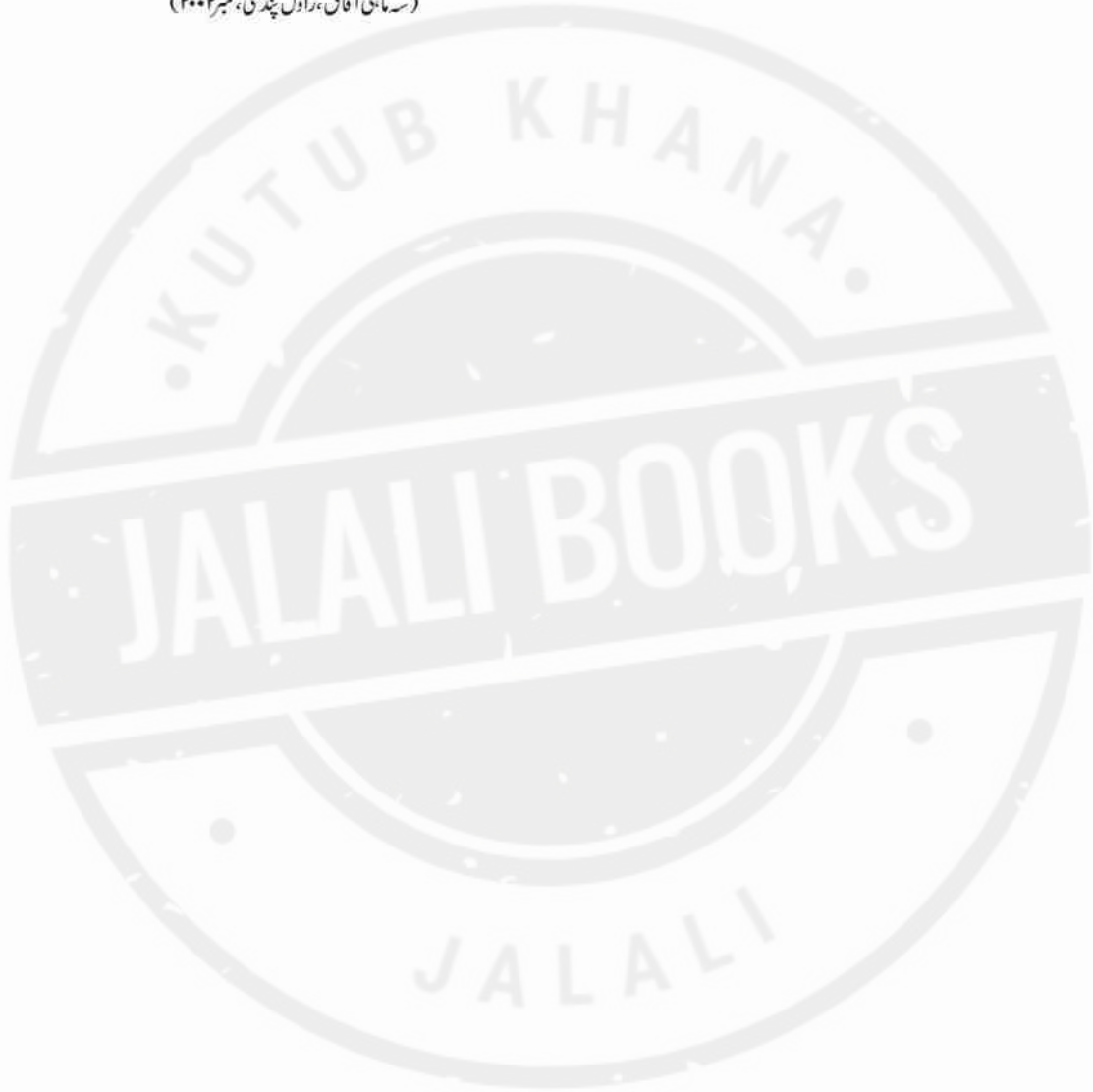
نام	عبدالقیوم
ولدیت	عبدالرحیم
پیدائش	۱۹۳۶ء
جائے پیدائش	شاہ پور
تعلیم	بی اے (ایل ایل بی)

عبدالقیوم کا تعلق علاقہ چھچھ کیمبل پور (اٹک) کے ایک گاؤں شاہ پور سے ہے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن یہیں گزرا بعد ازاں کراچی تشریف لے گئے۔ تعلیمی میدان میں انہوں نے بی اے ایل ایل بی کی ڈگری ۱۹۶۶ء میں حاصل کی۔ کراچی قیام کے دوران فلپس کمپنی میں منیجمنٹ کے شعبہ میں رہے بعد ازاں زونل منیجر کی پوسٹ پر رہے۔ کچھ عرصہ فلپس کمپنی کے ہیڈ آفس ہالنڈ میں بھی کام کیا۔ مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد واپس اٹک تشریف لے آئے۔

ان کے افسانے و مضامین ملک کے معتبر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ''فنون'' کے بیشتر پرچوں میں ان کے سیر حاصل تبصرے شائع ہوتے رہے جو ان کی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت ہیں۔ افسانہ و مضامین کے ساتھ انہوں نے انشائیہ اور مزاح نگاری پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔

ان کے دو کتابیں'' خیالی پلاؤ'' اور'' پیچ و تاب'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں غیر ملکی افسانوں کے تراجم کی کتاب کے علاوہ اپنے افسانوں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا اور دیگر کئی معتبر اہل قلم کے ساتھ خط و کتابت رہی۔

مطبوعات:

۱۔ خیالی پلاؤ　　۲۔ پیچ و تاب

جو ہم پہ گزرتی ہے

عبدالقیوم

وہ دو سال سے جیل میں تھا،

اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ وہ بالکل بے قصور جیل گیا جب کہ اس کے شوہر کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ قصوروار تھا۔ جو منہ میں آتا بکے جاتا بس۔ایک دن یوں ہوا کہ کچھ لوگ اسے پکڑ کر لے گئے۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ اسے قید میں ڈال دیا گیا ہے۔

''وہ کہتا کیا ہے؟'' یہ سوال میں ہر اس شخص سے کرتا جو اسے جانتا تھا۔لیکن افسوس کہ کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا کیوں کہ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔دو سال سے اس پر کیا گزر رہی تھی،کوئی نہیں جانتا تھا۔اس کی بیوی بڑوں کے پاس درخواستیں لے لے کر گئی۔معصوم بچوں کے واسطے دیئے۔خاوند کی طرف سے آئندہ اچھے چال چلن کا یقین دلایا،لیکن اس کی کہیں نہیں سنی گئی۔

آمدنی کا وسیلہ کوئی تھا نہیں اور جمع پونجی ختم ہو رہی تھی۔نہ اپنا ایسا کوئی ہمدرد تھا جو اس کے گھر کے لیے دال روٹی کا انتظام کرتا۔وہ مجبوراً نوکری کرنے لگی تا کہ بچوں کا پیٹ پال سکے۔

اس نے جس گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت اختیار کی،اس کا مالک ساٹھ باسٹھ سالہ بوڑھا شخص تھا لیکن لباس اور طور طریقوں سے بوڑھا لگتا نہیں تھا۔اس کے متعلق اکثر کی رائے تھی کہ وہ خود شریف ہے۔وہ ایسی عورتوں اور بے سہارا لڑکیوں کو کام پر لگاتا ہے جو زمانے کی ستائی ہوئی یا پیٹ پالنے کے لیے مزدوری کو ہی واحد ذریعہ سمجھتی ہیں۔وہ ہر ماہ تنخواہ والے دن تمام عورتوں کو چائے پر بلاتا اور ان کی خیر و عافیت دریافت کرتا۔وہ فرداً فرداً پوچھتا کہ کسی کو کوئی شکایت تو نہیں،اس کی اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ بہ ظاہر ساری عورتیں تسلی سے کام کرتی تھیں۔شاید مجبوراً اس کے ماتحت وہ سپر وائزر مرد بھی اس کی پالیسی کے خلاف کے جا سکتے تھے ورنہ۔۔ان میں سے مجید ان مجبور عورتوں اور لڑکیوں میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔

''کاش ہمارا مالک ان عورتوں کا اتنا خیال نہ رکھتا۔''نعیم نہایت افسوس سے اظہار خیال

کرتا۔ ریحانہ، سعیدہ اور حمیدہ کتنی خوبصورت ہیں۔ مالک اپنے نفع سے غرض رکھتا اور ہمیں پورے اختیارات حاصل ہوتے تو۔۔۔۔'' مجید دل کی بات زبان پر لاتا۔

''وہ عورتوں کی بھلائی میں دلچسپی ضرور لے لیکن اسے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ٹکے ٹکے کی عورتوں کو اتنا بڑھاوا دے کہ وہ ہم جیسے انچارج کو گھسیٹنے کی جرأت کر سکیں۔'' نعیم غصے برے لہجے میں کہتا۔ ''یار کسی دن موقعہ پا کر میں تو۔۔۔۔'' مجید غصے سے پھنکارتے ہوئے کہتا۔ ''تم ایسا کر سکتے ہو۔ اونچی سفارش سے جو آئے ہو۔'' نعیم مسکرا کر کہتا۔ ''اگر ہم دونوں ہمت سے کام لیں تو۔۔'' مجید دھیرے سے بولتا۔ ''نہیں مجھے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑھیں گے۔'' نعیم اندر کے ڈر کو سطح پر لاتا۔ ''میں تمارے ساتھ ہوں فکر کیوں کرتے ہو۔'' مجید اسے تسلی دیتا۔ ''اس لیے کہ میں مالک کے عتاب سے نہیں بچ سکوں گا۔'' نعیم دل کی بات کہتا۔ ''اگر ایسا ہوا تو تم سمجھ لو مالک میرے انتقام سے۔۔'' مجید حسب عادت غصے سے پھنکار کر کہتا۔ ''وہ بھلا کس طرح؟'' متجسس انداز میں نعیم پوچھتا۔

''چھاپا پڑوا کر۔۔۔۔ اس کے خلاف گواہ بن کر۔۔۔۔ اور وہ تو اچھی طرح میرے پچھلوں کو جانتا ہے کہ کتنے اثر و رسوخ والے ہیں۔۔ وہ اتنا احمق نہیں کہ۔۔۔۔'' مجید مسکرا کر چپ ہو جاتا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری وجہ سے میں بھی گرفت میں نہیں آؤں گا۔'' نعیم مسکرا کر پوچھتا۔ ''بلا شبہ میں تماری حفاظت کا ضامن ہوں۔۔'' مجید اسے تسلی دیتا۔ ''تو ملاؤ ہاتھ۔۔۔۔ جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ تمہارا ساتھ دوں گا۔۔'' اور دونوں ہاتھ ملاتے۔ یوں مجید نے نعیم کو بھی اپنے ساتھ ملا کر کمزور اور مجبور عورتوں کے خلاف اپنے گھناؤنے کھیل کا آغاز کر دیا۔

مسز ریاض اس لحاظ سے ضرور خوش قسمت تھی کہ اس کا پڑوس اچھا تھا۔ اس کے دونوں بچے اسکول سے آ کر پڑوسن کے ہاں کھانا کھا کر کھیلتے رہتے، جس کا معاوضہ وہ ادا کر دیا کرتی۔ شام کو اس کی واپسی پر بچے اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ جاتے اور وہ ان کے لیے بازار سے خرید کر لائی ہوئی اشیاء ٹیبل پر نکال کر رکھ دیتی جس میں سستے اور عام فروٹ کے علاوہ کبھی سبزی اور کبھی گوشت ہوتا۔ وہ جلدی جلدی کھانا تیار کرتی۔ بچوں کو کھلا کر ذرا اوپر پڑھانے کے بعد سونے کے کمرے میں ان کو بھیج کر خود اپنی کمر سیدھی کرنے لیٹ جاتی۔ اسے عموماً دیر تک نیند نہ آتی۔ وہ سوچتی نجانے کب اس کا شوہر رہا ہو کر آئے گا اور وہ اس زلیل مزدوری کے عذاب سے چھٹکارا پائے گی۔ اس سوچ میں رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ

جاتی۔

زندگی ایک ڈگر پر چل رہی تھی کہ ایک دن کسی نے یہ انکشاف کر کے تمام ملازم عورتوں کو دہلا دیا کہ سعیدہ کے ساتھ مجید نے بدتمیزی اور نازیبا سلوک کیا ہے۔ دوسرے دن سعیدہ کام پر نہیں آئی تو وہ آپس میں کھسر پھسر کے انداز میں لائحہ عمل سوچتی رہیں۔۔ بالآخر انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ سعیدہ کو لے کر مالک سے مجید کے خلاف بھرپور احتجاج کریں گی۔ یہ مطالبہ بھی کریں گی کہ مجید کو اگر نوکری سے نہ نکالے تو کم سے کم اسے معطل تو ضرور کر دے تاکہ آئندہ وہ شرارت سے باز رہے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا!

مالک نے سعیدہ کی شکایت سن کر اسے مجید سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ جب دوسری عورتوں نے بھی دھیمے لہجے میں احتجاج کیا تو وہ بولا ''مجید تجربہ کار اور منجھا ہوا سپروائزر ہے۔ سعیدہ کو اگر یہاں کام کرنا پسند نہیں اور ماحول اس کی خواہش کے مطابق نہیں تو کہیں اور کام ڈھونڈ لے۔'' مالک کے اس توہین آمیز جواب پر وہ ساری پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔

وہ کتنا بڑا منافق اور جھوٹا ہے، ان کی سمجھ میں اب آیا۔ اس کی ہمدردی کے الفاظ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا تھے جو وقتی طور پر سکون تو دے سکتے ہیں لیکن ان کے دکھوں کا مداوا نہیں بن سکتے!

اور پھر یوں ہوا کہ چند ہفتوں ہی میں تقریباً ساری جواں عورتوں کو دونوں سپروائزروں سے شکایت پیدا ہو گئی۔ جب انہوں نے یک زبان ہو کر مطالبہ کیا کہ ان کا انچارج کسی ہنر مند اور تجربہ کار عورت کو بنایا جائے تو مالک شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر وہ ان کا مطالبہ نہیں مانتا تو ان کے نوکری چھوڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ یکمشت اتنی ڈھیر ساری ہنر مند عورتوں کا نعم البدل فوراً تلاش کرنا مشکل امر تھا۔ اگر مجید پر دباؤ ڈالتا ہے تو ساری خاص مراعات جو وہ اس کے بارسوخ سرکاری عہدوں پر متمکن رشتہ داروں کی مٹھی گرم کر کے با آسانی حاصل کر رہا تھا۔ ان کے چھن جانے کا خطرہ تھا کہ کون سا نقصان وہ با آسانی برداشت کر سکتا ہے۔ اسی سوچ کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ آدھے سے زیادہ جوان لڑکیوں اور عورتوں نے استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کی خواہش کے باوجود انہوں نے کام پر واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔

چند روز کی بیروزگاری سے ہی مسز ریاض کو احساس ہو گیا کہ جوش میں آ کر دوسری جذباتی عورتوں کے ساتھ مل کر اس نے غلطی کی تھی۔ خاوند کی رہائی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ بچوں کو پالنے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ دوبارہ نوکری تلاش کرے۔

اس نے متعدد جگہ درخواستیں دیں، خود حاضر ہوئی لیکن کہیں بھی اسے کام نہیں ملا۔ وہ جس گارمنٹ فیکٹری میں گئی سابقہ ملازمت کا حوالہ دے کر اسے یہی جواب ملا کہ ہم یونین بنانے والی خواتین کو ملازم رکھ کر ماحول خراب نہیں کر سکتے۔ تب اسے پتہ چلا کہ سابقہ مالک کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں کہ اس کے متعلق رپورٹس پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ مجبوراً اس نے چھوڑی ہوئی نوکری دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ اس کے گھر سے نزدیک ترین جگہ وہی تھی۔

مالک نے جب اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا دیا۔ اس کا خیر مقدم یوں کیا جیسے ایک فاتح مفتوح کا کرتا ہے۔ اس نے انجانے پن سے کہا'' آپ شاید بقیہ واجبات وصول کرنے کے سلسلہ میں آئی ہیں۔''

دل میں خوف اور نفرت کے جذبات کی ملی جلی آندھی سی چلی لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی

''وہ میں لے چکی ہوں۔۔۔۔ دراصل میں دوبارہ یہاں کام کرنا چاہتی ہوں۔'' مالک نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اس کے زخموں پر نمک چھڑکا'' جذبات کی رو میں بہہ کر کیے جانے والے فیصلے دیرپا نہیں ہوتے مسز ریاض۔'''' میں جانتی ہوں'' وہ دھیمے لہجے سے بولی

''لیکن میں عزت و آبرو کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔'' مالک نے سرگوشی میں اس کے قریب آ کر کہا'' تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آج سے تم کام شروع کر سکتی ہو۔''

مالک نے چپڑاسی کے ذریعے نعیم کو بلا کر اسے اس کے حوالے کر دیا۔ ہال کا جائزہ لینے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کی تقریباً ساری ساتھی عورتیں نوکری چھوڑ کر جا چکی ہیں، صرف شکل وصورت سے گئی گزری ادھیڑ عمر، مدقوق عورتیں کام میں مصروف تھیں۔ اس نے چند ہی دنوں میں اندازہ کر لیا کہ ان سب سے زیادہ جوان اور قبول صورت ہونے کی وجہ سے اب وہی توجہ کی مرکز ہے۔ کیوں کہ اکثر کبھی نعیم اور کبھی مجید اس کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے اور اسے سلائی کرتے غور سے دیکھتے اور پھر اس سے زبردستی بات جیت کرنے لگتے۔ وہ جواب دینے سے گریز کرتی تو وہ مسکرا کر یوں چلے جاتے جیسے اس کی بے رخی کا برا نہ مانا ہو۔ وہ غیر مردوں سے بے مقصد بات جیت کو معیوب سمجھتی تھی، لیکن حالات نے اسے ایسے راستے پر ڈال دیا تھا کہ وہ مدافعت زیادہ دیر تک نہ کر پاتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ جواب دینے پر مجبور

ہوجاتی تو بغیر دیکھے، جھکی جھکی نظروں سے مہذب انداز میں مختصراً گفتگو کر کے دامن بچانے کی کوشش کرتی تا کہ مخاطب ناراض نہ ہو۔ اب عورتوں کا رویہ اس کے دل کو کچوکے لگا تا جب وہ انہیں کھسر پھسر کرتا پاتی، وہ یوں اس کی طرف اشارے کنائے کرتیں جیسے وہ بازار میں بنی ٹھنی سولہ سنگار کیے کھڑی ہو اور ہوس کار نظریں اس کے ایک ایک عضو کو تاڑ رہی ہوں۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ وہ سوچتی کاش وہ خوبصورت نہ ہوتی۔ اس کے منہ پر جھریوں کا جال بچھا ہوتا۔ وہ بے چین ہو کر کبھی کبھی دل میں اپنے شوہر کو کوسنے لگتی تھی جس نے پارٹی بازی میں غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کر کے اپنے آپ کو قید کروالیا تھا۔ وہ اس کی رہائی کی بہت کوششیں کر چکی تھی لیکن ناکام رہی۔ اب جب کہ وہ ہوس کاروں کی نظروں میں آ گئی تھی تو اسے کسی طاقتور ہمدرد کی ضرورت تھی جو اسے تحفظ دے سکے۔ لامحالہ اس کی نظر مالک پر ہی گئی۔ ایک دن دل بڑا کر کے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

''دیکھئے مسز ریاض! آپ پہلے استعفیٰ دے کر چلی گئیں اور جب دوبارہ آئیں تو بھی میں نے آپ کو ملازم رکھ لیا۔ حالانکہ ہمارا اصول ہے کہ جو ایک بار ملازمت چھوڑ کر چلا جاتا ہے اسے کسی صورت میں دوبارہ نوکر نہیں رکھتے۔''۔۔۔۔ مالک نے اس کی شکایت کے جواب میں احسان جتایا۔

''لیکن آپ تو کہا کرتے تھے کہ کسی کو کوئی شکایت ہو تو میرے پاس۔۔۔۔'' مالک نے بات کاٹ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا ''بلاشبہ میں نے یہ کہا تھا اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ میں نوکروں کا آقا ہوں!''

اب مسز ریاض کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی، جس سے قائل کر سکتی جب کہ مالک کو اپنے وعدے کا پاس تھا اور نہ عورتوں کی عزت کا خیال۔ جب وہ شش و پنج میں چند لمحے کھڑی رہی تو مالک مسکرا کر اس کے قریب آیا اور آہستہ سے بولا:

''کبھی کبھار ایسے حالات سے بھی سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے جس کو دل نہیں چاہتا!'' اس نے مالک کو گھور کر دیکھا تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی:

''کاش آپ ملازم عورتوں کے سر پر دوپٹہ سلامت رہنے کی واقعی ضمانت دیتے۔'' جب وہ اپنی ساتھی عورتوں کے درمیان پہنچی تو ساری اسے ایسی مشکوک نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے وہ کوئی جرم کر کے کمرے سے نکلی ہو۔

دھیرے دھیرے ان کی آنکھوں میں محبت جھلکنے لگی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب اس کی دبیل ہوں اور اس کے اثر ورسوخ سے متاثر ہو گئی ہوں۔ کیوں کہ وہ کافی دیر تک مالک کے کمرے میں اس کے ساتھ رہی تھی جب کہ عام تاثر یہ تھا کہ مالک کسی ملازم عورت کو چند لمحوں سے زیادہ وقت تک نہیں دیتا تھا۔ البتہ جسے پسند کرتا تھا اسے تادیر باتوں میں لگائے رکھتا تھا۔

وہ کافی دنوں سے شوہر کی رہائی کے سلسلے میں سست پڑ چکی تھی لہذا اس نے فیصلہ کیا وہ نوکری چھوڑ کر شوہر کی رہائی کے لیے کوششیں دو چند کر دے گی۔ ویسے بھی حالات کے ہاتھوں وہ تنگ آ چکی تھی اور اس نوکری سے چھٹکارہ چاہتی تھی۔

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے پھر شدومد سے کوششیں شروع کر دیں۔ مختلف اثر ورسوخ رکھنے والوں کے پاس گئی اپنی بے چارگی کو کاغذ پر بکھیر کر دردمندانہ انداز میں درخواستیں دیں۔ لیکن اس کی ہر کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے باوجود اسے امید تھی کہ اس کے شوہر کے کیس کا جلد فیصلہ ہونے والا ہے اور ممکن ہے کہ دوبارہ رہا ہو جائے۔ کیوں کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا البتہ زبان کے غلط استعمال پر مخبروں کی سازش سے جھوٹے مقدمے میں دھر لیا گیا تھا۔ وہ رہا ہونے کی بجائے مزید تین سال کی سزا پا کر جیل بھیج دیا گیا تو اس کی امید کا ٹمٹماتا چراغ بجھ کر رہ گیا۔ وہ بکھر کر رہ گئی۔ مستقبل کی فکر نے اس کے ہوش وحواس شل کر دیئے۔ وہ بے چارگی کا چلتا پھرتا بت بن گئی اور کافی دنوں تک گھر میں چپ چاپ اپنے آپ کو قید کر لیا لیکن کب تک؟

ایک صبح وہ بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد پھر نوکری کی تلاش میں چل پڑی۔ اس کو کہاں جانا تھا اس کا فیصلہ اس کا ذہن نہیں کر پا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ بس سے اتری تو اس کو دھچکا سا لگا۔ غیر ارادی طور پر تیسری بار نوکری حاصل کرنے کے لیے پرانے مالک کے بنگلے کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا پایا تو وہ سہم گئی۔ یوں تو اس نے متعدد بار سوچا تھا کہ کسی نئی جگہ نوکری حاصل کر لے لیکن مالک غیر ہمدردانہ رویئے کے پیشِ نظر اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اسے خوش آمدید کہے گا۔ لہذا اس نے سوچ بچار کے بعد کافی دن پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سیدھی مالک کے پاس جانے کی بجائے اس کی فیملی کی کسی بارسوخ اور رحم دل خاتون کی وساطت سے اپنے تحفظ کی ضمانت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔

گیٹ بند تھا۔ جب اس نے نظریں اٹھا کر ملتجی انداز میں گیٹ پر کھڑے ادھیڑ عمر پٹھان چوکیدار کو

دیکھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر اپنی گھنی موچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ جب وہ بدستور نظریں جھکائے کھڑی رہی تو اس نے کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ کاش یہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ دل میں اچانک عجیب سی آرزو نے جنم لیا لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔

پٹھان چوکیدار کی ہوس ناک نظریں اس کے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ شرم کے مارے اس نے اپنا سر اور جھکا لیا اور اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر گئے۔

چوکیدار بجھ جانے کے انداز میں بولنے لگا۔ ''مس جی! ہمارا سیٹھ بڑا من موجی اور حمدل بادشاہ ہے۔ آج کل ادھر اکیلا رہتا ہے۔ کیوں کہ اس کا سارا گھر والا سیر کے لیے سوات اور کاغان کو گیا ہوا ہے۔ آؤ۔ آؤ۔ وہ تمہارے کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ تم کو اس سے ''خاس کام'' ہوگا۔ اندر چلے جاؤ۔ ڈرنے کا کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے آنکھوں میں اُمڈ آئے آنسوؤں کو روک کر غضبناک نظروں سے چوکیدار کو دیکھا تو وہ قدرے سہم گیا۔ پھر چند لمحوں بعد موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ہنسا اور گیٹ کھول دیا۔

وہ نفرت سے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو گھورتے ہوئے واپس مڑی اور بس اسٹاپ کی طرف چل دی!

(ماہنامہ، ماہِ نو، جلد ۵۶، شمارہ۔۱، جنوری ۲۰۰۳ء)

نام	محمد انور ملک
قلمی نام	محمد انور جلال
ولدیت	عطا محمد
پیدائش	۱۵ اگست ۱۹۴۲ء
جائے پیدائش	کیمبل پور (اٹک)
تعلیم	ایم اے (اردو)

پروفیسر محمد انور جلال مقامی طور پر اٹک شہر کے رہنے والے ایک اعوان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا آبائی گھر شہر کی مرکزی آبادی کے بلاک ایف میں واقع تھا۔ ان کے والد عطا محمد ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر تعینات رہے۔ پروفیسر محمد انور جلال کا بچپن اور لڑکپن کیمبل (اٹک) شہر میں ہی گزرا۔ انہوں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور (حال) گورنمنٹ پائلٹ سکینڈری اسکول (اٹک) سے ۱۹۵۹ء میں کی اس کے بعد گورنمنٹ کالج کیمبل پور (حال) گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج (اٹک) میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۱ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا ۱۹۶۳ء میں اسی کالج سے بی اے کیا۔ بی اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے دسمبر ۱۹۶۵ء کو اردو میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

ماسٹر کرنے کے دو ماہ بعد فروری ۱۹۶۶ء میں انہوں نے گورنمنٹ سرور شہید کالج گوجر خان سے بہ طور اردو لیکچرر ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۹۶۸ء میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) میں تشریف لے آئے یہاں آ کر انہوں نے تعلیمی خدمات انجام دینے کے ساتھ کالج کی بزمِ ادب اور کالج میگزین کی زمہ داری بھی سنبھال لی۔ انہوں نے بہ طور نگران کالج میگزین ''مشعل'' بیس سال سے ذاہد خدمات انجام دیں جو ایک ریکارڈ ہے۔ ۱۹۸۶ میں اسسٹنٹ پروفیسر بنے ۱۹۹۶ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کا درجہ ملا ۲۰۰۰ء کے بعد ان کی طبیت ناساز رہنے

لگی جس کی بناپر ۲۰۰۱ء میں ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی انہوں نے نوکری کو الوداع کہا۔

ادبی سفر کا آغاز انہوں نے کالج کے زمانہ سے ۱۹۶۲ء میں کیا بقول ان کے اس زمانہ میں ان کی ایک کہانی ''امروز'' میں شائع ہوئی اور بعد میں ان کے افسانے کالج میگزین مشعل اور صہبا لکھنوی کے مجلّہ ''افکار'' میں شائع ہوئے۔ انہوں نے کئی انگریزی کہانیوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے اور مضامین بھی لکھے۔ افسانہ نگاری میں وقار بن الٰہی سے زیادہ متاثر رہے جو گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) میں ان کے اردو کے استاد رہے۔

پروفیسر محمد انور جلال ۲۰۱۱ء کو اٹک سے لاہور منتقل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کئی افسانے لکھے مگر ابھی تک کوئی افسانوی مجموعہ اشاعت آشنا نہیں ہوا تاہم انہوں نے افسانوں اور مضامین کو یکجا کر کے ایک کتاب ترتیب دے رکھی ہے جو عنقریب منصۂ شہود پر لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

تشنہ لب

انور جلال

ہوسٹل کی زندگی نئے سرے سے رواں دواں ہو چکی تھی۔ کالج سے آتے ہی لڑکے کامن روم میں جمع ہو جاتے، کچھ کھیلتے، کچھ شور مچاتے اور کچھ آپس میں پیار محبت سے ہاتھا پائی شروع کر دیتے۔ ایسے لمحات میں ، میں ادھر اُدھر ٹل جاتا۔ ان کی اس آزادی میں مخل ہونا مجھے پسند نہ تھا۔ یوں بھی تعلیمی سال نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ان کی پڑھائی کے اوقات مقرر تھے لیکن کسی قسم کی سختی کی ضرورت فی الحال اس لیے نہ تھی کہ لڑکوں کا پہلے ماحول سے مانوس ہونا اور آپس میں گھل مل جانا ضروری تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ماحول سے مانوس ہوتے ہی وہ خود بخود پڑھائی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس عمر میں دوست بنتے دیر ہی کتنی لگتی ہے اور پھر کل ساٹھ ہی تو لڑکے تھے۔ کلاسیں کھیل کا میدان، ڈائننگ ہال، کامن روم ہر جگہ ملاقات دوستی کی اینٹ بن جاتی ہے۔

لڑکوں کو ان کے حقوق و فرائض سے آگاہ کر کے اب میرا کام ان کی عادت اور مزاج کا جائزہ لینا تھا۔ یہ سب میرے مہمانوں کی مانند تھے۔ جی یہی چاہتا تھا انہیں جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون بھی میسر ہو۔۔ لیکن شہزاد طاہر! معلوم ہوتا تھا میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔۔۔ وہ کبھی خوش باش ، ہنستا باتیں کرتا نظر نہیں آیا۔

آج کالج کھلے اور ہوسٹل میں داخلہ مکمل ہوئے دو ہفتے ہو گئے تھے لیکن ایک چپ! ایک ہوسٹل کے جوان ہنگامے اس پر ذرا بھی تو اثر نہ ڈال سکے تھے۔ لمبا چوڑا قد، چوڑا سینہ ہونٹ خشک اور آنکھیں۔۔۔ اتنے صحت مند جسم پر اتنی پژمردہ آنکھیں، میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ شیو اکثر بڑھی ہوئی اور لباس قیمتی ہونے کے باوجود بے ترتیب! ایک دن میں نے راہ چلتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "معلوم ہوتا ہے ہوسٹل میں آپ کا ابھی تک جی نہیں لگا۔ آپ کوئی کھیل نہیں کھیلتے؟ کوئی دوست نہیں بنایا اور اپنے متعلق آپ کی لاپروائی۔۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔۔۔۔"

''سر میری عادتیں تو واقعی بے ترتیب ہیں لیکن آج تک مجھے کسی نے ٹوکا نہیں۔۔''

''کیا گھر والوں نے بھی نہیں؟''

''میری گھر کی دیواریں بولنا نہیں جانتیں۔۔۔۔سر ! میری کلاس ہے، میں کوشش کروں گا کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے''۔

اس ملاقات کے بعد اس کے بارے میں میری خلش کچھ اور بڑھ گئی۔ اگر چہ اس نے اپنے آپ کو سنوارنے کی کافی کوشش کی۔ مجھے دیکھ کر اس کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور دوڑ جاتی لیکن آنکھیں اس مسکراہٹ سے قطعی بے نیاز! لباس سلیقے کا ہوتا تو کبھی کف بٹن سے محروم، کبھی گریبان بغیر بٹن کے!

میں خاموشی سے اس کی عادات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب دیکھتا کسی نہ کسی نوکر کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا ہوتا ہے۔ مالی پودوں میں کام کر رہا ہے اور شہزاد اس کے قریب اکڑوں بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔

شام کو سارے لڑکے مختلف کھیلوں میں مشغول ہو جاتے اور وہ گیٹ پر چوکیدار کے پاس آ بیٹھتا۔ رات کا کھانا بجائے ڈائننگ ہال کے کچن میں کھاتا۔ باورچی اپنی بھاری گھمبیر آواز میں بولتا رہتا اور وہ لکڑی کی چوکی پر بیٹھا آہستہ آہستہ نوالے چبا تا رہتا۔۔۔۔اس نے اپنی بہت سی قمیصیں نوکروں میں بانٹ دی تھیں۔ مجھے اس کی نوکروں سے بے تکلفی پسند نہ تھی۔ اس سے نوکروں کے بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی لڑکے بھی نوکروں سے ناجائز فائدے اٹھانے لگتے ہیں۔ لیکن اس کی طرف سے کبھی شکایت کا موقع ملتا تو میں اسے ٹوکتا بھی، وہ سارے نوکروں کے لیے عزت کا نشان بن چکا تھا۔ جہاں اسے دیکھتے احتراماً سر جھکا دیتے تھے اور شہزاد بھی مجھے مسکراتا، ہنستا اسی وقت نظر آتا۔ جب وہ کچن میں آ بیٹھتا اور سارے نوکر اپنی اپنی بولیاں بولنے لگتے۔۔۔نوکروں سے اس کی اس غیر معمولی محبت کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔

اب میں اس تاک میں رہنے لگا کہ شہزاد میاں نوکروں کے ذریعے ہوسٹل کے قواعد کی خلاف ورزی کب کرتے ہیں۔ باورچی کے پاس بیٹھ کر کھانا ممکن ہے باورچی اسے خصوصی کھانا دیتا ہو، چوکیدار سے اتنی دوستی شاید اس لیے کہ ہوسٹل سے دیر تک باہر رہ سکے۔۔۔دولت مند خاندانوں کے لڑکے اپنے روپے سے اسے اس قسم کی ناجائز مراعات حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ شہزاد کو بھی ہر ماہ تین سو روپے کا چیک آتا تھا شاید وہ بھی اس طریقے سے اپنی دولت خرچ کر کے فائدے اٹھاتا ہو۔ مجھے افسوس سا ہوا۔ میں نے

محسوس کیا کہ اس کے چہرے اور میرے اندازہ کردہ ان حالات میں مناسبت نہیں ہے۔

میں نے شام کو باہر جانا بند کر دیا۔ ہوسٹل ہی کے کاموں میں وقت گزار دیتا، یا لڑکوں سے مل کر مختلف قسم کے کھیل کھیلتا رہتا۔ آٹھ بجے گیٹ بند ہو جاتا۔ سبھی لڑکے کھانا کھانے کے بعد ہنستے کھیلتے اپنے کمروں کو چلے جاتے۔ کہیں آخر میں وہ نمودار ہوتا۔ اکیلا بالکل اکیلا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب سے گزرتا تو ہاتھ اٹھا کے سلام کرتا اور پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

''شہزاد تمہیں ہوسٹل میں کوئی تکلیف تو نہیں۔'' باقی لڑکوں کی طرح میں اس سے بھی سوال کرتا۔

''سر آپ اتنا خیال رکھتے ہیں، اتنی محبت دیتے ہیں۔ شکایت کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس آدمی کے لیے تو یہ جگہ جنت سے کم نہیں جسے اپنے گھر میں بھی محبت نہ ملی ہو''۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وحشت زدہ آنکھیں دور اندھیرے میں جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔۔۔ وہ چلا گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے کی ان کیفیات کو کیا نام دوں گا۔ اتنا میں نے سوچ سمجھ لیا تھا کہ وہ کسی زبردست اذیت کا شکار ہے۔ جس کا تعلق اس کی گھریلو زندگی سے ہے۔۔۔ میں نے سوچا کہ اگر اسے اذیت کے سرد خانے سے نکال کر زندگی کی راحتوں سے ہمکنار کر سکوں تو یہ میری سپرینڈنٹی کا ایک کارنامہ ہوگا۔

اگلے دن ہفتہ تھا۔ بہت سے لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس عرصہ میں شہزاد ایک بار بھی اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ میں نے ایک دو بار اس سے پوچھا لیکن وہ صاف ٹال گیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر کرب کی کچھ ایسی لہریں نمودار ہوئیں کہ بعد کے تین چار گھنٹے وہ اپنے کمرے میں بند رہا۔ اتوار کا گزارنا اس کے لیے کتنا مشکل ہوتا یہ بھی جانتا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنے کمرے کے ساتھ والی بالکنی میں کھڑا رہتا ،سگریٹ سلگتے سلگتے اس کی انگلیوں میں ختم ہونے لگتا۔ اکثر یوں لگتا جیسے وہ پلکیں تک جھپکانا بھول گیا ہے۔

اس ہفتہ تو خاص طور پر میں نے اسے بے چین دیکھا۔ کبھی لان میں ٹہلنے لگتا کبھی لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ میرا خیال تھا اسے بلا کر پوچھوں گا لیکن وہ کہیں باہر چلا گیا۔ پھر مجھے ایک ساتھی پروفیسر کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ رات کو دیر سے واپسی ہوئی۔ چوکیدار گیٹ پر کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اسے کسی کا انتظار ہے۔ میں نے اسے گیٹ بند کرنے کا حکم دیا۔ ''ساب! شہزاد میاں۔۔۔'' ''اچھا آج وہ رات بارہ بجے تک غائب ہے، میں نے سوچا۔ اگر اسے کہیں جانا ہی تھا تو اس نے اجازت کیوں نہ لی۔۔۔ پھر مین ایک بجے تک اس کا منتظر رہا۔ وہ نہیں آیا۔ مجھے پہلی بار اس پر شدید غصہ آیا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے اسے

بلوایا:

'' شہزادرات تم دیر سے آئے۔خیریت تو تھی؟ ہوسٹل کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تم مجھے اچھے نہیں لگتے''۔

''سراس نے نیند سے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔''میں سزا کے لیے حاضر ہوں''

''آخر تم تھے کہاں؟''

''سر! مالی کا ایک ہی بچہ ہے۔سردی سے اسے نمونیا ہو گیا ہے۔رات دس بجے وہ آیا،نہ کوئی دوائی مل رہی تھی نہ ڈاکٹر۔مجھے کسی ڈاکٹر کے گھر کا پتہ بھی نہ تھا۔بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ دو میل کے فاصلے پر ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔انہیں ساتھ لایا۔دو بجے کے قریب بچے کی طبیعت سنبھلی۔اسی وقت ہوسٹل میں آ گیا''۔۔۔۔۔میں نے ایک طویل سانس لی۔

''شہزاد''میں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا''تمہیں اس بچے کا اتنا خیال ہے اور خود اپنی صحت کا نہیں،اگر تمہیں سردی لگ جاتی''۔

''سر! وہ ایک غریب خاندان کا سہارا ہے۔اس کی زندگی سے ایک ماں،ایک باپ کی زندگی وابستہ ہے۔۔اور میں محض اپنی ذات کے لیے! کوئی بھی تو نہیں جو میرے بغیر زندہ نہ رہ سکے۔میرا پورا بچپن ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔۔۔''

میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باورچی اندر داخل ہوا۔

''ساب! اس بار آپ نے نیا میس انچارج نہیں بنایا۔آج پہلی تریخ ہے۔۔۔۔''''شہزاد اس ماہ کے لیے تم میس انچارج ہو''۔

''نہیں سر! مجھے ایسے کام نہیں کرنے آتے۔پھر مجھے کھانے پینے کا شوق نہیں۔سارا مہینہ لڑکے دال اور سبزیاں کھا کر کوسیں گے۔مجھے گوشت،کباب،مرغ کسی شے سے بھی تو رغبت نہیں۔۔''میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔۔

''تو پھر کچن میں کھانا کھانے کا مقصد۔۔۔؟'' ''سر! اس نے ہولے سے کہا'' آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں کچن میں کھانا اس لیے کھاتا ہوں کہ زیادہ گوشت کھا سکوں؟'' ''پھر آخر اس بات کی وجہ۔۔''۔۔۔''سر میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا۔۔۔''اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔۔لیکن میں بھی آج تہیہ

کیے بیٹھا۔۔۔''اچھاتم اپنے کمرے میں چلو، میں ادھر ہی آتا ہوں''۔

میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ دو سیکنڈ تک یوں لگا جیسے اسے میری آمد کا علم نہیں ہوا۔ دونوں گھٹنوں پر اس نے سر ٹیک رکھا تھا۔۔میں ذرا کھانسا۔اس نے سر اٹھایا۔آنکھیں جیسے حلقوں میں ابلتی ہوئیں!اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔۔میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ بٹھایا تو یوں لگا جیسے الیکٹرک شاک لگا ہو۔۔۔''تمہاری طبیعت تو اچھی ہے؟''۔۔۔''مجھے سردی لگ رہی ہے سر۔آپ آرام کیجئے۔میرے لیے آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔آج تک تو کسی کو اس کی ضرورت نہیں پڑی''۔۔۔میں نے لحاف دے کر اسے لٹایا۔

''میں نے اکثر سوچا ہے کہ تم اس خود اذیتی میں کیوں مبتلا ہو؟ تمہیں نوکروں کا اتنا خیال رہتا ہے اور اپنی صحت کے متعلق تم اتنے لاپرواہ رہتے ہو۔۔۔میں سمجھتا ہوں یہ کوئی اچھی بات نہیں۔۔۔''

''سر''اس نے میری بات کاٹ دی۔۔۔اور بے چینی سے جلدی جلدی بولنے لگا''آپ کے پاس ساٹھ لڑکے رہتے ہیں۔کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی لڑکے کے والدین محض ہوسٹل کی رقم بھیج کر مطمئن ہو جائیں یا کسی لڑکے کا باپ پانچ سال کے لیے ملک سے باہر چلا جائے اور اتنا بھی نہ کرے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ ہی لے،کیا بڑے افسروں کے بچوں کا یہی مقدر ہے کہ پیدا ہوتے ہی انہیں آیاؤں کے حوالے کر دیا جائے۔ہوش سنبھالیں تو ہوسٹلوں میں خود بخود پڑھتے پھریں۔۔۔۔سر!مجھے آج بھی اس ننھے بچے کا خیال آتا ہے جو جھولے میں پڑا بلکتا رہتا تھا کیوں کہ اس کے ماں باپ اپنی مصروفیات میں سے اس کے لیے کوئی وقت نہیں نکال پاتے تھے۔آیا اور نوکر ہی سارے فرائض ادا کرتے تھے۔ڈیڈی صبح دفتر چلے جاتے اور ممی اپنی دوستوں سے گپ ہانکنے ساتھ والی کوٹھیوں میں چلی جاتی یا ان کی سی بیگمات کوٹھی میں آ جاتیں،بیچارہ شہزاد طاہر علی خان،دفتر خارجہ کے ایک بڑے افسر کا بیٹا،ماں باپ کے سینے سے لپٹنے کے لیے تڑپتا رہتا''۔

''پھر تین سال کا بچہ!جو ہر شام ڈیڈی کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتا۔ممی کبھی ترس کھا کر کہہ بھی دیتیں کہ آج شہزاد کو بھی کلب لے چلیں تو ڈیڈی خفگی کے لہجے میں کہتے۔کلب میں بچوں کا اخلاق بگڑ جاتا ہے۔اور کار تیزی سے گیٹ سے نکل جاتی،اور بیچارہ بچہ روتا چلاتا رہتا۔کبھی چوکیدار،کبھی مالی کبھی آیا تھا۔کی انگلی پکڑے کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں اکیلا بھٹکتا رہتا اور اپنے ممی اور ڈیڈی کا انتظار کرتا رہتا

لیکن پھر کسی نوکر کے گلے لگے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔

جب ممی ڈیڈی کی صحبت مجھے نہ مل سکی تو ہم عمر ساتھیوں سے جی بہلنے لگا۔ بہن بھائی تو کوئی تھے نہیں جو گھر میں یہ ضرورت پوری ہو جاتی۔ آس پروس کی کوٹھیاں اتنی دور تھیں کہ ان تک میرا پہنچنا مشکل تھا۔۔۔ لے دے کر سرونٹ کواٹروں میں رہنے والے بچے میری تنہائیوں کے ساتھی بنے۔۔۔ لیکن یہ ننھی سی خوشی بھی مختصر ثابت ہوئی کہ ابا حضور کو پتہ چل گیا۔ انہیں میری آوارگی کا فوراً خطرہ پیدا ہو گیا۔ ان کے نزدیک نوکروں کے بچوں کے ساتھ میرا کھیلنا اخلاق تباہ کرنے کے برابر تھا۔ سینکڑوں روپوں سے انہوں نے میرے لیے عجیب عجیب قسم کے کھلونے منگوائے۔ نوکروں کو خاص طور پر تاکید کر دی گئی کہ مجھے گھر کی حدود تک محدود رکھا جائے۔ ہر روز ڈھیروں کھلونے میری ضد پر قربان ہو جاتے۔۔۔ لیکن ابا حضور دولت تو ساری مجھ پر خرچ کر دینے کو تیار تھے۔ ہر روز اتنے ہی کھلونے پھر آ جاتے۔

وہ دن میرے لیے ڈھیروں خوشیاں لایا جب میں نے سکول جانا شروع کیا۔ اب مجھے بے شمار ساتھی مل گئے۔ سکول میرا خوب جی لگتا چنانچہ پڑھائی میں ہمیشہ اچھا رہا۔ لیکن جی چاہتا کہ گھر آؤں تو ممی ڈیڈی مجھ سے سکول کی باتیں پوچھیں، میرے سبق سنیں، میری تعریفیں کریں۔۔۔ ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ جب میں گھر آتا ممی ڈیڈی اگر گھر ہوتے تو اپنے کمرے میں۔ آیا میری ضد پر مجھے ذرا کی ذرا وہاں لے بھی جاتیں تو دونوں فوراً کہتے "اسے کھانا کھلا کر سلا دو۔۔۔" ممی کی محبت صرف کبھی کبھی میرے سر ہاتھ پھیرنے تک محدود تھی۔۔۔ اور ڈیڈی! وہ تو اتنے سخت تھے، اتنے کھردرے تھے کہ امی کو کبھی پیار کرتے دیکھ بھی لیتے تو کہتے "بھئی بچے لاڈ سے بگڑ جاتے ہیں۔"

اگر میں کبھی ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر پیار کی تمنا کرتا تو انہیں اپنی پینٹ کی کریز ٹوٹنے کا اندیشہ پرشان کرنے لگتا۔ ابا جان میرے لیے قیمتی سے قیمتی کپڑے ضرور منگواتے ہر ہر قدم پر مجھے کپڑے ترتیب سے، سلیقے سے پہنانے کی تلقین کرتے۔ میری پینٹ یا نکر کی کریز ٹوٹ جاتی تو خوب ڈانٹتے۔۔۔ لیکن مجھے بھی جانے کیا ضد تھی۔ جونہی آیا بنا سنوار کر فارغ ہوتی زمین پر لوٹیں مارنے لگتا۔ قمیضوں کے بٹن توڑ دیتا۔

جوں جوں میں ہوش سنبھالتا گیا چڑ چڑا ہوتا گیا۔ جس طرح میرے ممی ڈیڈی نے اپنی ماڈرن زندگی میں انتہائی مصروف ہونے کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا، اس کا نتیجہ یہی تھا۔ پھر انہی دنوں آناً فاناً ممی دماغ

کی رگ پھٹ جانے سے انتقال کر گئیں۔

ابا حضور کسی بڑے آفیسر کے ہاں پارٹی پر گئے ہوئے تھے۔آئے تو ممی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ان کی آخری سانسیں مجھے محبت کی انمنٹ یادیں دے گئے۔انہوں نے پہلی اور آخری بار مجھے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔۔۔آج بھی سوچتا ہوں کہ کاش زندگی وہیں ختم ہو جاتی''۔

وہ خاموش ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔جیسے بڑی دیر سے کوئی کٹھن چڑھائی چڑھتا آیا ہو۔میں اس دوران اس کی کتابیں دیکھ رہا تھا۔۔۔میں نے اس کی توجہ ہٹانے کو کہا ''تمہیں اردو ادب سے بہت زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے''۔

''سر! یہی تو وہ کتابیں ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے ساری محرومیوں کا احساس کہیں گم ہو جاتا ہے۔عجیب سی بات لگتی ہے کہ ابا حضور مجھے انگریزی میں کمال حاصل کرتا دیکھنا چاہتے ہیں اور میں اردو اور صرف اردو پڑھ کر خوش رہتا ہوں۔۔۔وہ چاہتے تھے کہ میں انگریزی میں بات کروں لیکن مجھے اس بات سے چڑ ہو گئی۔خصوصاً ممی کے بعد تو میں بے حد ضدی ہو گیا۔ابا حضور اب شام کو کلب بہت کم جاتے۔ان کے بہت سے دوست لمبی لمبی کاروں پر آتے اور ایک کمرے میں رات گئے تک محفل میں جمتی۔باورچی تکے، کباب، مرغ وغیرہ روسٹ کرتا رہتا اور بیرا کمرے میں جاتا رہتا۔ہر روز گوشت کھا کھا کے نفرت ہو گئی۔ابا حضور کو گوشت بہت مرغوب تھا کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔

جوانی کے آغاز تک میری ساری زندگی نوکروں کے ساتھ گزری۔کھانا بھی باورچی کے پاس بیٹھ کر کھا لیتا۔اس کے پاس ہی پڑھتا رہتا اور پھر ابا حضور کے فارغ ہونے تک نیند کی آغوش میں پہنچ چکا ہوتا۔۔۔کالج میں داخلے پر پھر ابا حضور کی سختی آڑے آتی۔میں آرٹس پڑھنا چاہتا تھا انہوں نے سائنس پڑھنے پر مجبور کیا۔۔۔دلچپی نہ ہونے کے باوجود میں نے سیکنڈ ڈویژن میں ایف ایس سی کر لیا۔یہاں آکر تھرڈ ایئر میں داخل ہوا تو خوشی تھی کہ ذرا خود مختاری کی زندگی گزرے گی۔۔۔لیکن یہاں آکر احساس ہوا کہ میری جذباتی زندگی ختم ہو چکی ہے۔اب تو کسی بات پر غم نہیں ہوتا۔بڑی سے بڑی بات خوشی کا باعث نہیں بنتی۔ڈیڈی نے میرے نام سے بینک میں بڑی بڑی رقمیں جمع کرا رکھی ہیں۔ان کا مجھے اختیار ہے۔وہ کہا کرتا ہے کہ روپیہ اپنے پاس اتنا ہونا چاہیے کہ دنیا کہ ہر شے خریدی جا سکے۔۔۔۔لیکن میں سوچتا ہوں کہ محبت کون کون سی دکان سے مل سکتی ہے۔میرے تشنہ لبوں کو محبت کی پیاس بے کل کیے دیتی

ہے۔ سبز سبز نوٹ مجھے مل جاتے ہیں، محبت نہیں ملتی۔ دیکھئے ابا حضور نے کل تین سو روپے کا چیک بھیجا ہے، میں ان کی شفقت محبت کے لیے ترستا ہوں، انہیں احساس تک نہیں ہے۔ وہ اب پانچ سال کے لیے چھوڑنے سے پہلے مل تو لیں۔۔۔''سر'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا کیا سارے لڑکوں کے باپ اس طرح کرتے ہیں؟ لوگ ہم پر اس لیے رشک کرتے ہیں کہ ہمیں بڑے افسروں کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دنیا جہاں کی آسائشیں میسر ہیں اور ہم۔۔۔۔ہم بچارے اعلیٰ افسروں کے بیٹے محبت کے دو بول کو ترستے ہیں، اپنی آگ میں خود جلتے ہیں۔۔''

ان کی ساری باتوں کو جاننے کے بعد میں نے شہزاد کا یہی علاج بہتر سمجھا کہ اسے اتنی محبت دی جائے کہ محرومی محبت کا احساس مٹ جائے، میں نے اسے انتہائی قریب کر لیا، اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات میں دلچسپی لیتا۔ ہوسٹلکے لڑکون کو میں نے خاص ہدایت کی کہ اسے دوست بنائیں۔ ان کوششوں کے نتائج خوشگوار نکلے۔۔۔ بی اے کا امتحان دینے تک وہ خاصی حد تک سمجھ چکا تھا۔

امتحان پاس کر کے وہ ایم اے کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ اس کے ڈیڈی نے اسے اکنامکس میں ایم اے کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اسے لکھا کہ انہی کی بات پر عمل کرے، ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں اس کے مستقبل کے متعلق کوئی خاص پروگرام ہو۔ پھر اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میرے ذہن سے بھی اس کا خیال اتر گیا۔

ایک سال گزر گیا، مجھے کالج کانووکیشن کے لیے کتابیں خریدنے لاہور جانا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر میں چاہتا تھا کہ کسی دوست سے مل لوں کہ معاً شہزاد کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپک گیا۔۔ وہ کس حال میں ہے، میں نے اس کی زندگی کی عمارت اٹھانے میں اہم رول ادا کیا تھا، چنانچہ یہ جاننے کے لیے اس کے ہوسٹل کی جانب چل پڑا۔ ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہو رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب مل گئے۔ یہ ادھیڑ عمر آدمی تھے اور ان سے میری اچھی خاصی واقفیت تھی۔۔۔۔ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے، چائے پیتے ہوئے کہنے لگے:

''آعظم صاحب خوش قسمتی ہے میری کہ آپ مل گئے۔ اب میں دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں گا۔ ان دنوں بالکل یوں لگتا ہے جیسے سینے میں دل نہیں ناسور ہے۔ عجیب سی بے چینی ہر وقت سوار رہتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بربادی میں، میں بھی شریک ہوں''۔۔۔ میرا دل کسی انجانے خدشے سے تیز تیز

دھڑ کنے لگا۔۔۔''میں شہزاد طاہر کی بات کر رہا ہوں اعظم صاحب۔''

وہ یوں بولے جیسے حلق میں کوئی شے اٹک گئی ہو۔''میں تو اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ تین سو لڑکوں کے ہوسٹل میں یہ بات ہے بھی تو بہت مشکل !ایک سال پہلے جب وہ یہاں آیا تھا تو میں نے اسے انتہائی فرمابردار، مہذب، شریف اور ذہین طالب علم محسوس کیا تھا۔۔۔اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ شاید چھ ماہ پہلے آہستہ آہستہ اس کی اچھی عادتیں رخصت ہونے لگیں۔ اس کے استااس کی شکایتیں کرنے لگے، اکثر رات کو دیر سے آنے لگا۔ ہوسٹل کے واجبات اس کے ذمہ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک دولت مند باپ کا بیٹا ہے۔ بہت دنوں تک اس کے متعلق کچھ نہ سمجھ سکا۔

وہ ایم اے کے پہلے سال کا امتحان دے رہا تھا کہ ہوسٹل کے بیرے نے اس کی شکایت کی۔ اس کے ہوسٹل کے چوکیدار کی لڑکی سے تعلقات تھے۔ اس لڑکی کی نسبت اس بیرے سے طے ہو چکی تھی، وہ چوکیدار کا بھتیجا بھی تھا۔۔۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایک اتنے اچھے خاندان کا لڑکا ایک نوکر کی لڑکی پر ڈورے ڈالے گا۔ میں نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ شہزاد میاں اسے روز سکول سے اپنے ساتھ سکوٹر پر ساتھ لے جاتے ہیں اور چھٹی کے وقت چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک روز بیرے نے دیکھ لیا۔ اب انہوں نے لڑکی کا سکول جانا بند کر دیا ہے۔

اس واقعہ سے میری رائے اس کے متعلق بدل گئی۔ مجھے وہ آوارہ لگا، جو اپنی دولت کے بل بوتے پر یہ گھناونا کھیل کھیلتا رہا تھا۔ اس رائے میں شدت کا ایک سبب شاید میری اپنی ذات بھی تھی جو کسی خدمت گار کی بیٹی سے ایسے تعلقات کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ تھی۔۔۔ چنانچہ اس کے چہرے کی معصومیت اس کی ظاہری شرافت کو میں نے دھوکہ سمجھا۔

میں نے اس پر نگاہ رکھنی شروع کی۔ وہ بے چین پھرتا تھا۔ اس کا پرچہ تھا لیکن اس نے نہیں دیا۔ دن بھر وہ سکوٹر پر سوار مارا مارا پھرتا رہا۔ شاید سکول کی طرف بھی گیا ہوگا۔ رات چوکیدار نے بھی شکایت کی کہ وہ ان کے کوارٹر کی جانب چکر لگاتا رہتا ہے۔۔۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر اپنی لڑکی کو بیرے سے بیاہ دے۔

اس شام پتہ چلا کہ شہزاد ادایم اے کے پہلے سال فیل ہوگیا ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور لباس شکن شکن ہو رہا تھا جیسے پینٹ میں ہی لیٹا رہا

ہو۔وہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا اور مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ اس سے کیا کہوں۔میں نے خاصے نرم لہجے میں کہا کہ ناکامی سے سبق لے اور چوکیدار کی لڑکی کا خیال چھوڑ کر پھر سے پڑھائی شروع کر دے،آوارگی میں خاندان کی بھی تو رسوائی ہوتی ہے۔۔۔میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''سر! آپ بھی مجھے آوارہ سمجھتے ہیں،شانو تو میری زندگی ہے سر! وہ چوکیدار کی لڑکی ہے تو کیا،مجھے اس میں اور اپنے آپ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔مجھے اس نے محبت دی ہے۔میں اس سے شادی کروں گا۔۔۔'''' شہزاد جوانی میں ہر لڑکا جذباتی ہوتا ہے۔وہ اس عمر میں جس لڑکی سے ملتا ہے اس سے پیان لیتا ہے۔تمہیں لڑکیاں اور بھی مل جائیں گی۔لیکن یہ وقت گزرا وقت پچھتاوا بن کر ڈستا رہے گا اور کیا تمہیں اپنے ابا کا بھی ڈر نہیں؟ وہ کیا سوچیں گے۔۔۔'' سر میں نے انہیں لکھ دیا ہے کہ میں نے اکنامکس میں دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ کر ملازمت کر لی ہے اور شانو سے شادی کرنے والا ہوں۔۔۔ان سے میں نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے اجازت دے دیں گے۔۔۔''

میری شہزاد سے اس ملاقات کے تیسرے دن شانو کی شادی ہوگئی۔۔۔۔۔اس کو میں نے ایک دو بافاصلے اسے دیکھا۔سچی بات ہے اس کا چہرہ دیکھنے سے خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی تھی۔۔۔۔میں نے دو تین بار چاہا کہ اس سے ملوں اسے تسلی دوں لیکن ہمت نہ پڑتی تھی،شادی سے ایک گھنٹہ پہلے تک وہ ڈاکیے کا شدت سے انتظار کرتا رہا تھا لیکن اس کا مطلوبہ خط نہ آیا۔۔تقریباً ایک ہفتہ میں اسے اسی طرح دیکھتا رہا۔آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تو لڑکوں سے باتیں کر رہا تھا۔میں مطمئن ہوگیا۔لیکن ایک دن ایک لڑکے نے بتایا کہ شہزاد چار روز سے غائب ہے۔میں نے پوچھ گچھ کی پتہ چلا کہ وہ اپنے سارے واجبات ادا کر گیا ہے۔اس کے کمرے کا تالا تڑوا کر میں اندر گیا۔وہاں جاتے ہی میری حالت بری ہو گئی۔اب بھی جب کبھی اس کے متعلق سوچتا ہوں تو ہمت جواب دے جاتی ہے۔۔۔آج ڈیڑھ ماہ ہوگیا ہے وہ نہیں آیا۔۔آؤ کیا تم اس کا کمرہ دیکھو گے۔۔۔۔؟''

میں گم سم بیٹھا ان کی طرف دیکھتا رہا۔۔تالہ کھولتے ہوئے ان کے ہاتھ شدت سے کانپ رہے تھے۔کمرہ گرد آلود تھا۔بند کھڑکی میں سے روشنی کی ایک لکیر سی اس کے لکھنے کی میز پر پڑ رہی تھی۔بالکل سامنے مینٹل پیس پر ایک بڑے فریم میں شہزاد اور ایک لڑکی کی تصویر جگمگا رہی تھی۔سپرنٹنڈنٹ صاحب نے

آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی اور سورج کی گرم گرم کرنیں کمرے میں بکھر گئیں۔ ''یہ دیکھتے ہو وہ ہر شے چھوڑ گیا ہے۔ چیک بک رسٹ واچ، قلم کپڑے، کچھ بھی تو نہیں لے کر گیا۔ ایک ظلم میں نے اس پر کیا اور دوسرا اس کے باپ نے! یہ خط دیکھو جس کا وہ شدت سے منتظر تھا۔۔۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ اس پر انگریزی کی تحریر کے اوپر بڑے بڑے شکستہ حروف میں ''شان، شان، شانو، شانو کی گردان کی گئی تھی۔۔۔'' بڑا ظالمانہ خط لکھا ہے، جو فقرے پڑھے جاتے ہیں وہ پہلے سے شکستہ دل کو چور چور کر دینے کو کافی ہیں۔ گالیاں تک دینے سے دریغ نہیں کیا گیا۔۔۔'' میں خط پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور وہ بولتے رہے۔۔۔'' مجھے یقین ہے اگر یہ خط نہ آتا تو شاید وہ شانو کا صدمہ برداشت کر جاتا۔ کاش اس کے احساسات اور نازک دل کا مجھے پہلے سے اندازہ ہو جاتا۔''

میز پر اکنامکس، اردو شاعروں کے دیوان، افسانوں کی بے شمار کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ جن پر گرد کی تہیں جمتی جا رہی تھیں۔ میں نے شانو اور شہزاد کی فوٹو اٹھائی۔ دونوں کی آنکھوں میں مسرت کی ایک لکیر سی دکھائی دی جو جلد ہی میری آنکھوں کے پانی میں دھندلانے لگی۔ کونے میں قلم سے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

ہو چکیں غائب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

''اعظم صاحب'' ایک کانپتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ ''یوں لگتا ہے جیسے وہ کہیں دور چلا گیا ہے۔۔۔ بہت دور کہیں اندھیروں میں ڈوب گیا ہے''

(سالانہ میگزین، مشعل گورنمنٹ کالج کیمبل پور ۱۹۶۹ء)

نام	امان اللہ خان
ولدیت	گلاب خان
پیدائش	۲ جنوری ۱۹۴۴ء
مقام پیدائش	مٹھیال ضلع کیمبل پور (اٹک)
تعلیم	گریجویشن

امان اللہ خان کا تعلق مٹھیال گاؤں کے کھٹڑ قبیلہ سے ہے ان کا بچپن اور لڑکپن اسی گاؤں میں گزرا گریجویشن کے بعد واہ آرڈیننس فیکٹری میں ملازمت اختیار کی تو یہیں رہائش پزیر ہو گئے بعد ازاں آفیسر کالونی واہ میں اپنا ذاتی گھر بنالیا۔

ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۳ء میں فنِ افسانہ نگاری سے کیا پہلی کہانی زمانہ طالب علمی میں لکھی جو کالج میگزین میں شائع ہوئی بعد ازاں ان کے افسانے اوراق، ادب لطیف، نیرنگِ خیال، سیپ، ادبیات، سمبل اور سہ ماہی قندیل (اٹک) میں شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ واہ کی ادبی مجالس میں باقاعدگی سے شرکت فرماتے رہے۔

امان اللہ خان سے میرا غائبانہ تعارف ادبی رسائل میں شائع ہونے والے ان کے افسانوں کے توسط سے تو تھا لیکن ان سے باضابطہ ملاقات کا شرف حاصل نہ تھا۔

۲۰۰۵ء میں معروف شاعرہ اور نوائے وقت کے ادبی صفحہ کی انچارج محترمہ عائشہ مسعود ملک اور سعید اختر ملک کی دعوت پر ہالی ڈے اسلام آباد میں جناب سعید اختر ملک کے افسانوی مجموعہ ''سوچ دلان'' کی تقریب رونمائی میں حاضری کا موقع ملا۔ اس پروقار تقریب کی مہمانِ خصوصی محترمہ بانو قدسیہ کے علاوہ جہاں احمد فراز، پروفیسر فتح محمد ملک، عطاالحق قاسمی، منشا یاد، حمید شاہد، اور دیگر معتبر ادبی شخصیات تھیں وہیں امان اللہ خان بھی موجود تھے۔

پروگرام کے اختتام پر جب چائے کا دور چلا تو تلہ گنگ اور اٹک سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم کا مجمہ

لگا اس دوران پروفیسر فتح محمد ملک قیوم طاہر، اکرم ضیاء اور سعید اختر ملک کی موجودگی میں جناب حمید شاہد نے امان اللہ خان کا تعارف مجھ سے کروایا۔

اس کے بعد امان سے ایسا ربط قائم ہوا کہ موصوف کا واہ سے مٹھیال ہر دوسرے دن اپنے پٹرول پمپ کا حساب کتاب لینے جانا ہوتا تو واہ سے اٹک کی گاڑی پکڑتے اور کئی کئی گھنٹے ہمارے پاس گزار کر مٹھیال کے لیے روانہ ہوتے۔ ان سے افسانہ سننے کا جو لطف ملتا وہ ان کے افسانے پڑھ کر نہیں اپنے افسانچوں کا لفظ لفظ یوں یاد ہوتا جیسے کسی شاعر کو اپنا کلام۔ وہ ہر سطر میں لفظوں کے موتی ٹانکتے چلے جاتے، کہانی کو خود کو پر اس طرح طاری کر لیتے کہ جیسے ان کہانیوں کے کردار ان کے اپنے ہی ہوں کبھی کبھی ان کرداروں کی محرومیوں کے پرت کھولتے ہوئے ان کی آواز حلق سے زبان تک آتے یوں ہچکولے کھاتی جیسے بھنور میں کشتی، کہانی پڑھتے ہوئے وہ اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے اس سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے یہ کردار کہیں نہ کہیں ان کی ذات کا حصہ رہے ہوں۔

۲۰۱۲ء میں ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو وہ اٹک کے دوستوں کو خود یہ تحفہ پیش کرنے تشریف لائے بعد ازاں واہ ہوٹل میں بھرپور تقریب رونمائی۔۔ ڈاکٹر رشید امجد، حمید شاہد ایسے مہمانوں کے علاوہ اٹک اور واہ کے ادبی حلقوں کی شرکت، اس تقریب میں وہ پھولے نہیں سمارہے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ اکثر آتے رہے لیکن پٹرول پمپ کے کاروباری معاملات میں بہت پریشان رہتے وہ اکثر اپنا موبائل کہیں بھول جایا کرتے اگلی بار جب بھی تشریف لاتے ایک نیا نمبر دے جایا کرتے تھے پھر نہ جانے کیوں اچانک منظر سے غائب ہو گئے کئی بار رابطہ کی کوشش کی لیکن ان کے نمبر بند ملتے پھر کسی دوست سے علم ہوا کے وہ بہت مسائل میں الجھ چکے تھے اور اونے پونے پیٹرول پمپ فروخت کر کے گھر ہی میں رہنے لگے تھے۔ پچھلے دنوں اس کتاب کی تیاری کے لیے ان کے کوائف کی ضرورت پیش آئی تو ان کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک دوست سے ان کی بابت دریافت کیا تو یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ وہ فالج کی بنا پر شدید علیل ہیں۔ اپنے متعلق یہ مختصر سی معلومات انہوں نے ۲۰۰۹ میں فراہم کی تھیں۔

مطبوعات:

بے خواب سفر (افسانے) ۲۰۱۲ء

بے خواب سفر

امان اللہ خان

ریلوے لائن کے کنارے چھوٹے سے کوارٹر کی ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھا میں اپنی زیست کی گاڑی ریل ٹریک پر چلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنے ازل سے اِس کھڑکی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کہیں بھی جاتا ہوں تو اپنی سوچ کی ایک آنکھ اِس کھڑکی کی چوکھٹ پہ دھر جاتا ہوں اور یہ آنکھ بغیر پلکیں جھپکائے راستوں پہ نظر رکھتی ہے۔ ایک خوف سا رہتا ہے کہ آنکھ جھپکے گی تو منظر کہیں کھو جائے گا۔۔۔۔ راستے کہیں گم ہو جائیں گے اور میں کھڑکی میں تنہا بیٹھا رہ جاؤں گا۔۔۔۔ میں اندیشوں کی سولی پہ لٹکا ہوا ہوں۔ خوف کے مارے میں نے تنہائی کے آسیب کو اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا ہے۔ یہ مجھ سے دست و گریباں ہے مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ اژدھا اگر میری گرفت سے نکل گیا تو مجھے نگل لے گا۔ اور تنہائی پریشان ہے کہ اگر میں اُس سے یوسف کی طرح دامن چھڑا کر بھاگ گیا تو وہ تنہا اور رسوا ہو جائے گی۔ نیولے اور سانپ کی طرح ہم دونوں اپنی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

چھوٹے سے بستے میں تختی، قاعدہ اور سلیٹ کے علاوہ میں نے سوچ کے بہت سارے بوجھ اٹھا رکھے تھے۔ میں وجود کی آنکھ سے راستے ٹٹول ٹٹول کر سکول جاتا۔ راستے جو بڑی احتیاط سے ٹیلے سے نیچے اُترتے اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دُور میرے سکول تک جاتے۔ سکول جو سیڑھیوں کی طرح تھا۔۔ اوپر کو جاتی سڑھیاں۔۔۔ حروف اور ہندسے ایک ترتیب اور ایک توازن سے اُن سیڑھیوں پہ کھڑے ہوتے۔ میرا اُستاد میرے شعور کی انگلی پکڑ کر ایک سے دو۔۔۔ دو سے تین 'ا' سے 'ب' اور 'ب' سے 'ج' کی سیڑھی پہ لے آتا؛ مجھے کچھ متوازن کر کے میری انگلی چھوڑتا تو ہچکچاہٹ اور خوف کے مارے میں سیڑھیوں کے قدموں میں گر جاتا۔

steeltap پہ لکھے تمام ہندسے دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات چھ اور پانچ کر کے ڈبی کے اندر چلے جاتے اور میں تہی دست اپنا بستہ اٹھائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کوارٹر کو جانے والی پگڈنڈی

عبور کرتا تو بری طرح ہانپ جاتا۔ دروازہ کھولتا تو نیم تاریک کمرہ ہا پر جیسا منہ کھولے نڈھال پتنگے جیسا میرا وجود چھپکلی کی طرح نگل لیتا اکیلے کمرے مختصر برآمدے اور چار گز صحن کے اس گھر میں ہمیں روشنی کی اتنی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ کمرے کے اندر کی چیزیں بغیر دیکھے مل جاتی تھیں، گھر میں سامان ہی کتنا تھا چند برتن جو چولھے یا گھڑے کے پاس پڑے رہتے گھڑونچی پہ رکھے دو گھڑے نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ایک جستی بالٹی آٹے کا ٹین مرچ مصالحے کے ڈبے دو چارپائیاں رسی پہ لٹکے چار کپڑے۔ ٹھلے کے ٹوٹے ہوئے پُرزے فش پلیٹیں۔۔۔ زنگ آلود نٹ بولٹ صحن کے ایک کونے میں رکھے لکڑی کے پرانے سلیپر۔ دوسرے کونے میں پتھر کے کوئلے کی ایک ڈھیری جو اجی لوہار خانے سے اُٹھا لائے تھے۔

کوئلہ جلانے والی ایک انگیٹھی۔ گھرے سے دیوار تک بنی پانی کی نالی یہ کُل دنیا تھی جہاں میں اور اجی تنہا رہتے تھے۔ دو بکریاں، بھیڑ، گائے اور تین ایکڑ زمین گاؤں میں ماں نے سنبھال رکھی تھی۔ زندگی بڑے غیر محسوس انداز سے گزر رہی تھی۔ سلسلہ در سلسلہ ایک سے معمولات، دھیمی چال سے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اس برانچ لائن پر شمال اور جنوب سے آنے والی گاڑیاں اس پہاڑی ریلوے سٹیشن پر چند لمحوں کے لیے رُکتیں اور سیٹیاں بجاتی سرنگوں کے اس پار چلی جاتیں۔ انجن کا دھواں دیر تک ٹنل سے رستا رہتا اداس خاموشی شام ہوتے ہی اندھیرے کو اوڑھ کر وادی کی گود میں سو جاتی۔

سکول سے آنے کے بعد میں اپنے کوارٹر ہی میں رہتا۔۔۔ فرش پر کوئلے سے متوازی لائنیں بناتا۔۔۔ بغیر پہیوں کے لوہے کے رِپین کے انجن اور لکڑی کے ٹکڑوں کے ڈبے جوڑ کر گاڑی کو اِس فرضی لائن پر چلاتا۔ منہ سے سیٹی بجاتا۔ سٹیم انجن کی طرح چھک چھک کرتا قلم کے سرکنڈے سے سگنل بناتا کانٹے بدلتا فرضی پھاٹک بند کرتا۔ کبھی کبھی انجن میں ڈرائیور کی جگہ اور کبھی پچھلی بیرک میں بیٹھ کر گارڈ کی طرح سیٹیاں بجاتا۔ اور یوں میری گاڑی چلتی رہتی۔ اور میں تنہا اِن بے جان لوہے کے ٹکڑوں سے کھیلتا رہتا مگر میں تنہا کب تھا۔۔۔ میری سوچ کے وجود میں بہت سارے لوگ تھے۔ سٹیشن پر مسافروں کی بھیڑ لگی تھی۔ انجن ڈرائیور۔۔ گارڈ۔۔ کانٹے والا۔۔ سٹیشن ماسٹر۔۔ پانی پلانے والا کریم۔۔ ٹین اور جھاڑو والا مڑو، مگر میں اس فرضی کھیل میں اُس کو شامل نہ کرتا۔ صرف وہی لوگ جو میرے اجی جیسے تھے یا اُن سے بالاتر۔ میں اپنے طبقے کی دہلیز سے نیچے اتر کر کبھی نہ آیا۔ مڑو، جیدا، کالا اور سرداراں جو ساتھ والی چوکی میں رہتے تھے اُن کے بہت سارے بچے تھے جو سارا دن نالی کے اُس پار چوکی کے سامنے کانچ کی گولیوں

سے کھیلتے رہتے اور میں نالی کے اِس پار اکیلا لوہے کے ٹکڑوں سے کھیلتا رہتا۔

ابجی اکثر دیر سے گھر واپس آتے تھکے تھکے سے۔ انہوں نے ٹھیلے کی ہتھی تھامے ریلوے لائن پر بھاگ بھاگ کر اپنی زندگی کا بہت سا سفر طے کر لیا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے دھیرے دھیرے چلتے تھے۔ جھکے کندھوں پہ چمڑے کا تھیلا اٹھائے۔۔۔جس میں ٹرالی کے اوزار ہوتے۔ کپڑے کی سرخ جھنڈی، روشنی کی تین رنگوں والی لالٹین سرخ۔ سبز اور سفید روشنی کے یہی رنگ تھے جو ہمارے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے بابا مجھے دکھانے کے لیے روشن کرتے۔ پھر اندھیرا چھا جاتا یا پیلے مریل چہرے والی لالٹین جلتی بجھتی آنکھوں سے زندگی کے آخری کناروں پہ لٹکے مریض کی طرح کسی پُر امید صبح کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہتی۔

رات کو بابا جلدی سو جاتے مگر میں پچھّم سے آنے والی گاڑی کے آنے تک وجود کی آنکھ کے ساتھ جاگتا رہتا۔ گاڑی چند لمحوں کے لیے رکتی اور سیٹیاں بجاتی چھک چھک کرتی چٹی کھٹائی کے اُس پار چلی جاتی اور میں ساعتوں کی بینائی سے گاڑی کو بہت دُور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا اور پھر میرے وجود کے اندر ایک گاڑی چل پڑتی۔ سیٹیاں بجاتی۔۔۔دھواں اڑاتی مجھے دُور خوابوں کے جزیروں میں لے جاتی۔ دریا کے کنارے دُور دُور تک گھنے جنگلوں سے گزرتی اور میں گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھا بند آنکھوں کے خواب دیکھتا۔ خواب۔ جو مجھ اندھے کی چھڑی پکڑ کر اپنی مرضی سے بہت دُور نکل جاتے۔ اور میں جب واپسی کا راستہ بھول جاتا۔ تو صبح ہو جاتی جب کہ کھلی آنکھوں کے خوابوں کو آدمی انگلی سے پکڑ کر اپنی مرضی سے لے کر چلتا ہے۔

خوابوں کے سارے منظر دیکھے بھالے ہوتے ہیں۔ میرے ابجی نے بھی کھلی آنکھوں کے کچھ خواب سوچ رکھے تھے۔ وہ سارے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ ان کے خواب سارا دن ان کے ساتھ رہتے۔ ان کے ساتھ ٹھیلے پہ سفر کرتے۔ وہ ٹھیلے کی ہتھی تھامے میلوں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ان کی آنکھیں خواب بُنتیں سوچ کے محدب عدسے سے میرے کم سِن وجود کو جوان دیکھتے۔ گرے سُوٹ میں ملبوس سولا ہیٹ پہنے وہ مجھے ٹرالی کی گدی والی سیٹ پر بٹھا دیتے اور پھر ان کی آنکھوں کے سارے خواب ایسوسی ایٹ انجینئر کے فریم میں منعکس ہو جاتے نپے تلے قدموں سے بابا کا روز کا سفر برسوں سے جاری تھا۔ میرے بابا کے پاس صرف ایک ہی خواب تھا میرے مستقبل کا خواب۔ وہ مجھے ٹرالی کی گدی والی سیٹ

پر دیکھنا چاہتے تھے۔

شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہوتے تو مجھے امجد بابو کے گھر لے جاتے۔اس کی بھینس کو چارہ ڈالتے دودھ کی بالٹی اُٹھا کر ہوٹل لے جاتے گھر کا سودا سلف لاتے۔رات کو انگیٹھی روشن کرتے اور میں بابو کے پاس بیٹھا حرفوں کو لفظوں میں اور لفظوں کو فقروں میں جوڑتا ہندسوں کی ضرب تقسیم اور جمع تفریق کے گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کرتا یوں امجد بابو روز کے راز میرے بابا کی مزدوری چکا دیتے۔معمول کے اس دائرے کا سفر برسوں جاری رہا۔

پرائمری کے آخری امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔مارچ نے اپنے سارے ادھ کھلے پھول اپریل کی گود میں ڈال دیے تھے۔میں نے نیلے پیلے اور سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ بنایا،دھریک کی کنواری خوشبو سے اُسے باندھ دیا۔بستے میں آج کتابوں کی بجائے گلدستہ ڈالا اور سکول چلا گیا۔۔۔گلدستہ پانی کے گلاس میں سجایا اور میاں جی کی میز پر رکھ دیا۔نتیجے کا اعلان ہُوا۔میں بہت خوش تھا۔سارے لمحوں کے حساب کتاب سرٹیفکیٹ کے چہرے پہ درج تھے۔نمروں کے درجے میں مَیں سب سے اوپر تھا۔

آج اس سکول میں میرا آخری دن تھا۔پانچ سالوں کی ساری یادیں میں نے دل کے بستے میں ڈال لیں،گزرے سال ٹاٹ میں لپیٹ کر کمرے کے کونے میں ڈال دیے اور رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ عقیدت کی تمام خوشبوؤں سمیت میاں جی کی میز پہ چھوڑ آیا۔مگر پھر بھی میرا بہت کچھ سکول میں رہ گیا تھا۔جب کبھی اُس لائن سے گزرتا ہوں ٹرین کی کھڑکی سے سکول کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی غریب الوطن قیدی ہوں اور یوں ہی اتفاقاً گاڑی کے ڈبے میں بند اپنے گھر کے پاس سے گزر کر کہیں بہت دُور اپنی باقی عمر کی قید کاٹنے جا رہا ہوں۔

البم کے اگلے ورقوں پر تصویروں کے سارے رنگ اور تمام منظر یکسر بدل گئے تھے۔گھنی بیریوں کے بُور میں شہد کی کچی خوشبو رچی ہوئی تھی۔راہوڑے کے بے ثمر درخت پہ سرخی مائل بڑے بڑے گلابی پھول تھے۔سریں کا درخت تھا جس کی بیسیوں بانہیں تھیں سیکڑوں ہاتھ تھے۔ہاتھوں میں پھول تھے۔اور پھولوں کے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی خوشبو تھی۔سوچ سوچ کر بہنے والی ندی جلترنگ بجا رہی تھی۔وادی میں دُور دُور تک تیتر جوڑے اپنی اپنی چاہتوں کے بول،بول رہے تھے۔ایسے میں مَیں اکیلا تھا مگر میں کب اکیلا تھا۔یہ میٹھے بول یہ ساری خوشیاں یہ خوشبوئیں یہ تمام رنگ میرے سنگ تھے۔گو اس بہار کے بعد بہت کچھ

بدل گیا تھا مگر سُرنگوں کے اُس پار جھلار کا ریلوے سٹیشن اپنے ازل پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ "سن ۱۸۸۰ء" اپنے وجود کی تاریخ کی تختی عمارت نے اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔

اس کی عمر کے گزرے سال آس پاس بکھرے پڑے تھے۔ سامنے پہاڑی ٹیلے پر رکھی پانی کی ٹینکی رنگوں کے سیکڑوں لیپ اوڑھ کر سوئی ہوئی تھی۔ ندی کنارے قطار میں بیٹھے ریلوے کے کواٹر ایک ایک کر کے اپنی گزری عمر کی کنکریاں ندی میں پھینک رہے تھے بڑے بڑے سٹیل گاڈر والا ریل کا پل سات سرنگیں، ہر ایک نے اپنی عمر کا حساب اپنے ماتھے پہ لکھ رکھا تھا۔ جب گاڑی آتی تو ساری آنکھیں جاگ اُٹھتیں سگنل روشن ہو جاتے۔ گھنٹیاں بجنے لگتیں کانٹے والا سرخ اور سبز جھنڈی تھامے سٹارٹر کے پاس چلا جاتا۔ کریم پانی کی بالٹی اُٹھائے پلیٹ فارم پہ متحرک ہو جاتا صفائی والا مڑو، سٹیشن بابو سب اپنے اپنے کوارٹروں سے نکل کر سٹیشن آ جاتے۔ گاڑی چند لمحوں کے لیے رکتی اور آؤٹر سے آگے موڑ پہ گم ہو جاتی ایک زندگی اور ایک روشنی اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتی۔ حنوط چہرے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے اور باقی وقت کے لیے وادی خاموشی کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔

شہر کے سکول میں داخلہ ملا پہلے روز میں شرابت کے سنگ ملتان سے آنے والی پسنجر سے سکول چلا گیا۔ بڑے شہر کے بڑے سکول کے بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمروں کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ٹاٹ سے اُٹھ کر آیا تھا ڈیسک اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر چلتی گاڑی میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھس آیا ہوں۔ سہ پہر کو چھٹی کے بعد تھل ایکسپریس سے واپس چلا گیا۔ گرے نیکر، mlik white ہافsleeve کی شرٹ جس کی جیب پر سنہری چمکتا ہوا سکول کا بیج لگا ہوا تھا۔ گھٹنوں تک سفید جرابیں سیاہ چمکتے بوٹ بہت ساری زپوں والا سکول بیگ پلاسٹک کا ٹفن باکس رنگوں والی پینسلیں ربڑ، شارپنر رنگین تصویروں والی مجلد کتابیں اور کاپیاں آج نہ میرے پاس تختی تھی نہ سلیٹ تھی نہ سرکنڈے کا قلم تھا نہ سنگِ مرمر کی سلیٹی تھی نہ گاچی تھی نہ کالی سیاہی والی بغیر ڈھکن کے مٹی کی دوات تھی مجھ سے مختلف کوئی بہت مختلف آج میرے وجود میں تھا کوئی اجنبی تھا جسے دیکھ کر چوکی کے کالے کلوٹے لڑکے کانچ کی گولیاں چھوڑ کر حیرت اور حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے اور میں اُن سے بات کیے بغیر گزر گیا۔ آج کچھ تو میرے وقار کی بات تھی اور کچھ اُن سے زیادہ بات چیت بھی نہ تھی۔ وہ نالی کے اُس پار تھے اور میں نالی کے اِس پار میں ایک لمحے کے لیے رکا اور بلا ہلاتے ہوئے اپنے کوارٹر

چلا گیا۔ اندر تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔

پھر میں جلد ہی اپنے آپ سے مانوس ہو گیا لباس، چال ڈھال اور ماحول بدلتا ہے تو سوچ بھی بدل جاتی ہے مگر معمولات وہی رہے راستے وہی رہے روز کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ ہفتے کی شام تک میں ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ شام کی گاڑی سے بے بے گاؤں سے آجاتی پوٹلیاں دیگچے، ڈبے مکئی کا آٹا، دودھ، لسی مکھن بیر شہتوت انڈے وہ میرے لیے اپنی پوری کائنات سمیٹ لاتی۔۔۔۔ میری ماں بہت خوب صورت عورت تھی۔ گاڑی سے اترتی تو شام کے دھندلکے میں پلیٹ فارم پر ایک روشنی سی پھیل جاتی۔ وہ مجھے اپنے بازؤں میں سمیٹ لیتی اپنے ہونٹوں سے میرے چہرے کی تھکاوٹ چوس لیتی سرمے کی طرح مجھے اپنی آنکھوں میں ڈال لیتی اور میں ماںتا کے دریا کنارے چاہتوں کی گھنی چھاؤں میں ایک طویل وقت کے لیے سکھ کی میٹھی نیند سو جاتا۔

چھٹی کے روز اجی گھر اور ماں کے لیے سودا سلف لینے شہر چلے جاتے۔ اگلے روز صبح کی گاڑی سے ماں گاؤں اور میں سکول چلا جاتا اور اجی ٹھیلے کی ہتھی تھامے اپنی سوچوں اور خوابوں کو اوڑھے ریلوے ٹریک پر ایک روبوٹ کی طرح دوڑتے رہتے۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح ہم اپنے اپنے دائروں کے سفر میں اپنی اپنی رفتار سے چلتے رہتے اور ہفتے کی شام ایک نقطے پر آن ملتے ان راستوں پہ چلتے چلتے سیکڑوں گھڑیاں گزر گئیں۔ غیر محسوس انداز میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ نیکر کی بجائے اب میں ۳۶ انچ کی پتلون پہن کر سکول جاتا موٹی موٹی کتابیں رات گئے تک کیروسین لیمپ کی روشنی میں پڑھتا۔ بابا اب ہیڈ ٹرالی مین ہو گئے تھے۔ ان کو اب ٹھیلا نہیں دھکیلنا پڑتا تھا مگر بابا کے خواب وہی پرانے تھے وہ خواب بُنتے تھے میں خواب پڑھتا تھا وہ خواب دیکھتے تھے میں خوابوں کے سوال حل کرتا تھا۔ وہ خواب سوچتے تھے میں خوابوں کی نظمیں یاد کرتا تھا:

" O ! stay "The maiden said
" and rest thy very head upon her breast
Tear stood in her bright bleu eyes
but still he answers with a sigh,"

ہم اس دائرے میں چلتے رہے۔ پھر ایک روز یہ دائرہ ٹوٹ گیا!

دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اُس روز گاڑی لیٹ تھی۔ آؤٹر سے کچھ پیچھے caution پہ گاڑی رکی ماں سمجھی سٹیشن آ گیا ہے وہ جلدی سے اتری گاڑی چل پڑی وہ اپنی پوٹلیاں اور ڈبے سمیٹتے ہوئے دوبارہ گاڑی پہ سوار ہونے لگی پائیدان سے پاؤں پھسلا ایسی گری کہ دائیں ٹانگ کٹ گئی ہمارے سارے خواب بکھر گئے ۔ہماری خوشیاں ٹوٹ گئیں۔ دِتّو کمہار کی آوی کی طرح سب کچھ پھیتے پھیتے ہوگیا۔ وہ ڈیڑھ ماہ بعد ہسپتال سے مصنوعی ٹانگ اور بیساکھیوں سے چل کر گھر واپس آ گئی ہم اکٹھے رہنے لگے۔ شام کو سکول سے واپس آتا تو گھر کے دروازے کے باہر بیساکھیوں کے سہارے یاس بھری مسکراہٹوں کے ساتھ اسے اپنا منتظر پاتا۔ میں احتیاط سے اُس سے لپٹ جاتا۔ کہیں ٹوٹا ہوا وجود بالکل ہی نہ بکھر جائے۔ ماں کو اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کا بہت دکھ تھا۔ اس کے گاؤں کا سلسلہ اجڑا اور اس کا گھر ویران ہوگیا تھا۔ ماں کی ٹانگ کیا ٹوٹی ، گاؤں کے گھر کا بڑا ستون ٹوٹ گیا۔ سارا سلسلہ کڑیوں سمیت نیچے آن گرا تھا۔ بکریاں ، گائے ،زمیں سب کچھ منڈی پر بک گیا۔ زمین پٹے پہ دے دی گئی تالوں کو زنگ لگ گیا ماں کبھی کبھی خالی ڈبے، دیگچیاں اور پوٹلیاں کارنس سے اتار لیتی پہروں کچھ سوچتی رہتی۔

قلم ، دوات ، کاپیاں ، انگریزی ، ریاضی ، سائنس میں نے بہت سے ایسے مسائل دیکھے تھے مگر آج تک اندر کا دکھ نہ دیکھا تھا۔ یہ پہلی اندر کی چوٹ تھی جو بڑی شدید تھی۔ ایک گھٹن سی دل کو دبوچ لیتی ایک بے چینی اور ایک اضطراب روح میں پھیل جاتا۔ اور بابا وہ تو پہلے ہی کم بولتے تھے اب تو بلکل ہی چپ سادھ لی تھی جس روز وہ بے بے کی کٹی ہوئی ٹانگ گاؤں کے قبرستان میں رات کو دفن کر کے لوٹے تھے دکھ کے اس بوجھ سے وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے ان کے کاندھے جھک گئے تھے۔ چہرے پہ گزرے سالوں کی لکیروں کے اوپر ایک اور بڑھاپا آن گرا تھا یوں لگتا تھا انہوں نے ان تھوڑے سے دنوں میں زندگی کے بہت سے سالوں کا سفر طے کر ڈالا ہے انہیں مسلسل بخار رہنے لگا سردی ان کے بے رس ہڈیوں میں سرایت کر گئی تھی وہ کمبل اوڑھے سورج طلوع ہوتے ہی ٹرالی کے شیڈ کے پاس آ جاتے۔ سفاری سوٹ میں ملبوس سولا ہیٹ پہنے چمکتے بوٹوں کے ساتھ نقوی صاحب پھر کی ، بنگلے تک جاتی سیڑھیوں سے اُتر کر شیڈ تک آتے تو یہ تصویر اپنے تمام زاویوں سمیت بابا کے دل میں اتر جاتی ان کے خواب بلکہ زخمی خواب تازہ دم ہو جاتے وہ ماتھے تک ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے۔ ''شیر جنگ !تم آرام کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

ٹرالی چلتی جاتی تو اجی کی سوچ اسی ٹریک پر اپنا سفر شروع کر دیتی مگر وہ ٹھیلے کو نہ پہنچ پاتی پھر آہستہ

آہستہ سوچ کی آنکھوں میں منظر لانے لگتے ایک دبیز دھند چھا جاتی سب کچھ گم ہو جاتا تو بابا بھاری قدموں سے کواٹر واپس آجاتے ۔ بے بے اور اجی دونوں چپ سے حالات کے سمندر میں ڈوب جانے والے جہاز کے بچ جانے والے مسافروں کی طرح کسی تختے پہ سوار یاس کی چادر اوڑھے کسی ساحل کی اُمید میں زندہ تھے ۔ٹوٹتے ہوئے خوابوں کے سفر میں مَیں بھی ان کے ساتھ تھا عمر کی جس حصے میں دوسرے بچے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے تھے میں اپنی سوچ کے دائرے میں بیٹھ کر شیشے کے تاج محل تعمیر کرتا تھا۔ پتھر کی جن سیڑھیوں سے اتر کر نقوی صاحب ٹرالی لے شیڈ تک آتے تھے، میں ان سیڑھیوں کی انتہا تک جانا چاہتا تھا۔

پہلے سفر کا آخری امتحان آن پہنچا۔ تلخیوں اور پریشانیوں کے سارے دھبے ذہن کی سلیٹ سے مٹا ڈالے تمام سوالوں کے سارے جواب پورے لوازمات کے ساتھ حل کیے۔ تیز رفتار زندگی کے بہتے ہوئے دریا کے عین وسط میں مَیں ایک جھولتے ہوئے معلق پل صراط پہ کھڑا اپنے آپ کو متوازن کرنے کی کوشش کر رہا تھا ماں بغلوں کے نیچے بیسا کھیاں لیے کھڑی تھی ۔ بابا دو ہفتے کی sick leave ہی کے دوران خون تھوکنے لگے تھے ۔ڈاکٹر نے انھیں ایک لمبے عرصے کے لیے سینی ٹوریم کے لئے advice کیا تھا ۔ بابا وہاں اکیلے جانے کے لیے تیار نہ تھے ۔ ماں ادھورے توازن کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی میرے میٹرک کے پریکٹیکل ہونا ابھی باقی تھے۔ایسے میں بابا کو اکیلے ہی جانا تھا مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پہ بضد تھے۔

''بیٹا میں بہت ہی اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔''

مگر کیسے وہ تو پچھلی گزری زندگی کے تمام راستوں پر خوابوں کی ایک بارات لے کے تنہا ہی چلے تھے ۔ پھر وہ اکیلے کیوں تھے! ہم دونوں اپنے سالم وجود، اپنی سوچ، دکھوں، خوشیوں سمیت بابا کے ساتھ تھے پھر یہ ریل ٹریک کا سفر تھا۔ بابا کی لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔

ایک اُداس شام وہ کوئٹہ ایکسپریس سے سینی ٹوریم چلے گئے ایک چپ اور ایک سناٹا ہمارے چھوٹے سے کواٹر میں چھوڑ گئے مگر وہ جلدی واپس آگئے ہم سے رُوٹھے رُوٹھے ۔ خاموش مہر بہ لب ہلکے نیلے لباس میں ملبوس گئے تھے ۔ سفید کورے لٹھے میں لپٹے واپس آئے حیرت بھرے دکھ نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ ماں کی اُداس آنکھوں میں دفن دکھ کے آنسو پلکوں میں اُلجھ کر رہ گئے ۔ میں نے بھی اپنے دکھ پلکوں پر آنے سے

پہلے سمیٹ لیے۔کون تھا جس کو اپنا دکھ دکھاتے ہم تو صرف دو ہی تھے۔اور آج دونوں تنہا تھے۔وہ تیسرا ہاتھ ہی چھوٹ گیا تھا جس کے الٹے سیدھے ہونے سے ہار یا جیت ہوتی تھی جیت بھی ہماری تھی ہار بھی ہماری تھی ایسا تو کہیں دُور دُور بھی گمان نہ تھا۔

ٹی بی تو بند مٹھی سے ذرہ ذرہ کرنے والی ریت کی طرح ہوتی سالوں میں کہیں جا کر خالی ہوتی ہے بابا جب گئے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کسی releaving ڈیوٹی پہ جا رہے ہوں یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ واپس زندہ نہیں آئیں اتنی جلدی وہ ٹوٹ کر بکھرنے والے کبھی نہ تھے۔بڑے مضبوط اور سخت جان تھے مگر جب کوئی سخت چیز ٹھوکر سے ٹوٹتی ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے والا اپنے سارے خواب بند آنکھوں میں سمیٹ کر سفید کفن اوڑھے اپنی ابدی بنیادوں میں جا کر سو گیا۔جب کہ ہمارے چھوٹے سے گھر کی ساری دیواریں اسی ایک پتھر پہ کھڑی تھیں۔

تحفظ کی دیواریں گر گئیں سوچوں اور خوابوں کے نیلے پیلے دائرے ٹوٹ گئے۔طوفان گزر گیا تو دھول اور راکھ رہ گئی۔پیچھے مڑ کر دیکھا جن راستوں پہ چل رہے تھے ان سے بھٹک کر بہت دُور نکل آئے تھے ان اجنبی راستوں پر ٹٹول ٹٹول کر اپنے وجود کی خبر پاتے بہت دنوں میں اپنے آپ کو سمیٹ پائے کھو جانے والا ہندسہ تو صرف ایک ہی تھا جب کہ اس سے جڑے صفر کے دو وجود بیسیوں پہ بھاری تھے گنتی کہاں سے شروع کریں کہاں سے بھولے تھے کچھ یاد نہیں آ رہا مین سرکٹ ٹوٹا تو تو سکرین کے سارے ہندسے گل ہو گئے تمام بٹن ٹٹولے پچھلے سارے اندازے کھو گئے تھے تمام حساب غلط ہوئے کمپیوٹر کی سکرین پر صفر کی ایک طویل قطار کھڑی تھی اور اس قطار میں مَیں تنہا کھڑا تھا۔

پھر ایک روز نقوی صاحب نے مجھے اپنے بنگلے بلوا بھیجا۔دستِ شفقت میرے سر پہ رکھ دیا میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شیر جنگ ابھی زندہ ہے انسان طبعی موت سے مر نہیں جاتا صرف اس کا مٹی کا بت مٹی میں دفن ہوتا ہے وہ خود تو اپنے بچوں کے وجود میں زندہ رہتا ہے میری بات سمجھ رہے ہو نا! مجھے احساس ہے کہ تمھاری تعلیم ادھوری رہ گئی ہے ایک راستہ بند ہوتا ہے تو سفر رک نہیں جاتا ایسے میں نئے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں چھوٹی سی نالی میں بہنے والا پانی اگر چلتا رہے تو یہ پہلے نالے میں اور

پھر دریا میں اُتر جاتا ہے۔اور ایک روز سمندر کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے۔کوئی پتھر اس کا راستہ روکے تو وہ نیا راستہ بنالیتا ہے ہمت چھوڑ کر اگر رک جائے تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے مادی چیزوں اور چلنے پھرتے انسانوں کے رویے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں صرف ان کی شناخت اپنی اپنی ہوتی ہے"

میں بہت دیر تک بڑے غور سے نقوی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔

"relay ریس میں کھلاڑی ٹریک پر دوڑ کر جب اپنا راؤنڈ مکمل کرتا ہے تو baton دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ بیٹا! اب دوسرا راؤنڈ تمھارا ہے۔Baton اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔شاید تم اس کے لیے تیار نہ ہو مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔حالات اور مجبوریاں بڑی کٹھور اور سنگ دل ہوتی ہیں ایک صورت یہ ہے کہ تم گاؤں چلے جاؤ مگر تم وہاں جا کر گاؤں کی مٹی میں مل جاؤ گے یہاں اگر رکتے ہو تو۔۔ daily wages میں تمھارا نام ڈال دیتا ہوں تم میرے ساتھ ٹرالی پہ رہنا۔

میٹرک کے Result کے بعد تم کو چابی والاں میں رکھوا دوں گا اور پھر تم P.A مستری ہونے کے بعد جب سلیکشن گریڈ میں جاؤ گے تو میں تم کو والٹن بھجوا دوں گا اور پھر تم سب انجینئر ہو جاؤ گے۔"

"میں نے کہا ناں قطرے کا سفر سمندر تک بہت طویل اور تھکا دینے والا ہے مگر میں نے نالی کے پار والی چوکی میں تمھارے لیے ایک کوارٹر خالی کر دیا ہے۔سوچ لو فیصلہ کر لو اور کل مجھے بتا دینا۔

نقوی صاحب نے خوابوں کی ایک گٹھڑی باندھ کر میرے سر پہ دھر دی۔ میں سلام کر کے واپس مڑا اور بھاری قدموں سے بنگلے سے نیچے آتی پتھر کی سیڑھیاں اترنے لگا میرے گھر کے سامنے نئے ہیڈ ٹرالی مین ملکو چاچا کا سامان پڑا تھا۔ میں نے رات کی چادر اوڑھ لی اپنی منجی پیڑھی اٹھائی ماں کو ساتھ لیا اور نالی کے اس پار مٹر وکے بازو میں بغیر کھٹکا کیے جا دفن ہوا۔کیا سوچتا کیا فیصلہ کرتا سوچ کی سکرین پر صفر کی ایک طویل قطار تھی اور میں اس قطار میں تنہا کھڑا تھا۔خوابوں کی گٹھڑی میں نے اتار پھینکی اجی کے پتھر یلے پاؤں میں نے پہن لیے ٹھیلے کی ہتھی تھام لی اور ٹریک کے ایک بے خواب سفر پہ روانہ ہو گیا۔

(مشمولہ افسانوی مجموعہ بے خواب سفر ۲۰۰۱۲ء)

نام	پروین ثروت
قلمی نام	نغمہ آغا
ولدیت	آفتاب احمد
پیدائش	یکم مارچ ۱۹۴۴ء
جائے پیدائش	کان پور
تعلیم	بی اے

نغمہ آغا معروف محقق اور مورخ آغا عبدالغفور کی اہلیہ ہیں۔ان کا خاندان تقسیم کے بعد پاکستان آ گیا تھا۔شروع میں روال پنڈی اور پھر حسن ابدال کیمبل پور اٹک میں مستقل سکونت اختیار کی۔

ابتدائی تعلیم راوال پنڈی سے حاصل کی۔میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول باغ سرداراں روال پنڈی سے ۱۹۶۴ء میں کیا۔

اس کے بعد ومن کالج روال پنڈی میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا لیکن دوران تعلیم ۱۹۶۵ء میں ان کی شادی ہوگئی۔شادی کے بعد انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا، ایف اے اور پھر بی اے کے امتحانات پاس کیے۔

شعروادب کا شوق انہیں بچپن سے ہی تھا۔اسکول میں بزم ادب کی رکن تھیں۔اسی عرصہ میں انہوں نے لکھنا شروع کیا۔

پہلی کہانی روز نامہ ''تعمیر'' روال پنڈی میں چھپی تھی۔کالج کے میگزین میں بھی ان کی نظم ونثر شائع ہوئیں۔شروع میں پروین ثروت کے نام سے کہانیاں لکھتی رہیں بعد میں نغمہ آغا کے نام سے تعمیر، اردو ڈائجسٹ، نوید بہار اور بتول وغیرہ میں لکھا۔بچوں کے لیے بھی مختلف رسائل میں لکھتی رہیں۔

احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مستور وغیرہ کو پڑھا۔علاوہ ازیں ریڈیو پاکستان روال پنڈی کے پروگرامز میں شرکت فرمائی اور نظم ونثر پڑھی۔دو درجن کے قریب کہانیاں چھپ چکی ہیں لیکن ابھی تک کوئی

کتاب منظر عام پر نہیں آ سکی۔

تعلیمی میدان میں حسن ابدال ایک پرائیویٹ ادارے حرا ماڈل اسکول میں پندرہ سال تک پرنسپل کی خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ اپنے علاقہ میں سیاسی و سماجی خدمات بھی طویل عرصہ انجام دیں۔ ن لیگ کے پچھلے دور میں بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئیں بعدازاں جنرل پرویز مشرف دور میں حسن ابدال کی ایک یونین کونسل سے جنرل کونسلر بنیں پھر میجر طاہر صادق کے پینل سے منتخب ہو کر ضلع کونسل اٹک کی ممبر رہیں۔

زرد پتا

نغمہ آغا

اس نے اپنے زرد چہرہ پر نظر ڈالی،اوہ کتنا کمزور ہوگیا ہوں۔۔۔کتنا زرد رنگ ہوگیا ہے میرا ۔۔میرے ساتھی کتنے خوش ہیں۔۔۔گلوں کے ساتھ رہ کر مغرور بھی تو ہوگئے ہیں۔۔۔لیکن نہیں مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔کوئی وقت تھا جب میں بھی جوان تھا۔میں بھی دوسرے پتوں کی طرح قہقہے لگاتا تھا۔آج۔۔۔آج میں اپنے جیون کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں سانس کی نازک ڈور کا تعلق جسم کا ساتھ چھوڑ دے،خزاں رسیدہ پتے کا اعتبار ہی کیا۔

کیا خبر کسی وقت بادصرصر کے تند جھونکے مجھے اس شاخ سے جدا کر کے اپنے ہمراہ اڑا لے جائیں۔

اوہ۔۔زندگی اور موت کا سنگم بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔۔۔زندگی کے یہ آخری لمحات مجھے بھی کتنے خوبصورت نظر آرہے ہیں۔آج تو چاندنی کا سوگوار حسن بھی کتنا بھلا معلوم ہورہا ہے۔۔۔اور۔۔اور یہ آبشار کتنے پیارے انداز میں گنگناتا ہوا گر رہا ہے۔۔۔اور تھوڑے ہی فاصلے پر ہے مجھ سے۔۔۔آہ۔۔۔اس کی آواز میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جارہی ہے۔۔۔آج سے پہلے جب اس کا شور میری نیند میں مخل ہوتا تھا تو مجھے کتنا غصہ آتا تھا۔لیکن آج اس رات کے پر ہول سناٹے میں جب مجھے الوداعی نغمات سناتا پتھروں سے ٹکراتا۔۔۔جھاگ اڑاتا بہتا چلا جارہا ہے تو مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی ہے۔

اے آبشار۔۔۔تو کدھر کو جارہا ہے۔۔تیری بھی کوئی منزل ہے۔۔یا منزل کی تلاش میں رواں دواں ہے۔۔۔آہ میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے۔۔مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے یہ میری آخری رات ہو ۔۔اوہ۔۔۔تمام پھول اور پودے نیند میں مست ہیں۔یہ خزاں دیوی سے بے خبر زرد لباس پہنے پیلی چڑیا لہراتی ان تک پہنچ چکی ہے۔اور جس کا پہلا نشانہ میں بنا ہوں یہ سب کس قدر بے خبری سے سورہے ہیں اور میں نوحہ کناں ہوں۔۔۔لیکن انہیں علم نہیں۔۔۔کیا خبر جب یہ جاگیں تو اپنے آپ میں ایک زرد پتے کی

کمی محسوس کریں۔۔۔اور پھر کیا ہوگا۔ان پر کیا بیتے گی۔۔لیکن بعض اوقات کئی لوگ ایسی گمنامی کی حالت میں رہتے ہوئے دنیا سے اٹھ جاتے ہیں کہ کوئی ان کی کمی محسوس نہیں کرتا۔۔

اوہ۔۔میں کہاں گیا ہوں۔۔۔نہیں۔۔۔نہیں میں ان سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔۔۔میں ابھی کچھ دن اور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔وہ رونے لگا۔۔۔فضا سوگوار ہوگئی۔خزاں اس نوحے پر پریشان ہو گئی۔تارے جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگے۔۔۔

تمام پودے جاگ اٹھے۔ارے کون رو رہا ہے۔اور یہ زرد پتا۔۔۔اے بھیاء کیا ہوا۔کیوں رو رہے ہو۔۔کیا دکھ ہے تمہیں۔۔۔سب رونے کی وجہ جاننے کو بے تاب تھے۔

زرد پتے نے سر اٹھایا، آنسو پونچھے۔۔میرے ساتھیو۔۔۔!تم دیکھ رہے ہو۔۔میں کتنا کمزور ہو چکا ہوں۔۔اب میرا جسم زیادہ عرصہ اس شاخ کے سہارے زندہ نہ رہ سکے گا۔۔

یہ زندگی فانی ہے۔۔یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔۔۔۔لیکن مجھے تم سے اتنی جلدی بچھڑنے کا بہت دکھ ہو رہا ہے۔۔ہوا مجھے اڑا کر تم سے بہت دور لے جائے گی۔۔اس جیون میں پھر تم سے ملاقات نہ ہوگی۔۔تم سے کبھی نہ مل سکوں گا۔

اس کی آواز رندھ گئی۔۔تمام پتوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔۔وہ خاموش تھے۔شاید سوچ رہے تھے کہ ایک دن ان کا بھی یہی حال ہوگا اور پھر۔۔۔اسی لمحہ زبردست طوفان آیا۔۔۔تیز برفانی ہوئیں چلنے لگیں۔تمام بوٹے سردی سے کپکپا اٹھے اور وہ زرد پتا کانپ کر رہ گیا۔مجھے بچاؤ۔۔!

میرا جسم شاخ سے چھوٹ رہا ہے۔مجھے سہارا دو۔۔۔اے ہواؤ رک جاؤ۔۔خزاں دیوی مجھ پر رحم کرو۔۔مجھے تھوڑی سی زندگی بخش دو، چند لمحے اور۔۔۔ہوائیں چیخنے لگیں۔۔بادل گرجنے لگے۔،ہم بالکل تمہاری التجا نہیں سن سکتے۔۔۔یہ خزاں دیوی کا حکم ہے،اور اسی لمحے تمام بوٹے چیخ اٹھے۔بادل دیوتا۔۔ہوا سے کہیئے رک جائے۔۔۔ہمارے ساتھی کو چند لمحے اور جینے دے۔

خزاں دیوی زور سے گرجی نہیں نہیں۔۔۔کوئی رعائیت نہیں۔۔تم اس فانی دنیا سے زیست جاودانی حاصل کرنے کے تمنائی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔سب کو ایک اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔

پھر اس نے حکم دیا۔۔ہواؤ تیز ہو جاؤ۔۔۔آج کی رات بہت تاریک ہے۔۔۔اور بہت دور جانا

ہے۔۔۔بہت دور۔۔۔ہر چمن میں میری آمد کی خبر سنانی ہے۔اور اگلے لمحے شاں شاں کی آوازیں آنے لگیں۔۔زرد پتے کا جسم لڑکھڑایا الوداع۔!

میرے دوستو۔۔الوداع۔انکی آنکھوں میں آنسو تھے۔زرد پتا بولا ''میں تماری دیوی کو تمہارے لیے تلاش کر کے لاؤں گا'' اور پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔پتا شاخ سے الگ ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا ہواؤں کے دوش پر اڑنے لگا۔جانے کہاں۔۔۔کون سی گم کردہ منزل کی تلاش میں۔۔۔اور صبح جب طوفان تھما تو ایک زرد پتا ہی نہیں، بل کہ اس کے بہت سے جانثار ساتھی بھی اس کے پیچھے جا چکے تھے۔۔۔اور چمن ویران تھا۔

(سہ ماہی شناسا، جلد۲، شمارہ۲، ستمبر ۲۰۰۹ء حسن ابدال)
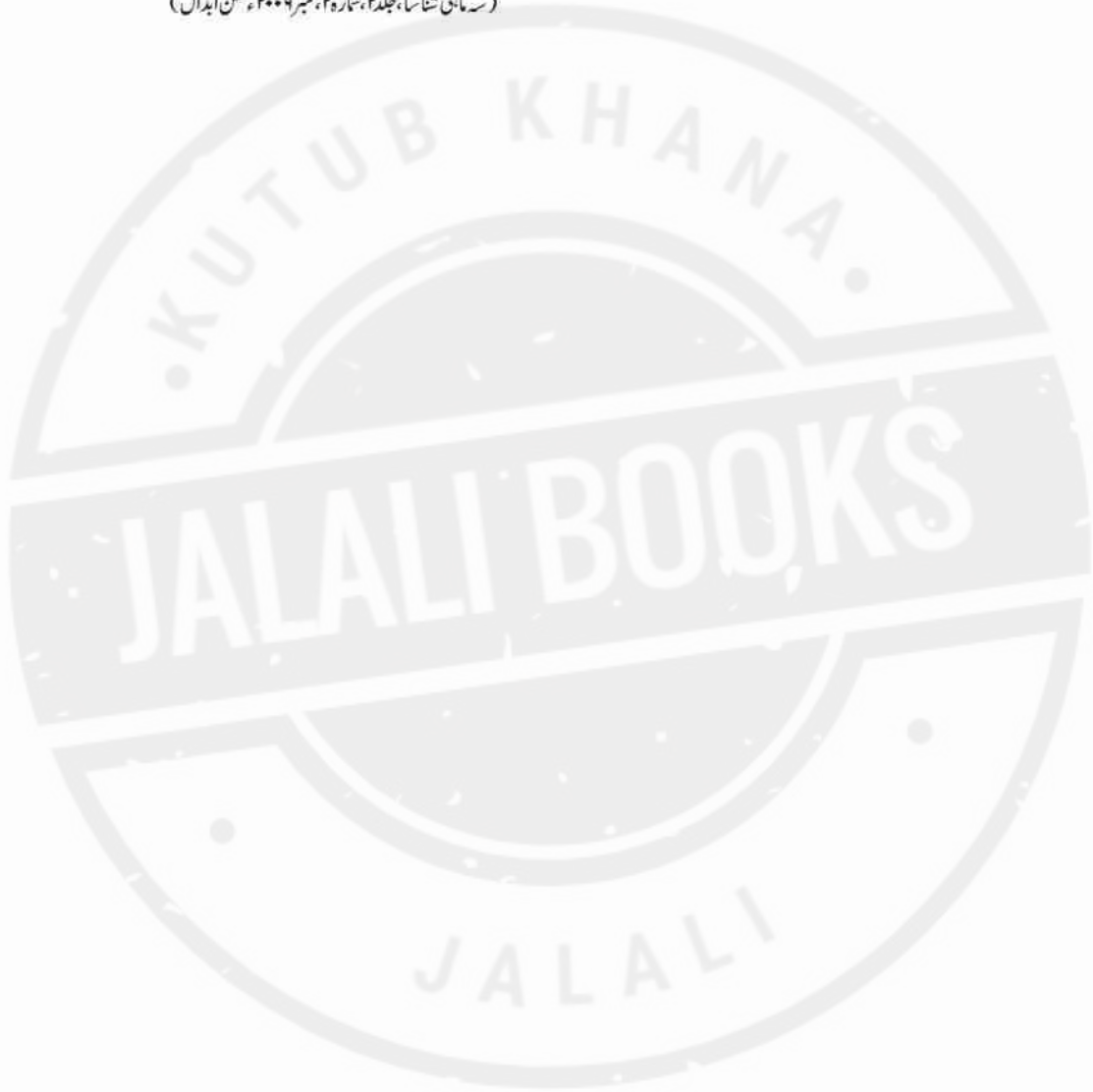
نام	احمد جاوید
ولدیت	غلام محمد
پیدائش	یکم جون ۱۹۴۸ء
جائے پیدائش	اکوڑہ خٹک
تعلیم	ایم اے (اردو)

معروف افسانہ نگار احمد جاوید کا تعلق اٹک کی تحصیل حضرو سے ہے تاہم ان کی پیدائش اکوڑہ خٹک میں ہوئی۔ اٹک شہر میں ان کی رہائش محلّہ شیڈ میں تھی جہاں ان کا بچپن اور لڑکپن گزرا۔ ابتداً ان کے نانا نے انہیں گورنمنٹ مڈل سکول میں داخلہ دلوایا لیکن گھر سے دوری کی بنا پر جلد ہی ان کا نام وہاں سے خارج کروا کر گھر کے قریب اصطبل بازار میں واقع گورنمنٹ پرائمری سکول نمبر ۳ میں داخل کرا دیا گیا جہاں انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک تک گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول اٹک میں زیرِ تعلیم رہے اور ۱۹۶۴ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ احمد جاوید کی ادبی تربیت کا آغاز اسی سکول سے ہوا اور انہیں سکول ہذا کی مجلسِ ادب کے جنرل سیکرٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا یہی نہیں زمانہ طالب علمی میں انہیں موسیقی سے بھی علاقہ رہا۔ یہاں ان کے قابلِ ذکر اساتذہ میں غلام حسین شبنم، دین محمد اور رواؤ رشید شامل ہیں۔

میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج اٹک میں داخلہ لیا یہاں انہوں نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی اس دورانیہ میں کالج کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ رہے، علاوہ ازیں پنجابی مجلس کے صدر بھی رہے اور پنجابی میں شعر گوئی کے ساتھ اردو افسانہ نگاری بھی کی ان کا کلام اور افسانے کالج کے مجلّہ ''مشعل'' میں شائع ہوئے بعد ازاں ان کی تحریریں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ''مشعل'' کے گولڈن جوبلی نمبر کے انتخاب میں شائع کیں۔ احمد جاوید نے ۱۹۶۹ء میں بی اے کیا ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۵ء میں گورنمنٹ کالج اصغر مال راول پنڈی سے ملازمت کا آغاز

کیا۔تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ فیڈرل گورنمنٹ کالج ایچ۔نائن اسلام آباد سے پرنسپل ریٹائر ہوئے۔بعدازاں نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے بہ طور وزٹینگ پروفیسر منسلک ہوئے۔

احمد جاوید کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انہوں سیاسی ومعاشرتی مسائل اور مارشل لا کے جبر واستبداد کے خلاف علامتی انداز میں متعدد کہانیاں لکھیں اور ۷۰ کی دہائی میں افسانہ لکھنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔پاکستان کے علاوہ بھارت میں بھی ان کے افسانوں کو مقبولیت حاصل ہوئی انہوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ تنقید بھی لکھی۔متعدد سیمناروں میں بہ طور مندوب ومقالہ نگار شرکت کی قومی و بین الاقوامی جرائد میں علمی وادبی مضامین کی اشاعت کے علاوہ مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں بہ طور مصنف شامل ہیں۔انہوں نے نوجوان ادباء کی تربیت اور اردو کے فروغ کے لیے ادبی تنظیموں سے وابستگی کو اپنا شعار بنایا۔۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۰ء سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق راول پنڈی ۱۹۹۸۱ء تا ۱۹۸۳ء سیکرٹری حلقہ ارباب غالب راول پنڈی اور ۱۹۹۰ء کے بعد سے سیکرٹری اسلام آباد فورم رہے۔علاوہ ازیں ان کے افسانوں کے انگریزی زبان میں تراجم بھی کیے گئے۔۵ اپریل ۲۰۱۷ء کو انہوں نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

مطبوعات:

۱۔غیر علامتی کہانیاں (نافسانے) ۱۹۸۳ء

۲۔تیسری دنیا کا افسانہ (تنقید) ۱۹۸۲ء

۳۔چڑیا گھر (افسانے) ۱۹۹۷ء

۴۔گمشدہ شہر کی داستان (افسانے) ۲۰۰۲ء

۵۔رات کی رانی (افسانے) ۲۰۱۶ء

۶۔پچاس سال کا افسانہ (انتخاب) ۲۰۰۰ء

۷۔عبارت (پچاس سال کا ادب) ۲۰۰۰ء

۸۔دستاویز (انتخاب) ۱۹۸۷ء۔۱۹۸۶ء

کانچ کا شہر

احمد جاوید

شیشے کا مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔ پانی سے بھرا ہوا جس میں پھولوں کی پتیاں ہمہ وقت مہکتی رہتیں۔ ہم ایک چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں رہتے تھے۔ وہ میرا بچپن تھا۔ جب میں کوئی خواہش کرتا تو میرا باپ کڑھنے لگتا مگر میری ماں مسکراتی اور مجھے کہتی جب تم کوئی خواہش کرو اور جب تم کوئی خواب دیکھو، کوئی پھول کہیں سے توڑ کے لاؤ اور اس میں ڈال دو پھر اس کے شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھو اندر ایک ایسا شہر سا بنتا دکھائی دے گا جیسا تم نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا، بالکل ان کھلونوں جیسا کہ جن کی تم خواہش کرتے ہو۔ ہم نے عمر بھر یہی کیا۔ نسل در نسل اس کی حفاظت کی یہ پھول صدیوں سے ہمارے پاس محفوظ ہیں کچھ تم بھی ڈالو۔

نسل در نسل پھول مہکتے کیسے رہتے ہیں۔ تعفن کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اب سوچتا ہوں۔ تب اندر اک شہر دیکھتا تھا بالکل اپنی ماں کے خوابوں جیسا۔۔۔!

صبح ہوتی اور جب سارے لوگ کام کاج کو نکل جاتے، تب میری ماں اپنی گود میں کچھ تازہ پھول بھرتی اور رات کا دیکھا خواب بیان کرتی۔۔۔ وہ روز ایک ہی خواب دیکھا کرتی تھی۔۔ ایک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے، لوگ پھولوں کی مانند مہکتے تھے، دریاؤں میں شہد اور دودھ بہتا تھا بادل روئی کے گالے۔۔۔ بس کچھ ایسا ہی تھا، ایسا ہی رہا ہوگا۔۔ اب پورا کسے یاد۔۔۔!

وہ پھول تھے کہ خواب۔۔ خواب تھے کہ خواہشیں۔۔۔ اک شہر کہ میری نگاہوں میں رہتا۔ مگر ان دنوں وہ میرے خوابوں میں نہیں جا گتا تھا اور رات بیت جاتی، اس کے سوا معلوم نہیں اور کیا کیا آنکھوں کے پیچھے پرچھائیں کی طرح گزر جاتا، عمر ہی ایسی تھی۔ البتہ دن میں اس مرتبان کے پھول وہی ایک خواب بن کر مہکتے رہتے۔

پھر یوں ہوا کہ صرف مہک رہ گئی۔ مہک بھی کیا مرجائے ہوئے پھولوں کی باس کہ میری عمر آگے کو

سفر کرتی تھی اور میری ماں کی پیچھے کی طرف۔

برس بیت گئے اب نہ وہ گھر رہا، نہ وہ افراد، سب تتر بتر ہو گیا۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لفظ چنتا، چہرے دیکھتا بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے اندر باہر مختلف صورتیں دھارتا ادھر سے ادھر ہو گیا۔۔۔ کہ درمیان میں ایسی عمر پڑی کہ راتیں اور دن آپس میں گڈمڈ ہو جایا کرتے ہیں۔

خواب اور حقیقت میں فرق نہیں رہتا۔ کبھی خواب لگتا ہے اور کبھی حقیقت خواب۔۔۔ عمر کی اس راہداری میں اپنی آواز کی بازگشت میں بھی بڑی گونج اور دبدبہ ہوتا ہے۔ یہ لڑکپن کے دن ہوتے ہیں۔۔۔ میں جوانی کی دہلیز پر تھا۔

جوانی کی دہلیز پہ جب کبھی کبھار گئے دنوں کے نقوش سے گرد اڑتی تو خیال پیدا ہوتا کہ شاید مجھے کسی خوابوں کے شہر کی طرف سفر کرنا تھا۔ مگر کدھر؟ کس سمت؟ اور انہی دنوں میں ایک روز گلیوں اور سڑکوں پہ ہجوم دیکھے کہ جو اسی الجھن میں تھے۔

اس رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ اک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے تھے۔۔۔ اور اک خواب کہ سب کچھ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

اگلے روز میں نے وہ خواب جس سے بیان کیا وہ پریشان ہوا اور اپنی راہ لی۔ اس دن مجھے گئے دن یاد آئے اور میں نے گھر میں اس شیشے کے مرتبان کو تلاش کیا کہ جس میں کائی جمی تھی اور وہ متعفن ہوا تھا۔ میں نے اسے صاف کیا اندر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھیریں اور اسے پانی سے بھر دیا۔ اب سوچتا ہوں ایسا کیوں کیا۔

میری ماں کی خواہشیں خوب تھیں سو وہ پھول ڈالتی تھی اور پانی بھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور مہکتے رہیں۔۔۔ میرے خدشے میرے خواب ہیں۔۔۔ مجھے خواہشوں کے خواب کیوں نہیں آتے میں ہر رات تمنا سے سوتا رہا مگر وہی ایک خواب وہی ایک خدشہ۔۔۔ پھر ایک رات دیکھا۔۔۔

وہی ایک شہر کہ زمین و آسمان جس کے کانچ ایسے، پھر دیکھا کہ کچھ نو عمر ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے آسمان کو نشانہ کرتے ہیں پتھر زناٹے بھرتے جاتے ہیں چھنا کے کی آواز آتی ہے جیسے کرچی کرچی۔۔۔ پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہاتھوں میں بڑے بڑے ستون اٹھائے بھاگے آتے ہیں اور انہیں آسمان کے نیچے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے بچا رہے۔

میں اپنی بیوی سے اپنا خواب بیان کرتا ہوں۔۔۔گلی میں ہجوم ہے ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے میں آسمان کی سمت دیکھتا ہوں اک خوف کہ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

وہی دن بھلے تھے جب صرف خواہشیں تھیں خدشے نہ تھے۔میں کہتا ہوں اور میری بیوی کہتی ہے''تمہارے وہ دن بھی بھلے نہ تھے،تمہارے یہ دن بھی بھلے نہیں۔۔''

میں شیشے کے مرتبان میں دیکھتا ہوں وہ شہر کہیں بھی نہیں جو میری ماں کی آنکھوں سے آشکار تھا اور جسے اس نے نسل در نسل دیکھا۔

ہم کس شہر میں رہتے ہیں اور وہ شہر کہاں ہے۔۔۔؟میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے،میں اس سے کہتا ہوں اک پھول لاؤ اور اس شیشے کے مرتبان میں ڈالو۔۔۔مگر اسے وہاں کوئی شہر دکھائی نہیں دیتا۔

وہ دن اچھے تھے جب میں خوابوں کی خواہش کرتا تھا مگر وہ مجھ سے دور رہتے۔۔اب خوابوں کا تانتا بدھا ہے مگر یہ خدشے کہاں سے در آتے ہیں۔

میں اس آسیب کا کیا کروں کہ میرا بیٹا مجھ سے مختلف ہوتا جاتا ہے۔وہ خواہشوں کو خواب نہیں بناتا۔وہ شیشے کے مرتبان میں نہیں جھانکتا۔۔۔وہ کھڑکی سے باہر کود جاتا ہے۔۔۔کنکر پتھر اٹھا کر۔۔۔تب مجھے اپنا گھر شیشے کا لگتا ہے اور شہر اور اس کی گلیاں اور سارے گھر مگر اب جب وہ لوٹتا ہے تو مٹی دھول ہوتا ہے پریشان اور خستہ حال کہ اب تو ہجوم بھی اسے دکھائی نہیں دیتے کہ جو اس کے ہمراہ تھے۔کنکر پتھر اٹھائے۔۔۔

ایک صبح اس نے مجھے کہا کہ آج رات میں نے شہر کے تمام گھروں پہ تالے دیکھے۔۔گلیوں میں سناٹا تھا میں نے بہت صدائیں دیں مگر کچھ بھی نہ تھا یہ لوگ کیا ہوئے۔

میں ہنسا کہ خدشے تمہاری آنکھوں میں بھی در آئے۔میں نے بھی رات اسی طور بسر کی ہے۔اک شہر کہ کانچ کے درو دیوار اور کچھ لوگ کہ بھاری قدموں سے زمین پر دندناتے آتے ہیں۔چھناکا ہوتا ہے۔زمین شق ہوتی چلی جاتی ہے۔۔۔نیچے ایک دلدل اور شہر کہ دھنستا جاتا ہے۔نیچے بہت نیچے۔۔۔لوگ ڈوبتے ہیں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔۔۔مگر بے سود کہ آسمان بھی کرچی کرچی۔۔کانچ کی بارش پھر۔۔۔آنکھ کھل جاتی ہے۔۔۔میں اسے آواز دیتا ہوں۔

میں کسے آواز دیتا ہوں کہ وہ اب بچہ نہیں ایک بچے کا باپ ہے۔اک درمیان میں کیسے نکل گئی

۔۔۔یہ کیا ہوا؟

(۲)

سفر پر نکلے ہوئے مسافر اپنے گھروں کے خواب دیکھتے ہیں۔ پھول ایسے چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہوں تو اندھیری راتوں میں آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر اندھیرا کروٹ لیتا ہے مگر خواب کا منظر دوبارہ نہیں کھلتا وہ گھر سے دور اپنے ننھے بیٹے کو یاد کرتا ہے جو اس وقت بے سدھ سوتا ہوگا۔ کیا معلوم وہ اب اس کی یادوں میں شامل ہے بھی یا نہیں مگر شروع کے دنوں میں وہ مچلتا ہوگا۔ سوتے سمے کسی ویرانی کا احساس بھی کرتا ہوگا۔ ان میں یارانہ بھی تو بلا کا تھا۔

شام ہوتے وہ اپنے گھروں سے نکلے، کھلے سبز ہزاروں پر ٹہلتے، سوال و جواب کرتے، سورج چھپنے، چاند نکلنے کا اسرار جانتے۔ ننھی منی نظمیں لہک لہک کر گاتے اور واپسی کے راستے سڑکوں کے کنارے دوکانوں پر جلتی بجھتی رنگین روشنیوں کا نظارہ کرتے واپس لوٹتے اور باغیچوں سے چنے ہوئے پھول اس شیشے کے مرتبان میں ڈال دیتے کہ جو پانی سے بھرا وہ اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

شیشے کا مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو اس کے باپ کو بہت عزیز تھا۔

(۱۹۸۰ء۔۱۹۷۰ء میں لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ گمشدہ شہر کی داستان میں سے)

نام	حامد حسین
قلمی نام	مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر
ولدیت	محمد اکرم بیگ
پیدائش	۲۹ اگست ۱۹۴۹ء
جائے پیدائش	کراچی
تعلیم	پی ایچ ڈی (اردو)

مرزا حامد بیگ کا اصل نام حامد حسین ہے ان کے آباواجداد کا تعلق علاقہ چھچھ کے ایک گاؤں کمالہ ضلع کیمبل پور (اٹک) سے ہے۔ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب معروف روحانی شخصیت حضرت جی بابا اٹکی سے جاملتا ہے۔ ان کے والد گرامی محمد اکرم بیگ سندھ پولیس سے ڈی۔ ایس۔ پی ریٹار ہوئے ۔سندھ میں قیام کے دوران ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی ولادت کراچی میں ہوئی۔ ان کا بچپن اور لڑکپن زیادہ تر سندھ میں گزرا اور ابتدائی تعلیم سے ایف۔ اے تک ضلع دادو، حیدر آباد نواب شاہ اور سکھر کے تعلیمی اداروں سے حاصل کی تاہم اس دوران وہ سیالکوٹ اور اپنے آبائی علاقہ کے ایک قصبہ شمس آباد میں بھی ایک سال تک پڑھتے رہے۔ میٹرک انہوں نے ۱۹۶۶ء میں ڈی سی ہائی اسکول نواب شاہ سے کیا۔ ۱۹۶۸ء میں اسلامیہ کالج سکھر سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کیمبل پور تشریف لے آئے اور گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور (اٹک) سے ۱۹۷۱ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۷۲ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ایم۔ اے اردو کیا۔ ۱۹۷۶ء میں ''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ کالج کی سطح پر بیڈمنٹن کھلتے رہے موسیقی اور فنِ مصوری سے بھی علاقہ رہا۔ فلم بینی کا ذوق وشوق انہیں بچپن سے تھا اس شوق نے انہیں فلم انڈسٹری تک پہنچا دیا اور کچھ عرصہ گل فلم کارپوریشن لاہور میں بہ طور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کیا۔ علاوہ ازیں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے لکھا اور اپنے لکھے ہوئے بعض ٹیلی ڈراموں میں

اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔انہیں حلقہ ارباب ذوق کے شریک معتمد ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔
ملازمت کا آغاز انہوں نے گورنمنٹ ڈگری کالج مری سے بہ طور لیکچرر ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں کیا اس سے قبل وہ فروری ۱۹۷۴ء سے اکتوبر ۱۹۷۴ء تک پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ریسرچ سکالر رہے۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں ان کا تبادلہ گارڈن کالج راول پنڈی ہوا مارچ ۱۹۸۹ء کو وہ بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاون راول پنڈی میں آ گئے۔ جولائی ۱۹۹۲ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجوئٹ کالج اٹک تشریف لے آئے یہاں تقریباً چار سال تک اسسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دیں بعد میں ۱۹۹۸ء تک بہ طور ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں اسی عہدے پر پوسٹ گریجوئٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور تبادلہ ہوا جہاں بعد میں بہ طور پروفیسر اور ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ اگست ۲۰۰۹ء تک خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۷۸ سے تا حال مختلف اوقات میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد، پشاور یونی ورسٹی اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے ایم فل و پی ایچ ڈی لیول کے نگران اور خارجی ممتحن رہے۔ اردو کے بے شمار ملکی و غیر ملکی سیمناروں میں بہ طور مندوب و ریسرچ اسکالر شرکت کی۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں پہلا افسانہ لکھا جب ساتویں جماعت میں صوبہ سندھ میں تھے لیکن ۶۰ کی دہائی میں خود کو متعارف کرایا اور ۷۰ کی دہائی میں بہ طور علامتی افسانہ نگار اپنی شناخت بنائی تاہم انہوں نے دیگر علامتی و تجریدی افسانہ نگاروں سے جداگانہ اسلوب اختیار کیا جس سے وہ جدید افسانے میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی شخصیت وفن پر مقالے لکھے گئے انڈو پاک کے ایک درجن سے زائد علمی و ادبی جرائد ان پر خصوصی شمارے شائع کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک ناول ناول ''انارکلی'' شائع ہو کر ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

اعزازات:

۱۔ سول صدارتی ایوارڈ (تمغہ امتیاز) گورنمنٹ آف پاکستان (۲۰۱۰ء)
۲۔ پاکستان رائٹر گلڈ ایوارڈ برائے چھاچھی افسانوی مجموعہ ''قصہ کہانی'' (۱۹۸۴ء)
۳۔ نیشنل بک کونسل پاکستان ایوارڈ برائے افسانوی مجموعہ ''گناہ کی مزدوری'' (۱۹۹۱ء)
۴۔ نیشنل بک کونسل پاکستان ایوارڈ برائے تحقیقی کتاب ''مصطفیٰ زیدی کی کہانی'' (۱۹۹۳ء)

مطبوعات:

(افسانے)

۱۔گمشدہ کلمات، خالدین لاہور (۱۹۸۱ء)

۲۔قصہ کہانی (افسانے چھاچھی بولی) پنجابی ادبی بورڈ لاہور (۱۹۸۴ء)

۳۔تار پر چلنے والی، الیس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راول پنڈی (۱۹۸۴ء)

۴۔گناہ کی مزدوری، ابلاغ آئی ٹین فور اسلام آباد (۱۹۹۱ء)

۵۔حمیدہ کی کہانی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد (۱۹۹۲ء)

۶۔لاکرز میں بند آوازیں (ہندی افسانے) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی بھارت (۲۰۰۱ء)

۷۔جانگی بائی کی عرضی، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد (۲۰۱۱ء)

(تحقیق وتنقید)

۸۔افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور (۱۹۸۱ء)

۹۔ تیسری دنیا کا افسانہ، خالدین لاہور (۱۹۸۲ء)

۱۰۔اردو اور صوفی ازم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۶ء)

۱۱۔عزیز احمد: کتابیات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۶ء)

۱۲۔ترجے کا فن: نظری مباحث، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۷ء)

۱۳۔سفرنامے کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۷ء)

۱۵۔کتابیات تراجم: نثری ادب، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۷ء)

۱۶۔مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۸ء)

۱۷۔اطالیہ میں اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۹ء)

۱۸۔اردو افسانے کی روایت اکادمی ادبیات اسلام آباد (۱۹۹۱ء)

۱۹۔اردو کا پہلا افسانہ نگار، راشد الخیری اکیڈمی کراچی (۱۹۹۲ء)

۲۰۔مصطفیٰ زیدی کی کہانی، گورا پبلشرز لوئر مال لاہور (۱۹۹۳ء)

(مقالات)

پولیمر پبلشرز اردو بازار لاہور (۱۹۹۴ء)

۲۱۔ نرناری، کلاسیک دی مال لاہور (۱۹۹۵ء)

۲۲۔ نسوانی آوازیں، سارنگ پبلشر لاہور (۱۹۹۶ء)

۲۳۔ میر امن دلی والے، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۹۸ء)

۲۴۔ ٹی ایس ایلیٹ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد (۱۹۹۹ء)

۲۵۔ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، کلاسیک دی مال روڈ لاہور (۱۹۹۹ء)

۲۶۔ عالمی کلاسیک: لیکچرز، اورینٹ پبلشر لاہور (۲۰۰۰ء)

۲۷۔ شاہکار اردو افسانے الحمراء پبلشنگ اسلام آباد (مرتبہ ۲۰۰۰ء)

۲۸۔ باغ و بہار (مرتبہ) اردو سائنس بورڈ دی مال لاہو (ر۲۰۰۴ء)

۲۹۔ اردو ادب کی شناخت، اورینٹ پبلشر لاہور (۲۰۰۷ء)

۳۰۔ ظواہر السرائر، اردو سائنس بورڈ لاہور (۲۰۰۷ء)

۳۱۔ اردو ترجمے کی روایت، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد (۲۰۱۳ء)

ادارت

''لفظ'' خاص شمارہ صد سالہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور (۱۹۷۲ء)

''لفظ'' خاص شمارہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور (۱۹۷۳ء)

''گورڈونین'' اقبال نمبر گورنمنٹ گارڈن کالج راول پنڈی (۱۹۷۷ء)

''گورڈونین'' سالانہ شمارہ گورنمنٹ گارڈن کالج راول پنڈی (۱۹۸۱ء۔۱۹۷۹ء)

''گورڈونین'' خاص نمبر گورنمنٹ گارڈن کالج راول پنڈی (۱۹۸۲ء۔۱۹۸۱ء)

''اورنگ'' گولڈن جوبلی نمبر گورنمنٹ ڈگری کالج سٹلائٹ ٹاون راول پنڈی (۱۹۹۰ء)

''مشعل'' گولڈن جوبلی نمبر گورنمنٹ پوسٹ گریجوئٹ کالج اٹک (۱۹۹۸ء۔۱۹۹۷ء)

''گل بکاولی'' خاص نمبر مطبوعہ لاہور (۲۰۰۲ء)

زمین جاگتی ہے

مرزا حامد بیگ

اندھیرا بڑھتا جارہا ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔

''سن رہے ہو، کنوئیں میں چلتے پانی کی آواز آرہی ہے، جیسے دریا بہتا ہے۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سُنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں ایک بار پھر اندھے کنوئیں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں اگر بہت جلدی بھی پہنچیں تو ادھی رات سے پہلے کیا پہنچیں گے۔''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔اُن کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھیں ہیں۔

تو کیا تمہیں یقین ہے، انہیں دو ایسے آدمی مل جائیں گے، میرا مطلب ہے جن پر بھروسہ کیا جا سکے؟

''اور جو بعد میں الجھیں نہیں۔دوسرے نے بات مکمل کر دی۔

''ہاں جو بعد میں الجھیں نہیں، مجھے تو مشکل نظر آتا ہے۔''

''اور اتنی لمبی رسی۔۔۔۔لیکن ہم، میرا مطلب ہے۔''

وہ آنکھ جھپکتا ہے۔

پھر دونوں تیزی سے آنکھیں جھپکتے ہیں۔

''کیا رسی اور آدمیوں کے بغیر اس میں نہیں اترا جا سکتا؟''

وہ تو یہی کہتے تھے، پر ہم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔

''اور وہ رسی اور آدمی لینے چل پڑے۔''

دونوں ہنستے ہیں۔ پہلے کے قہقہے میں دوسرے کی آواز دب جاتی ہے اور اس کے بعد دوسرے کا قہقہہ بہت بلند ہوتا ہے۔ پھر یک دم دونوں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

''تو پھر؟'' دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔

''لیکن یہ ہے بہت گہرا، دن کے وقت بھی پانی نظر نہیں آتا۔''

کنویں میں جھانک کر کنکرا چھالتا ہے، اور دونوں ایک بار پھر منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''حیرت ہے۔''

''بس یہی تو بات ہے، جس پر دل میں ہول اٹھتا ہے۔''

''شاید گہرائی زیادہ ہونے کی وجہ آواز نہیں آتی۔''

''گہرائی زیادہ ہو تو آواز زیادہ آتی ہے، چھوٹا سا کنکر بھی گھن سے بولتا ہے۔''

تو پھر کیا بات ہے؟

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔''

دونوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ کنویں سے مدہم آواز رُک رُک کر آ رہی ہے، جیسے پانی چل رہا ہو۔

''میرا خیال ہے یہ آواز پانی کی نہیں ہے۔'' پہلے نے ایک بار پھر بات چلائی۔

''پانی نہیں ہے تو بس آنا جانا ہی ہوگا۔''

''اور اگر پانی ہوا؟''

''تو کنکر پتھر آواز کیوں نہیں دیتے۔''

دوسرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

آواز مسلسل آ رہی ہے۔

''پھر؟'' دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔

پہلا کوئی جواب نہیں دیتا اور کنوئیں میں اترنے لگتا ہے۔

''تم بھی آؤ، ذرا احتیاط سے، کنواں بہت پرانا ہے، پاؤں پھسل جاتا ہے۔''

''لیکن۔۔۔۔'' دوسرا اترنے میں تامل کرتا ہے۔

پہلا اب کنوئیں میں پھیلی سیاہی کا حصہ بن چکا ہے، اوپر سے دیکھنے پر نظر نہیں آتا۔

''چلے آؤ''۔۔۔۔پہلے کی آواز کنوئیں میں گونجتی ہے۔

''وہ آ گئے تو۔۔۔''دوسرا بات مکمل کرتا ہے۔

''وہ آ گئے تو۔۔۔وہ آ گئے تو؟'' آواز کی گونج ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔دوسرا جو کائنات کا ایک حصہ ہے، محض ایک نقطہ۔۔۔وہیں مبہوت کھڑا ہے۔

پہلا نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔بوسیدہ اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چلی ہیں۔وہ آہستہ آہستہ پیر جما کر رکھ رہا ہے۔

اب کنوئیں میں سناٹا ہے اور صرف اس کے نیچے اترنے کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔

''پانی۔۔۔پانی۔۔۔بند۔۔۔۔ہو گیا۔'' کنواں اس کی آواز پر گونج اٹھتا ہے۔

یکا یک وہی آواز ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے۔پانی چلنے کی آواز، جس میں پہلے کی آواز کی گونج شامل ہے۔کچھ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔

جب دوبارہ سناٹا چھا گیا تو دوسرے نے اسے پکارا۔۔۔۔جواب میں اس کو اپنی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔وہ اسے پکارتا چلا جاتا ہے، لیکن کوئی جواب نہیں آتا۔

کنوئیں میں بہت نیچے دھول ہی دھول ہے۔اس کا دم گھٹتا۔

کچھ دیر بعد دوسرے کے پاؤں جیسے زمین سے ٹکراتے ہیں اور اس کے ہاتھوں میں پہلے کا ہاتھ آ جاتا ہے، اوپر کو اٹھا ہوا۔کنوئیں کی تہہ میں چاروں اطراف میں دھول مٹی ہے، درمیان میں صرف اس کا ہاتھ ہے جو کہنیوں تک بھربھری مٹی میں دبا ہے۔

اب کنوئیں میں مکمل خاموشی ہے، دوسرا اُوپر آنے کی سکت نہیں رکھتا، اور جیسے پانی کی آواز ایک بار پھر آنے لگی۔

باہر ویسا ہی سناٹا ہے۔وہ واپس آ رہے ہیں۔

اب وہ دو نہیں چار ہیں۔۔۔۔چاروں دیر تک انہیں تلاش کرتے ہیں۔کنوئیں میں جھانکتے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے کی نظریں ٹکراتی ہیں، پانچواں اور چھٹا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم چار آدمی کچھ نہیں کر سکتے۔'' تیسرا ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

''ہمارے پاس رسی تو ہے ہی، بس دو اور آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔ہم میں سے دو کو نیچے اترنا ہوگا

اور باقی چار باہر رہیں گے۔

چوتھا بات مکمل کر دیتا ہے۔

پانچواں اور چھٹا یک زبان ہو کر: ''جو چیز اوپر لانی ہے خاصی بھاری ہو گی۔''

وہ چپ رہتے ہیں، پھر تیسرا جیسے بات ختم کر دیتا ہے۔

''سنا تو یہی تھا، یوں بھی سونے کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔''

اب پانچواں اور چھٹا دو قابلِ اعتبار آدمیوں کی تلاش میں شہر کی طرف جا رہے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی ہے۔

''سن رہے ہو، کنوئیں میں چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سُنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں کنوئیں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں اگر بہت جلد بھی پہنچے تو صبح۔''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔۔۔ان کی آنکھوں میں سانپ لہریے لیتا ہے۔

(ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء انتخاب افسانہ اردو ،اکادمی ادبیات)

نام احسان الٰہی
قلمی نام احسان بن مجید (برائے نثر)
احسان الٰہی احسن (برائے شعر)
والدیت عبدالمجید
تاریخ پیدائش ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء
مقام پیدائش فتح جنگ (کیمبل پور اٹک)
تعلیم ایف اے

احسان بن مجید کے آباواجداد کا تعلق کیمبل پور (اٹک) کی تحصیل فتح جنگ سے ہے، جہاں ان کی ولادت ہوئی۔ احسان بن مجید کی عمر جب ایک ڈیڑھ سال تھی تو ان کے والد بہ سلسلہ روزگار کیمبل پور (اٹک) شہر تشریف لے آئے جہاں ان کی پرورش و تعلیمی مدارج طے پائے۔

پرائمری سکول نمبر ۲ اٹک سے ۱۹۶۰ء، آٹھویں مڈل سکول، میٹرک پائلٹ سیکنڈری اسکول ۱۹۶۵ء میں اور ایف۔اے ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج (کیمبل پور اٹک) سے کیا۔

ادبی سفر کا آغاز زمانہ طالبِ علمی میں فنِ افسانہ نگاری سے کیا ان کی پہلی کہانی ''خوشی کے آنسو'' کے عنوان سے روز نامہ جنگ کے بچوں کے صفحہ میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ بہ قول احسان بن مجید اردو افسانے کے حوالے معروف افسانہ نگار وقار بن الٰہی سے متاثر ہیں۔ ان کی اس بات کا اندازہ وقار بن الٰہی سے نام کی مماثلت سے بھی لگایا جا سکتا ہے علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں بھی وقار بن الٰہی کا انداز اسلوب نمایاں ہے۔ ان کا شمار نہ صرف اٹک کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے بل کہ اردو افسانہ نگاروں کی مین سٹریم میں گردانے جاتے ہیں۔ ایک مدت سے ان کے افسانے پاکستان کے معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ شاید ہی اایسا کوئی جریدہ ہو جس میں ان کی کوئی کہانی شائع نہ ہوئی ہو۔ کئی موقر رسائل کے سال نامہ میں ان کی کہانیاں شامل کی جا چکی ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں ''روشنائی''

کے افسانہ صدی نمبر میں ان کی کہانی ''سفر رائیگاں'' کو شائع ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

شعر گوئی کا آغاز ۱۹۸۹ء میں کیا فتح جنگ کے معروف شاعر محترم شاکر بیگ ان کے استادِ سخن ہیں۔ فتح جنگ میں ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء قیام کے دوران انہوں نے شاکر بیگ سے اصلاح سخن لی۔ وہاں قیام کے دوران احسان بن مجید ادبی تنظیم حلقہ ارباب سخن سے بھی وابسطہ رہے۔

ابتدائی طور پر اٹک کی ادبی تنظیم ''قندیل ادب'' کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے رہے بعد ازاں ۲۰۰۱ء میں مرحوم وقار احمد آس نے اسی تنظیم کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں ایک بھرپور شام منائی جس میں اٹک کے بعض اہلِ قلم نے ان کی شخصیت و فن پر مضامین پڑھ کر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

''قندیلِ ادب'' کے علاوہ اٹک کی عہد ساز شخصیت مرحوم نذر صابری کی تنظیم ''محفلِ شعر و ادب'' ''کاروانِ ادب'' اور ''ترقی پسند تحریک اٹک'' کی اجلاسوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔

گزشتہ چند سال میں آپ کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

افسانہ و شعر گوئی کے علاوہ انہوں نے ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے جن میں ''علامتی افسانہ ایک بجھارت'' ''اردو افسانہ: چند پہلو'' ''شاعری میں سوچ کا کردار'' اور ''توارد کیا ہے'' ایسے چند مضامین'' ماہنامہ ماہِ نو'' اور'' روز نامہ نوائے وقت'' کے ادبی صفحوں کی زینت بنے۔ حال ہی میں نادرن یونی ورسٹی سے ان کی شخصیت و فن پر ایم فل کے مقالہ کی منظوری ہوئی۔

مطبوعات:

۱۔ موم کا پتھر (افسانے) ۲۰۱۲ء

۲۔ آنکھوں کے ساگر (افسانے) ۲۰۱۴ء

چق ماق

احسان بن مجید

مجمع بہت بڑا تھا، حدنظر تک کالے چٹے سر نظر آ رہے تھے۔ ہر چہرے سے ایک تجسس عیاں ہو رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے پوچھ رہا تھا ہم یہاں کیوں آئے ہیں، کس لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک شانے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ یوں ایک ہی سوال پورے مجمع میں گردش کرتے ہوئے ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

ایک لمحے میں کئی شانے اچکے اور اپنے مقام پر آ کر ٹھہر گئے صبح سے دو پہر ہوئی، پھر شام اور اب سرمئی اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ مجمع میں کھلبلی مچنے لگی۔ میں تو بیوی سے جلدی لوٹ آنے کا کہہ آیا تھا! ایک نے ساتھ کھڑے آدمی کے کان میں سرگوشی کی۔

میرا بیٹا ابھی ٹیوشن پڑھ کر واپس نہیں آیا تھا۔

میں بیمار ماں کی دوائی لینے گھر سے نکلا تھا کہ یہاں آ گیا! اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا تو کئی گردنیں اس کی طرف مڑ گئی تھیں۔

جنٹلمین سب آ چکے ہیں! ایک کرخت اور بھدی سی آواز فضا میں گونجی۔

یس سر! مجمعے کا مجمع ہمہ تن زبان ہو گیا تھا۔

سب لوگ پٹیاں اپنے ساتھ لائے ہیں! سوال کیا گیا۔

جی ہاں! ایک غوغا برپا ہوا۔

پٹیاں کس لئے! کسی نے بہ آواز بلند پوچھا۔

بلڈی فول! تمہیں کسی نے نہیں بتایا! آواز میں رعونت اور برہمی نمایاں تھی۔

کاٹن بھی سب کے پاس ہے، میرا مطلب روئی ہے! پھر پوچھا گیا۔

روئی کو کیا کریں گے! مجمع کے آخر میں کھڑے کسی شخص نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

یہ سٹو پڈ کون ہے! آواز میں گرج تھی۔

کئی ہزار چہرے اس کی طرف مڑے اوران چہروں پر کھدی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں اس نے اپنے جسم پر محسوس کیں ۔پٹیوں اور روئی کا سوچ کر اس کے ذہن میں جانے کتنے ہی زخمی چہرے ابھرے، کتنے خوبصورت جوان ایک بازو یا ٹانگ سے معذور نظر آئے ، کتنے ہی زمین پر لیٹے زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس تصور ہی سے کپکپا کر رہ گیا تھا۔

اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے !اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا کہ اس کے گرد کئی ہزار بازوؤں کا حصار بن گیا، بے شمار ہاتھوں نے اس کی ٹانگیں جکڑ لیں۔

مجھے جانے دو!اس نے سب کی ساعت کی۔

پاگل بن گئے ہو، پچھتاؤ گے !لاکھوں ہونٹ ہلے تھے۔

کرنا کیا ہوگا!اس نے سب کے سامنے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے جیسے کچھ مانگ رہا ہو۔

تمہیں سوال کرنے کی بہت بری عادت ہے،سب کچھ بتا دیا جائے گا،کئی انگلیاں سیدھی ہوکر اپنے اپنے ہونٹوں کو چھوگئی تھیں۔

کب بتایا جائے گا،اوپر سے رات ہورہی ہے!وہ پھر منمنایا۔

او یار تم کس مٹی کے بنے ہو،کیوں ہماری بیڑیوں میں پتھر ڈالتے ہو،اور کوئی سوال کر رہا ہے جو تم ۔۔۔۔۔!اس کے کانوں میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

میرے پیارے لوگو! جانے یہ آواز کہاں سے آرہی تھی کہ سب پتھر کے ہو گئے تھے، گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

اب میں آپ کو نئی تہذیب سے روشناس کرانے چلا ہوں۔اگر چہ یہ آپ کا ملک ہے اس میں آپ کی تہذیب ہے، اپنی قدریں ہیں لیکن یہ سب صدیوں پرانی ہیں۔ دنیا میں نئی قدروں کا بول بالا ہو رہا ہے،

فرسودہ تہذیب کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں!اس سوال پر بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

بالکل ٹھیک!ایک قیامت خیز شور برپا ہوا تھا۔

تمہیں صدیوں کا سفر درپیش ہے، کیا اس سفر کے لئے تیار ہو! آواز نے مجمع سے تصدیق چاہی۔

تیار ہیں! لاکھوں بازویوں بلند ہوئے جیسے زمین سے بے شمار کھمبیاں اگ آئی ہوں۔

شاباش! آواز کی چاشنی میں گھلا زہر اسے اپنے حلق میں اترتا محسوس ہوا۔

اب اپنے ہاتھوں میں پکڑی پٹیاں سے ڈھانپ لیں۔

سب نے فوراً اپنی آنکھیں پٹیوں سے ڈھانپ لیں۔

آنکھیں چھن گئیں! اس نے سوچا۔

گ۔ ریٹ [گریٹ] یہ آواز جانے کہاں سے آتی تھی، اس نے چند بار پنجوں کے بل ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن آگے کھڑے طویل القامت شخص کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

روئی!!! مجمع سے کوئی سیانا بولا۔

آپ سب اچھے لوگ ہیں، روئی اپنے پاس رکھیں، اختتام سفر پر کام آئے گی۔ اب ہم سفر آغاز کرنے جا رہے ہیں، سفر طویل ہے اس لیے منزل تک پہنچنے کے لئے آپ کو میرے پیچھے بھاگنا ہوگا! آواز میں خوشامد کے ساتھ ہدایت بھی تھی۔

ریڈی۔۔۔۔ گو! آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی بازگشت چند لمحوں تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

اور پھر قیامت صغری برپا ہوگی۔ زندہ انسانوں کے ساتھ جیسے قبروں سے مردے بھی اٹھ کر بھاگنے لگے۔ وہ اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا، لوگ اس سے ٹکراتے ہوئے گزرتے رہے۔ اتنا غبار اٹھ رہا جیسے یہاں نیپام پھٹ گیا ہو۔ ایک اژدہام مغرب کی سمت روانہ ہو رہا تھا۔ آخری آدمی اس سے ٹکرانے لگا تھا کہ وہ راستے سے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی، وہ دیکھ رہا تھا۔ آخری آدمی بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ میدان میں تنہا رہ گیا۔

اس نے سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے بھیانک قہقہہ لگایا اور سرپٹ دوڑتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔ گھر کیا تھا، ایک کمرے کا مکان تھا جس میں چارٹین کے بکسے رکھے تھے اور تین چار پائیاں بان کی تھیں۔ اسی مکان میں اس کے تینوں بچے پیدا ہوئے تھے۔

معاشرے میں اس کا مقام ایک مزدور سے زیادہ نہیں تھا۔ دن بھر اینٹ گارا، اٹھانے کے بعد اسے جو معاوضہ ملتا اسی سے گھر کا سودا لینے کے بعد بچوں کے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور لے آتا کہ اسے دیکھتے ہی ان کی چونچیں بھی کھل جاتی تھیں۔ بیوی کے چہرے پر بھی آسودگی آجاتی۔ تھکن سے چور جسم وہ

چارپائی پر پھنکتا تو بان جیسے اس کے جسم میں کھبتے ہوئے اپنے نشان چھوڑ جاتا۔ بچے اس کے جسم پر کودتے ،اچھلتے تو اسے ایک راحت کا احساس ہوتا۔

بیوی اسے دیکھتے ہی کھانا لے آئی، بچے بھی اس کے پاس آ بیٹھے۔اس نے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی ۔بس نوالہ توڑتا، سالن کی تھالی میں ڈبوتا اور وہ چار دانت مارتے ہوئے حلق سے نیچے کہیں پھینک دیتا۔ بچے کھانا کھاتے ہوئے شرارتیں کرتے رہے لیکن بیوی کی نظریں اس کے چہرے پر خاموشی کی وجہ ڈھونڈتی رہیں۔

اس سے زیادہ اچھی زندگی کیا ہوگی، اس سے زیادہ خوبصورت تہذیب کہاں ہوگی، اس سے زیادہ اچھی قدریں کہاں ملیں گی! وہ زیرلب بڑبڑایا۔

کیا کہا! بیوی بچوں کو چھوڑ کر اسے پنکھا جھلانے لگی تھی۔ بچے شرارتیں کرتے سو گئے تھے۔

کچھ نہیں تم سو جاؤ اس نے کروٹ بدل لی۔

بے چارے آنکھیں ہوتے نابینا ہو گئے تھے، جانے کہاں پہنچے ہوں گے، راستے میں کئی بھوک پیاس سے مرکھپ گئے ہوں گے اور کئی ابھی تک دھکے ٹھڈے کھاتے دوڑ رہے ہوں گے، ان کے پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد پھٹ گئے ہوں گے، لباس تار تار ہو چکا ہوگا، سانس پھولی ہوئی ہوگی لیکن انہیں کہیں پڑاؤ کا حکم نہیں ملا ہوگا، انہیں جانا کہاں تھا اور جانے کیا کیا سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

ماں، آج بابا کو سونے دو، ان کی یہ عمر بوجھ اٹھانے کی نہیں، ہم جائیں گے کام پر! بیٹے ماں سے کہہ رہے تھے۔

اسے لگا جیسے بہت دور کچھ مرد آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ وہ فوراً بیٹھا۔ سامنے چارپائی پر تین مرد بیٹھے تھے۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی دونوں آنکھیں مسل ڈالیں۔غور سے دیکھا وہ اس کے اپنے بیٹے تھے ۔اسے اپنا سراپا عجیب لگ رہا تھا۔اس کے چہرے پر بالشت بھر سفید داڑھی تھی اور سر کے بال سفید ہو کر بڑھتے ہوئے کندھوں تک اتر آئے تھے۔

جسم لاغر ہو چکا تھا۔اس کی نظر چولہے کے پاس بیٹھی بیوی پر پڑی اس کے سر میں چاندی اتر آئی تھی۔

سٹاپ رک جائیں! جانے کتنی مدت کے بعد یہ آواز مجمع کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

میں بہت تھک گیا تھا! کسی کے منہ سے نحیف سے الفاظ نکلے۔

چپ اوئے! کسی دوسرے نے اسے جھڑک دیا۔ اس کا لہجہ بھی تھکا ہوا تھا۔

آپ خوش قسمت ہیں، آپ نے منزل پالی، آپ تمام لوگ نئی تہذیب میں پہنچ چکے ہیں، آپ کو میرا ممنون ہونا چاہئے ناں! آواز نے سوال کیا۔

جی ہاں، کیوں نہیں، ہم سب آپ کے ممنون ہیں! لیکن اب وہ شور نہیں اٹھا تھا۔

اب آپ لوگ نئی تہذیب دیکھنے کے لئے بے چین ہوں مگر اس سے پہلے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیں کہ اس کے بعد میری آواز آپ تک نہ پہنچ پائے گی! آواز ہدایت دے کر خاموش ہو گئی تھی۔

سب نے فوراً روئی کانوں میں دیتے ہوئے آنکھوں کی پٹیاں کھول دیں۔ چند لمحے انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بینائی بحال ہوتی تو سب جنگلی غاروں کے سامنے کھڑے تھے۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوفزدہ ہو گئے۔ سب کے چہروں پر کالی چٹی داڑھی بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی تھی، سر کے بال دھول سے اٹے ہوئے مگر شانوں تک اتر آئے تھے، لباس چیتھڑے بن گیا تھا۔

حد نظر تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ غاروں میں رہنے والے ان کو دیکھ کر حیران اس لئے ہو رہے تھے کہ یہ بھی کوئی ان جیسی ہی مخلوق ہیں لیکن اتنا لشکر آیا کہاں سے ہے۔ غاروں کے مکینوں نے اپنے جسم درختوں کے پتوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور کچھ مادر زاد ننگے گھوم رہے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے آپس میں کوئی بات کی تھی لیکن کوئی کسی کی بات نہیں سن سکا تھا۔

رات گہری ہونے لگی تھی۔ ایک بوڑھا جنگلی کہیں سے مردہ ہرن کھینچ لایا اور باقی سب اپنا اپنا چقماق لے اس کے گرد بیٹھے ہوئے آگ جلانے کی کوشش کرنے لگے۔ مجمع کے لوگ اپنا اپنا چقماق ڈھونڈنے سارے جنگل میں پھیل گئے۔

نام	احمد داؤد
ولدیت	شریف خان
پیدائش	یکم جون ۱۹۵۱ء
جائے پیدائش	راول پنڈی
تعلیم	ایم اے (پولیٹکل سائنس)

احمد داود کے آباؤاجداد ضلع اٹک کی سب تحصیل حضرو کے ایک گاؤں حمید کے باسی تھے۔نسلی طور پر پٹھانوں کے قبیلے دلزاک سے تعلق تھا۔ان کے والد شریف خان نے دو شادیاں کی ان کی پہلی بیوی علاقہ چھچھ ہی سے تھیں دوسری شادی انہوں نے ضلع ایبٹ آباد سے کی جس کے بعد انہوں نے موہن پورہ راول پنڈی میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں یکم جون ۱۹۴۸ء کو احمد داود کی ولادت ہوئی لیکن قومی شناختی کارڈ پر ۱۹۵۱ء درج ہے۔احمد داؤد کی والدہ شریف خان کی چھوٹی بیگم تھیں جن کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہی فوت ہو جاتے تھے۔منت کے بعد احمد داؤد کی ولادت ہوئی اور کسی کے مشورہ پر ٹونا آزمایا گیا اور پیدا ہوتے ہی انہیں کوڑے کے ڈھیر پر لٹا دیا گیا اور ٹونا اتار کر والدین کی گود میں ڈالا گیا اور سر پر بالوں کی لٹ چھوڑ دی گئی جو کئی سال تک رہی۔ان کے والد شریف خان علاقہ چھچھ میں دودھ کی سپلائی کیا کرتے تھے روال پنڈی آ کر بھی انہوں نے اس کام کو جاری رکھا۔

احمد داود نے کرسچن ہائی سکول راول پنڈی سے تعلیمی سفر کا آغاز کیا ان کے تعلیمی کیریر میں تھرڈ ڈویژن کا اہم رول رہا۔انہوں نے ۱۹۶۸ء میں تھرڈ ڈویژن میٹرک کیا پاس کی ۷۴۔۱۹۷۳ء میں اسی پوزیشن میں ایف اے کیا، ۱۹۸۷ء میں تھرڈ ڈویژن میں گریجویشن کی اور ۱۹۸۶ء پولیٹکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔احمد داود نے ملازمت کا آغاز ۱۹۷۵ء کو بہ طور پروف ریڈر نیشنل کونسل آف آرٹ اسلام آباد سے کیا تقریباً ایک سال بعد سکرپٹ رائٹر کا اضافی چارج بھی سنبھال لیا۔۱۹۸۱ء میں چند ماہ مستعفی رہنے کے بعد یہیں بہ طور پبلیکیشن آفیسر جوائن کیا بعد ازاں تا دمِ آخر بہ طور پی ۔آر ۔او اس ادارے

میں خدمات انجام دیں۔اس دوران انہوں نے ادارے کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی بے شمار کتب میں ادارتی وصحافی خدمات انجام دیں۔احمد داؤد نے سیاسی ومعاشرتی اور آمرانہ جبر واستبداد کے خلاف قلم اٹھایا اور جدید افسانوی پیرائے میں اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنی وفکری اپج سے بہترین ادب تخلیق کیا۔انہوں نے ۷۰ کی دہائی میں بہ طور افسانہ نگار خود کو متعارف کرایا۔ان کی کہانیاں انڈو پاک کے متعدد ادبی رسائل میں چھپتی رہیں تاہم ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''مفتوح ہوائیں'' اسلام آباد سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔جس نے ادبی حلقوں میں خوب دادِ تحسین سمیٹی۔اس سے قبل مارچ ۱۹۸۰ء میں احمد داؤد ''نئی بہترین کہانیاں'' کے عنوان سے افسانوں کا ایک خوب صورت انتخاب شائع کر چکے تھے۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دشمن دار آدمی'' تھا جو ۱۹۸۲ میں راول پنڈی سے شائع ہوا۔

افسانوں کے علاوہ انہوں نے ایک شاہکار ناول بھی تحریر کیا جو پہلے ''بستی'' کے نام سے انڈیا کے ایک معتبر رسالہ ''جواز'' میں شائع ہوا بعد ازاں بہ عنوان ''رہائی'' اسے ۱۹۹۱ء میں کلاسیک وژن اسلام آباد نے شائع کیا۔۱۹۹۴ء میں نثری نظموں کا انتخاب مرتب کیا، علاوہ ازیں کلاسیک کے دو شمارے بھی مرتب کیے۔احمد داؤد نے ریڈیو، ٹی وی اور سٹیج کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ان کا پہلا ریڈیائی ڈرامہ ''بینا نابینا'' تھا جو پروڈیوسر برکت اللہ نے ریڈیو پاکستان کے لیے لکھوایا تھا، اس کے بعد انہوں نے کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ان کے فن کو ہمسایہ ملک میں بہت پزیرائی ملی گوپی چند نارنگ، افتخار امام صدیقی، کرتار سنگھ دگل، اور جگتار سنگھ سے ان کے قریبی مراسم تھے۔احمد داؤد ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔انہیں موہن پورہ راول پنڈی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

ان کی وفات کے بعد ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''خواب فروش'' ان کے قریبی دوستوں کی کوشش سے ۱۹۹۶ء میں دوست پبلیکیشن اسلام آباد نے شائع کیا۔

مطبوعات: ۱۔نئی بہترین کہانیاں انتخاب)۱۹۸۰ء

۲۔مفتوح ہوائیں (افسانے)۱۹۸۰ء

۳۔دشمن دار آدمی (افسانے)۱۹۸۲ء

۴۔رہائی (ناول)۱۹۹۱ء ۵۔خواب فروش (افسانے)۱۹۹۶ء

گمشدہ مسافروں کی گاڑی

احمد داؤد

گاڑی کسی بھی وقت اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہے۔تب مسافروں کا ہجوم منتظر لوگوں کی آنکھوں کو تسکین بخشے گا۔

منتظر آنکھیں سلاخوں سے باہر پھیلی بے ترتیب چھتوں کو ٹٹولتی ہیں۔اندھیری رات میں دودھیا دھواں تیز سیٹی اور کتوں کی پکار آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ۔

منتظر آنکھیں سلاخوں کی قیدی ہیں اور کھلی کھڑکی سے آتی ہوا انہیں سلاتی ہے۔امید بندھاتی ہے،گلیاں سنسان،چوروں سے بے نیاز کہ چور زمانے بیتے قرون وسطی کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔اب چوروں کا دور نہیں کہ خالی گھر ہیں دلوں کی طرح،اجاڑ کرنس اور لفظوں کی تاثیر سے بے نیاز کتابوں کی طرح۔۔۔صرف انتظار کرتیں آنکھیں ہیں جو اسٹیشن پہ آنے والی گاڑی کی راہ میں پھیلی ہیں۔

وہ آنے والے مسافروں کا منتظر ہے۔

بد وضع بڑے بڑے بکسے اٹھائے پگڑیوں والے چکنے بالوں میں گرد پھنسائے ڈبوں میں چلم پیتے،نسوار کھاتے مسافر۔۔۔سوٹ میں ملبوس شہری،خوب صورت بریف کیس اٹھائے کلائی سے بندھی نفیس گھڑی سے وقت دیکھتے بے وقت مسافر،ٹائی کی شکن درست کرتے ہوئے بابو نیند میں مندھی آنکھیں اور تھکے جسم والی عورتیں جگراتے سے چور بچیاں ملاپ اور جدائی کے کردار آنے والے مسافر ہیں،جن کی راہ میں بچھا کھڑکی سے لگا۔۔،سلاخوں سے پرے دیکھ رہا ہے۔

وہ سب اس کے پراسرار شہر کے باسی ہیں۔۔۔!

اسٹیشن کافی دور ہے صرف اس نحیف بتیاں کسی بچھڑے ہوئے انجن کی چھک چھک یا کبھی سودا بیچنے والے کی آواز رات سیاہ گلیشیر سے نمودار ہوتی ہے۔تب منتظر آنکھوں کے سامنے جگنو چمکتے ہیں۔وہ انہیں پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے اور آگے سلاخیں ہیں،جن سے باہر اس کی کھلی ہتھیلیوں کے کناروں

سے رات پھسل پھسل جاتی ہے۔

سنسان گلی میں ہوا کا بولتا پھیرا آیا ہے وہ آنے والے مسافروں سے توجہ ہٹا کر گلی میں جھانکتا ہے، دن بھر بچوں کے قدموں تلے روندھی سسکیاں بھر رہی ہے۔ چاروں طرف کباڑ بکھرے پڑے تھے۔ پھٹا ہوا فٹ بال ٹوٹی ہاکیاں کانچ کی گولیاں پٹولے، پلاسٹک کے ٹوٹے برتن اور اخبار کے تازہ ضمیمے ہوا کی رسی سے بندھے کھڑکھڑاتے ہیں۔

وہ ان کے دائرے میں جھومر ڈالتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے۔۔۔سلاخوں سے جکڑی آنکھیں۔ان باغوں کی تلاش میں ہیں جہاں اس کا بچپن گذرا۔۔۔!

''کھلے میدانوں اور باغوں کے درخت کہاں گئے۔''

''میدانوں میں پلازہ اور مارکیٹیں بن گئی ہیں۔اور درخت فرنیچر کے۔۔کام۔۔۔''

''بکومت صحیح جواب دو۔''

''یہ تابکاری کے اثرات کا کیا دھرا ہے۔''

ہوا میں تابکار پھیل رہا ہے کھلی کھڑکی سے باہر نکلے ہاتھ کی کمزور ڈھلوانوں پر نیٹرون جھول رہا ہے، کسی بھی لمحے دھماکہ ہوسکتا ہے۔اور مسافروں کو لانے والی گاڑی خالی آئے گی۔

''سنا ہے نیٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شے سلامت رہتی ہے۔''

''آدمی کے علاوہ باقی شے کیا ہے؟''

''باقی کانچ کی گولیاں پٹولے، ٹوٹی ہاکیاں، اخباروں کے ایڈیشن۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں بھلا اتنی آسانی سے نیٹرون کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

اچھا۔۔۔۔''کوئی اور بات کرو۔''

اور بات تو آنے والے مسافر ہی کریں گے۔اپنے گاؤں کی باتیں گندم کی فصل کیسی رہی؟ دھتو لوہار کی کھوتی نے کس کا کھیت خراب کیا، گاؤں میں کوئی ہیر پیدا ہوئی کہ نہیں۔

''کہتے ہیں کہ جب کبھی کہیں ہیر کا ظہور ہوتا ہے تو ایک وارث شاہ جنم لیتا ہے۔''

''ارے یار۔۔۔۔۔اب تو ہیر جوانی سے پہلے ہی ریپ کر دی جاتی ہے۔''اور وارث شاہ فلم کے گانے گاتا ہے یا ہوٹلوں پہ پکھیاں مار کے چائے بناتا ہے۔''

''واقعی''

''ہاں ہاں''

''تیری تو مت ماری گئی ہے کوئی اور بات کرو۔''

''کوئی اور بات تو آنے والے مسافر کریں گے۔''

سوٹ میں ملبوس خوب صورت چمکیلے چمڑے والے بریف کیس اٹھائے نفیس گھڑیوں سے ٹائم دیکھتے بانکے فائلوں کے بوجھ تلے دبے بابو، پروموشن ڈیموشن کے قیدی پنشن خورے بوڑھی ہوتی بچیوں کے بابل دن بھر کی خبروں سے خوفزدہ مسافر، موندھی آنکھوں والے بچے لڑتی بھڑتی عورتیں اپنے بچپن اپنے پٹولوں کی باتیں سنائیں گی مگر کب۔۔؟ گاڑی کب آئے گی۔؟

سلاخوں سے باہر پھیلی آنکھیں گاڑی کی تیز سیٹی پہ الارہ کھاتی دھوئیں کے نرم ستونوں سے بغل گیر ہوتیں پیڑوں پہ بکھر جاتی ہیں۔

''ارے یار یہ تو مال گاڑی کی سیٹی ہے چلو واپس چلیں۔''

آنکھیں واپس سلاخوں کے اندر کمرے میں بیٹھے منتظر بشر کی پیشانی تلے دبک جاتی ہیں۔

''اوہو۔۔۔۔ یہ مال گاڑی سارا مال کہاں لے جاتی ہے، آج کل تو لوگ کم سفر کرتے ہیں اور مال زیادہ سفر کرتا ہے۔''

بھئی مال باہر بھی تو جاتا ہے تجارت بھی تو کرنی ہوتی ہے نا دوسرے ملکوں سے۔

''واپس یہ ڈبے خالی آتے ہیں۔''

''نہیں یار۔۔۔۔سوئیاں اور ٹینک لاتے ہیں۔''

''گندم اور کپاس دے کر۔''

''بالکل۔۔۔یار جمائیاں مت لو یہ سٹیشن ہے تمہارا گھر نہیں۔ پولیس والے شبہ میں دھر لیں گے۔''

''یار گاڑی کب آئے گی میں تو بور ہو گیا ہوں۔''

''بس چپ چاپ بیٹھو۔۔۔آ جائے گی۔''

سیٹی کی گونج اور سٹیشن کے پتھریلے میلے فرش سے اٹھتی باتوں کی سیلن بوکر کی بھاپ کے جلو میں اس تک آتی ہے۔ سلاخوں پہ زنگ لگاتی ہے۔ وہ ہاتھ اندر کر کے تھکی آنکھوں سے سہلاتا ہے اور بر بڑ بڑاتا

ہے---

''لوگ'' یہ لوگ آہستہ آہستہ دبی زبان میں گفت گو کیوں نہیں کرتے ان کی باتوں کے شور سے آنے والے مسافر تنگ ہوں گے۔

اس نے گہری سانس لے کر اسٹیشن کی طرف گھورا۔

''یہ گاڑی کب آئے گی۔''

''تمہارے کسی مہمان نے آنا ہے۔''

''مہمان سے بھی زیادہ۔''ماں اور بھابی آرہی ہیں۔مگر تم؟''

''میرے بھی اپنے آرہے ہیں۔مسافر سارے ہی اپنے ہوتے ہیں،ارے ساڑھے چار بج گئے۔چلو بابو سے پتہ کرتے ہیں گاڑی کا۔''

سلاخوں کے باہر پھیلی بے ترتیب چھتیں دور پرے اسٹیشن کی بتیاں اور نیچے گلی میں ردی چیزوں کی بکھری ڈھیریاں نالیوں کے کنارے پڑی گندگی اور سحری کا ابھرتا ستارہ آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے۔منڈیوں کے مزدور، ریڑھیوں اور دودھ والوں کی آوازیں اذان کی صدا اور کسی پرندے کی حمد، آنے والے وقت کا آئینہ ہیں۔

''اف اللہ کتنی خاموشی ہے۔''

''گاڑی جانے کے بعد سٹیشن قبرستان کی طرح خاموش ہوجاتا ہے۔''

''لیکن گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں-------بابو کیا کہتا ہے۔''

''اسے خود پتہ نہیں------اس کا اپنا بیٹا آرہا ہے۔''

''گاڑی تو کئی گھنٹے لیٹ ہے۔''

''اب تو صبح ہورہی ہے---انتظار کریں یا چلیں۔؟

''انتظار-----میں تو کئی دن سے آرہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں''

''میں خود-----کئی دن-----کئی رات------یار کہیں ہم---؟

''چپ رہو۔۔۔۔۔۔۔کل پھر آجائیں گے۔''

سلاخوں سے باہر پھیلی چھتوں پر بے اثر زخمی سحر کی دھیمی سرخی پر پھیلاتی ہے، پرندوں کے واویلے جاگتے شہر کے طشت پر لوگوں کی حرکتوں کا شور گلیاں آباد ہونے لگتی ہیں۔اسٹیشن سے آوازوں کا ریوڑ اس کی جانب بڑھتا ہے،اسٹیشن پہ گاڑی کھڑی ہے۔۔۔۔اندر سامان پھنکا جا رہا ہے، بکسے، حقے، جوتیاں ،ڈائجسٹ، بستر بند اور پانی کی خالی صراحیاں۔

مگر پانی پینے والے کہاں ہیں؟

''پانی پینے والے کہاں ہیں۔؟''

''یار سنا ہے کہ نیٹرون کے استعمال سے آدمی ختم ہو جاتا ہے۔باقی ہر شے سلامت۔۔۔۔!''

وہ سلاخوں کے خلا سے بانہیں نکال کر ہتھیلیاں ملتا ہے۔۔۔۔

منتظر آنکھیں، کھلے بازو اور فریادی ہتھیلیاں مسافروں کی تلاش میں ہیں۔

(پاکستانی نثری ادب، انتخاب ۱۹۴۷ء۔۱۹۸۰ء اکادمی ادبیات اسلام آباد)

نام	منظور علی شاہ
قلمی نام	علی تنہا
ولدیت	سید لال بادشاہ
ولادت	۱۸ اگست ۱۹۵۲ء (کٹی میانہ نوشہرہ)
آبائی قدیم گاؤں	حاجی شاہ ضلع کیمبل پور (راٹک)
تعلیم	ایم ۔اے (صحافت)

علی تنہا کے آباواجداد کا تعلق ضلع کیمبل پور (اٹک) کی صدر تحصیل اٹک سے چند کلومیٹر اور پشاور جی ٹی روڈ سے ملحقہ ایک قدیم تاریخی گاؤں حاجی شاہ سے ہے۔ تاہم ان کی ولادت کٹی میانہ نوشہرہ میں ہوئی ۔علی تنہا کے بچپن کا کچھ وقت گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں کھیل کود کر گزرا، اور ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی۔

۱۹۶۴ء میں ان کا خاندان مستقل طور پر خانیوال چلا گیا اور وہیں باقی ماندہ تعلیم جاری رکھی۔ ان کی آبائی زمینیں اور گھر اب بھی حاجی شاہ اٹک میں موجود ہے ان کی دیکھ بھال اور جائیداد کے قانونی معاملات کے سلسلہ میں وہ کئی بار اٹک آئے ،اس سلسلہ میں انہوں نے میرے توسط سے ایک دفعہ وقار احمد آس کی خدمات بھی حاصل کرنا چاہی تھیں بعدازاں ان کے فرزند اس سلسلہ میں ضلع کچہری اٹک آتے رہے۔ ان سے میرا رابطہ پہلی دفعہ ۲۰۰۷ء میں ہوتھا لیکن اس معاملہ میں ہمیشہ سست ثابت ہوا ہوں۔

۱۹۷۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے صحافت میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۹ء ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کی لی اور وہ ریڈیو پاکستان بہاولپور، ملتان اسلام آباد وغیرہ میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ملازمت کا آغاز انہوں نے بہ طور پروگرام پروڈیوسر کیا بعدازاں ترقی کرتے ہوئے کنٹرولر ہوم سروسز پاکستان براڈ کاسٹنگ ہیڈ کوارٹر اسلام آباد کام کیا۔

وہ جہاں بھی گئے اپنی مقامی بولی اور گاؤں کے ماحول اور تہذیب وثقافت کو ہمیشہ اپنی ذات کا حصہ

بنائے رکھا یہاں تک کے گھر میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مقامی بولی میں ہی گفت وشنید کرتے ہیں۔
علی تنہا جناب احمد ندیم قاسمی کے بہت نیاز مند تھے۔ حاجی شاہ اٹک کے علاوہ ان کا دوسرا گھر خانیوال میں ہے اور وہیں ان کا زیادہ قیام ہوتا ہے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا مستقل مسکن خانیوال ہی ہے۔
علی تنہا کا شمار اردو کے ممتاز اور جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ان کے افسانے پاکستان کے معتبر ادبی جرائد میں شائع ہونے کے ساتھ اردو کے غیر ملکی رسائل و جرائد میں بھی داد وتحسین حاصل کرتے رہے۔

۷۰ کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام جنہوں نے علامتی واستعاراتی انداز میں افسانے لکھ کر اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا، پاک وہند میں افسانوی ادب پر کئی ایسے انتخاب اور خاص شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں علی تنہا کے افسانے ہمیں اردو کے معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔
انہوں نے افسانہ کے علاوہ تنقید بھی لکھی ''میرا جی، منٹو اور اختر شیرانی تین جواں مرگ رجحان ساز لکھاری'' ''سرائیکی لوک موسیقی۔۔قدیم روایات سے آج کے عہد تک'' اور ''کئی چاند تھے'' ان کے مضامین کے عنوانات میں سے ہیں۔

مطبوعات:

ا۔کئی دنوں کا دن (افسانے)	سال طباعت ۱۹۸۵ء
۲۔سورج کے سب لوگ (افسانے)	سال طباعت ۱۹۹۸ء
۳۔مغرب کے آفتاب (تنقید)	سال طباعت ۱۹۹۷ء
۴۔ریت میں سونا (تنقید)	سال طباعت ۱۹۹۹ء
۵۔بھول کی گھنٹیاں (افسانے)	سال طباعت ۲۰۱۱ء

بادل کا باغ

علی تنہا

بوسے کے ذروں سے لدی گرم بھاری ہوا میں پسینے سے تر چہرے کو ببول کے پرانے درخت تلے رک کر اس نے صافے سے پونچھا۔ دیو کا دیو، اس نے گھٹنوں تک لمبے کرتے کو اٹھا کر دعا مانگی، شکر کیا کہ گرم اور زہریلی ہوا، آندھی نہ ہوئی۔ سر پر آسمان کا میلا ٹکڑا اور نیچے زمین تمبا کو رنگ میں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی۔

سامنے جہاں آسمان تک جاتی عمارتوں کے اوپر بجلی کے تاروں پر ہوا، دیو کی طرح جھول رہی تھی۔ یہاں سے جنگل کی نوک شروع ہو کر کہاں گرتی تھی، یہ اسے اب یاد نہ آیا۔ مکو ہنسا اور بولا ارادہ ببول کے کھردرے تنے پر مکے برسائے۔ اس کے آہنی اعصاب میں بجلی کی تڑپ آہستہ آہستہ سرد پڑ گئی اور آخر کار تنے سے ٹیک لگا لی۔ سامنے جیٹھ کی گرمی میں اندازے سے کھیت کا فاصلہ دل میں دہرایا۔

جنگل کٹنے سے پہلے چھٹپن میں درختوں کی ننگی جڑوں سے نکلتی چیونٹیوں کے راستے جاننے والے کو پگڈنڈی بھول گئی۔ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے، کتنی دیر تک، جیسے وہ جنگل سے گزر رہا ہو۔ خاموش اور سناٹوں میں جاگا جنگل، بلی کی طرح اپنے پیچھے آتے رجبی کو آواز دے کر دیکھا اور اس کا جی بیٹھ گیا۔

”وہ کہاں رک گیا“ دل کے ڈوبنے پر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اور ببول کے چھدرے سائے تلے نکل کر مکو نے چہرہ بوسے کے ذروں سے بھری زہریلی ہوا کے مقابل کر دیا۔ ”لے تو رجبی دیکھ لے“ دیکھ لے اچھی طرح۔ وہ دل پر بھنایا ہوا دوبارہ سائے تلے آ گیا۔ اب داہنی سڑک پر سنسناتی دوزخی ہوا کے شور میں گڑگڑاہٹ ہوئی، ٹریکٹر کی دم سے تھریشر جھولتی جا رہی ہو۔

وہ اٹھا اور چیخا کون ہے، رک جا، رک جا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے بہتیرا دیکھا کہ کون ہے۔ مگر وہ نہ رکا۔ شاید اناج گھر کی طرف جا رہا ہو۔ ببول تلے کھڑا دیر تک غراتی ہوا کی آوازیں، سنا کیا؟۔ یہ وہ آوازیں نہ ہوں۔ یا شاید وہی ہوں؟ کان لگا کر غور سے سننے کی کوشش۔ مگر مایوس ہو کے دوبارہ سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔ وہ جب بھی سال کے سال ببول کے اس کو کھلے درخت تلے ٹھہرا ہے۔ بادل کے باغ میں پہنچ جاتا

ہے۔ ببول کی کھردری چھال جلد میں کھب رہی تھی۔ وہ پھر بھی نیم غنودہ کہاں سے کہاں تک پھرتا رہا۔ باغ میں بادل اسی طرح پھرتے ہیں۔ وہاں کی آوازیں،اس نے دوبارہ کان لگائے۔ یاد آیا ہد ہد یا ٹیٹرے سے ملتی جلتی آوازیں اور ہیں،اور یہ آوازیں اور ہیں۔ پارسال بھی فصل اٹھانے وہ اس درخت تلے بھول بھلیوں میں پڑ گیا تھا۔

مکو نے پھننگ تک پیار سے درخت کو دیکھا۔ پورے جنگل میں یہ کٹنے سے بچ گیا۔ ''خدا کی شان ہے''،''خدا کی شان'' مکو آنکھیں ملتا غبار میں اٹے آسمان کو دیکھ کے بولا۔

جنگل کی جگہ اب بادل کے باغ نے لے لی۔ جنگل کٹ گیا تو کیا ہوا۔ وہ سہ پہر تک یہاں رہنے کو آیا تھا۔مگر رجی کی آواز نے چونکا دیا۔''لوآ گیا'' ہاتھ کی طرح چنگار کر اُٹھ بیٹھا۔

''تم یہ کیا حرکت ہر سال کرتے ہو۔ کیوں آ کے بیٹھ جاتے ہو؟ معلوم ہے؟ تمہارے گھر کتنی بار فون آیا ہے کل کیوں نہ بتایا۔۔۔؟ رجی نے اسے گلے لگایا اور بولا''یار تم کیا شے ہو'' کیا آفت ہو؟

مکو نے اس کے ساتھ گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کہا''جس سے گیا ہوں، جنگل کی جگہ باغ نے لے لی ہے۔مگر یار۔۔۔؟

گاڑی میں بیٹھ کر رجی نے اس کو لوہے کی طرح سخت دبایا۔

''باغ دکھانے کا وعدہ بھول جاتے ہو، بولو دکھاؤ گے؟

وہ ہنسا''ہاں دیکھ لینا۔ دیکھو گے باغ؟ سچ کہو،''لو اور سنو؟''

مکو نے باغ کا ذکر چھوڑ کر فصل کا پوچھا۔ گیہوں کی اچھی فصل پر خوش ہو کے مکو نے اسے بتایا کہ باغ ہے کیا؟ آدمی اندازہ نہیں کر سکتا اتنے بھاری بھرکم کاٹھی کے آدمی نے یہ سب کچھ دیکھا،اور برداشت کیا۔مکو نے ایک ایک کیاری بنائی، پانی پلایا، پہلوانی چھوڑی جتی کے بادل۔۔۔اس پر رجی خفا ہوا پوچھا''یہ کیا ظلم کیا'' سفید پتلی مونچھوں کو تاؤ دے کہ کہا''آجائے گی سمجھ،سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔۔۔نہ آئے سمجھ تو رستم سے پوچھ لینا۔۔۔؟''

رستم سے پوچھوں؟ تم بتاؤ گے حیرت ہے۔۔۔؟

حیرانی جوگی کیا بات ہے۔ بتا دے وہ!

اور جب رجی نے رستم سے پوچھا۔ وہ بولا تک نہیں، دیر تک کہا۔

وہ ہاتھی آ کے چلا بھی گیا۔ پورا جنگل کھوند کے۔۔۔۔؟

''جنگل کھوند کے جنگل کس نے اُجاڑا، یہ کہتے کیا ہو تم؟''

''مکو نے تو کیا۔۔۔۔۔؟''

''اوئیں خیر تم سمجھو گے، مکو کو دیکھا غور سے، کیسا ہے اب؟''

رستم کے سوال پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اور سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کیونکہ مکو کو اس نے غور سے شاید دیکھا تک نہ ہو، ایکا ایکی اسے مکو کا چہرہ بھول گیا۔ رستم نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''ایسا ہو جاتا ہے اکثر بھول جاتا ہے آدمی یاد کرو اس کے آدھے کان تھے نا کٹے؟'' ہاں ہاں کٹے تھے۔۔۔؟

کان کٹے تھے مکو کے، کان کس نے کاٹے؟ ڈالو ذرا ذہن پر زور۔۔ شاباشے۔ لگا رجی باغ میں ہے۔ باغ میں گھوم رہا ہے اور اس کے پھلدار درخت ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑ رہے ہیں۔ وہ کھڑے کا کھڑا ہاتھ مل رہا ہے۔ آواز دیتا ہے۔ کوئی روکے باغ کو گھومنے سے۔ مگر اس کا نرخرہ، آواز کے دباؤ میں سوکھ گیا ہے۔ کیا کرے؟ کس سے کہے؟ رجی کی حالت دیکھ کر رستم بھی صوفے پر گر گیا، جیب سے ڈبیا نکال کر گولی زبان تلے رکھی۔

''کیا پھر دل؟''

''یہ باغ ہے نا۔۔۔۔ یہ باغ۔۔۔؟''

رستم کے زرد چہرے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ہیں اور بائیں ہاتھ میں درد کی ٹیس نے دوہرا کر کے رکھ دیا۔

دیر بعد آنکھیں کھول کے کہا گھبراؤ نہیں۔ یہ بادل ہے ہی ایسا، اس کے یاد کرنے پر۔۔۔۔؟ رک رک کر لفظ چبا چبا کے بادل کے باغ کے بارے میں بولتا رہا۔

''تم ایک دن جاؤ گے تو دیکھو گے۔ لیکن یار، یہ کام مکو ہی کا تھا، عفریت ہے، عفریت ہے وہ۔۔۔۔۔ باغ میں چلتے چلتے، وہ دور نکل گیا۔ اور اس کے پیچھے رجی نے ڈھونڈا ہے، رستم اس کا چہرہ ہی ذہن سے اتر گیا۔

لیا الفراہ، رستم بھی گیا، اس کا چہرہ۔۔۔۔؟

رجی کو دھیان پڑا شیخ ثناءاللہ کے ساتھ بھی پارسال یہی ہوا ہے، جس کو دیکھا ہے بٹر بٹر تکتا ہے۔ نام یاد نہیں۔ کہیں وہ شیخ ثناءاللہ کی جون میں تو نہیں آ گیا۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اپنے آپ کو آزمانے کی خاطر شیخ ثناءاللہ کا سراپا ذہن میں کیا اتارا اس کا ایک ایک نقش سامنے ہو گیا۔ وہی لہریا سیاہ داڑھی، سنہری فریم والی عینک میں مردہ آنکھیں، تو پھر ملکو اور رستم۔۔۔' اس نے بادل کے باغ کو ان سے جدا کر کے بھی دیکھ لیا۔ مگر وہ دکھلائی نہیں پڑے۔

''بندہ وہم میں نہ پڑے، زندہ لوگ مرن جوگے ہو گئے، یہ ہو کیا گیا یہی کہیں بادل کا باغ تو نہیں؟ باغ یہی ہے کیا؟ یہ پیچ در پیچ پرانے درختوں کے درمیان روشوں میں پھیلا تھا۔ اور بادل تو شاید۔۔۔ وہ دوبارہ بھول بھلیوں میں پڑ گیا۔'' کیا باغ یہی ہے؟ ملکو اور رستم کا باغ اور۔۔۔؟

پرانا جنگل ہو، اور اکثر درخت جڑ سے اکھڑ رہے تھے یا انہیں کوئی بیماری چاٹ رہی تھی صرف جھاڑیاں وہ اور پیڑ ہرے تھے جو کناروں پر بعد میں لگائے گئے۔

وہ نہ ملا تو رجی کو یاد آیا، وہ میلون، اس الجھی راہوں پر شکار کو نکلنے، ایک آہٹ، درختوں کے پاس گزرے ہوئے سنتا اور اس پر نشا طاری ہو جاتا جیسے ہرن اندھیری رات میں روشنی کے سامنے مبہوت ہو کے کھڑا ہو جائے۔ یہ چھدرا جنگل، ترائی میں کے گویا ستانے کو بیٹھ گیا۔

آدھے جنگل کے کٹنے کے بعد وہ کہاں سے آ دھمکا۔

''کٹ گیا۔۔۔ آخر کٹ کے رہا نہ۔۔۔۔۔؟''

اس دن ہلکی بوندا باندی میں رستم کہنے لگا۔

''یار میں آج بوڑھا ہو گیا ہوں، پہلوانی والا لنگوٹا اتار رہا ہوں، اس میں پہلوانی تم نکال کے پہن لو۔۔۔''

رستم نے جواب دیا۔ رجی کو یاد نہ آیا۔ لیکن اس کے بعد، اس نے رجی کا ہاتھ پکڑا اور کہا،'' تم چلو، تم باغ دیکھ آؤ۔ وقت آ گیا ہے باغ دیکھنے کا۔ یہ باغ، رجی نے خواب میں دیکھا۔ اتنا ہرا، اتنا ہرا کہ میں اندھا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بادل بھی ہرا، پانی بھی ہرا، اور چڑیاں بھی ہری۔ لیکن یاد؟''

''ہاں آگے چلو''

''یار یہ تو دن ہے تم کیسے دیکھو گے، لیکن چلو دن کا کواب ہی مل گیا ہے۔ دن کے خواب نے رات پھیلا

دی ہے۔اب کوئی باغ دیکھے۔کہاں جائے،جس طرف نکلو اندھیرا ہی اندھیرا،کیا دیکھ رہے ہو۔''

رجبی نے حیرانی سے کانپتے ہوئے کہا۔''دیکھ رہا ہوں یہ باغ کا کنارہ،دیکھ لیا۔۔۔۔بھاگو۔اور تیز شاباشے،باغ آگے ہے،بھاگو۔رجبی کہاں بھاگے۔بولا، میں ہل نہیں سکتا۔تم کہتے ہو بھاگو۔کیسے بھاگوں۔

اسے پیاس کی شدت نے ادھ موا کر دیا۔بہت کہا۔پانی لاؤ،کوئی ہوتا تو پلاتا۔سر ہلاتا ہے پاؤں ہلاتا ہے۔سب درست مگر چلتا ہے تو پیر سوسو من کے۔پھٹی نظروں سے چارسُو دیکھا اور گلا پھاڑا،پانی لاؤ پانی میں گیا،مر گیا میں۔

شاید یہی باغ تھا،یا کوئی دوسری جگہ،کوئی آواز،کوئی آہٹ سنائی نہ پڑی،رجبی نے بولنا چاہا آہستہ آہستہ اس پر غشی چھا گئی،مگر اتنا ضرور تھا کہ اسے ہر شے کے بارے میں بتا دیا گیا۔وہ جہاں گر پڑا تھا وہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔اس لیے کپڑے کھونچ کر رہ گئے۔رجبی کو یا تو گھسیٹا گیا تھا یا وہ خود گرتا پڑتا،دروازے کی چوکھٹ پر پڑا ہانپ رہا تھا۔دروازہ بہت بڑا تھا۔درزوں میں ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی اور حویلی کے اندر بھاگنے کا شور ہوا۔اسے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور کوئی ہے۔دیر تک وہاں دھینگا مشتی ہوتی رہی۔ساری طاقت جمع کر کے رجبی نے آواز دی۔

''کوئی ہے اندر،اندر کوئی ہے۔''

معلوم پڑا اس کی آواز پہاڑ کی طرح اس پر آن گری ہے۔اصل میں دروازے کا ایک حصہ اندر کی طرف گر پڑا تھا۔اندر کی آوازیں دروازے کے گرتے ہی بند ہو گئیں۔اس نے جو شور سنا تھا۔یہ سوچتے ہی اندر سے کوئی بھاری بھرکم ہنسی ہنسا،پوری آنکھیں کھول کے اس نے حویلی کے اندر جھانکا۔شاید اندر سائے آگے پیچھے دوڑے یا کوئی شے گرنے کی آواز دوبارہ آئی۔اس کے جینے کی خواہش ہمک کے سامنے آئی۔چاہا گھسیٹتا ہوا،حویلی کے اندر چلا جائے۔مگر حویلی میں جانے سے پہلے یقین کرنا چاہتا تھا کہ اندر جو بھی ہیں اس کی موجودگی سے خبردار ہو جائیں۔

سامنے دور تک پھیلے برآمدے کے سرخ ستون کے پاس فوارے کی طرح ہنسی چھوٹی اور کوئی گرجا''آجاؤ اندر۔''

رجبی نے تلے قدم اٹھاتا،کیسے بلی شکار کو آگے بڑھتی ہے،آگے رینگتا گیا،اسے خوشی ہوئی کہ وہ چلنے لگا

ہے۔مگر کس سمت چل رہا ہے؟ یہ وہ بھول گیا۔حویلی سے گزر کر،اسے راہداریوں والے راستے پر ڈال دیا گیا۔جس کے چوگرد دور تک بارہ دریوں کا چھاتا سا بن گیا تھا۔اندھیرے میں چلتے چلتے اسے روک دیا گیا تھا۔کھڑے ہو کے رجبی نے درباری پانی مانگا۔

جواب میں ہنسنے کی بجائے پھر وہی جان لیوا خاموشی چھا گئی۔اسے احساس ہوا،اس نے کہاں پھکی لی ہے۔اب تو وہ چلنے سے رہا،اور اگر چلنا بھی پڑے تو کہاں تک چلے گا۔۔۔۔۔؟ جنگلی ہاتھیوں کی طرح دونوں طرف گھنے اندھیرے میں،بارہ دریوں کے درمیان گھرے رجبی نے اپنے آپ سے پوچھا۔

(ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء انتخاب افسانہ اردو ،اکادمی ادبیات)

نام	رخسانہ صولت
ولدیت	انوار صولت
پیدائش	۱۹۵۲ء
جائے پیدائش	حضرو ضلع کیمبل پور (اٹک)
تعلیم	ایم اے (اردو)

رخسانہ صولت کے آباواجداد کا تعلق رمبہ ضلع کرنال انڈیا سے تھا۔ تقسیم ہند پر یہ خاندان ہجرت کر کے ضلع اٹک کے ایک قصبہ حضرو میں آباد ہوا۔ رخسانہ صولت نے یہیں آنکھ کھولی۔ انہوں نے مڈل تک حضرو کے مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

۱۹۶۵ء میں سرگودھا بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۷ء میں اسی بورڈ سے ایف کیا۔ ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں گریجویشن کی۔ اس کے بعد نیشنل سنٹر اسلام آباد سے عربی میں کورس کیا بعدازاں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔

ان کے والد انوار صولت ایک نامی شاعر اور صحافی تھے اُنہیں یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ انہوں نے منشایاد، صفی صفدر کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی اور پہلی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔

رخسانہ صولت اس حلقہ کی پہلی جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئیں اور سات سال تک خوش اسلوبی سے حلقہ کے اجلاس منعقد کرائے بعد ازاں ''بزم کتاب'' کی سیکرٹری مقرر کی گئیں ممتاز مفتی، انوار صولت منشایاد، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، مسعود قریشی اس کے بنیادی رکن تھے۔ رخسانہ صولت نے ۱۹۸۵ء تک اپنے عہدہ کی زمہ داریاں نبھائیں بعد میں انہوں نے اپنی نجی مصروفیات کی بنا پر اپنا عہدہ منشایاد کے سپرد کر دیا۔ علاوہ ازیں وہ رائٹر گلڈ کی بھی مستقل رکن رہیں۔ بچپن ہی سے انہیں گھر میں علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ والد اور بڑے بھائی نے ان کے ادبی ذوق وشوق کو جلا بخشی۔ انہوں نے پہلی کہانی پانچویں جماعت

میں ''شمع دیوی'' کے عنوان سے لکھی جو بچوں کے ایڈیشن '' روز نامہ جنگ روال پنڈی'' میں شائع ہوئی۔دورانِ تعلیم ہی سے صحافت سے منسلک ہوئیں ابتدا میں سماجی موضوعات پر مضامین لکھے۔گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ ٹیچنگ بھی کی لیکن صحافت کو ہی اوڑھنا بچھونا بنایا۔روز نامہ مساوات سے بہ طور رپورٹر جاب کا آغاز کیا ہفت روزہ نصرت ہفت روزہ معیار کراچی کے لیے رپورٹنگ کی۔روز نامہ دھنک لاہور کے لیے اسلام آباد سے رپورٹنگ کی،انٹرویواور فیچر لکھے۔

ماہنامہ پلک لاہور،اعلان کراچی،روز نامہ کوئٹہ،اخبارِ وطن لندن کے لیے بھی کام کیا،روز نامہ ملتان کی بیرو چیف رہیں بعدازاں روز نامہ روال پنڈی سے منسلک ہوگئیں رپورٹنگ کے علاوہ اہم شخصیات کے انٹرویو شائع کیے اوراس کی میگزین ایڈیٹر بھی رہیں۔۱۹۸۲ء میں روز نامہ جنگ کی ملازمت چھوڑ دی اوراسلام آباد سے رسالہ ہفت روزہ ''نکھار'' کا اجراء کیا۔بعد میں اسے ہفت روزہ اخبار میں تبدیل کر دیا۔گزشتہ ۳۳ سال سے وہ اس ہفت روزہ کو شائع کر رہی ہیں۔قبل ازیں السفیر پبلیکیشنز کے نام سے میگزین سیریز بھی شائع کی۔

افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۰ء میں کیا۔شروع میں خواتین کے موضوعات پر کہانیاں لکھی جو زیب النساء،حرم،خواتین ڈائجسٹ وغیرہ میں شائع ہوئی بعدازاں ان کے افسانے نیرنگ خیال،بانو کراچی،شمع دہلی،آجکل دہلی،نئی قدریں،افکار،سیپ،فنون،اوراق،ماہ نو،تخلیق،چہار سو،ادبیات ،ادبِ لطیف اور دیگراہم رسائل میں شائع ہوتے رہے۔انہوں نے جدید علامتی انداز میں مذاحمتی افسانے بھی لکھے۔

۱۹۷۹ء میں '' گیلے حرف'' کے عنوان سے ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ملی۔ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ادب اور صحافت کے ساتھ سماجی کارکن بھی ہیں۔سی پی این ای اوراے پی این ایس کی ایگزیکٹو کمیٹی کی رکن اور پیراڈیکلز کمیٹی کی آلٹرنیٹ کنوینئر ،اے پی این ویمن پبلشرز کمیٹی کی کو چیئر پرسن ہیں۔۱۹۸۶ء میں بہترین ایڈیٹر کا بولان ایوارڈ،پاک ترک رومی انٹرنیشنل کی جانب سے ۲۰۱۶ء میں بہترین افسانہ نگار کا ایوارڈ،بہترین کالم نگار کا ایوارڈ،حلقہ اربابِ زوق اسلام آباد کی جانب سے سندِ اعزاز، پاک ترک رومی انٹرنیشنل ٹرفکیٹ وغیرہ۔

ٹیلی فونک مکالمہ ومکتوب بنام (راقم) ۲۰۱۸ء

زندہ لوگوں کا قبرستان

رخسانہ صولت

کھلی ہوئی کھڑکی کی جالی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے کے اندر آ رہے تھے اور میرے جسم کے اندر سنسنی پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ایک جھرجھری لی اور کروٹ بدل کر سختی سے آنکھیں موند لیں۔ لیکن نیند تو شاید میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی میرے دماغ میں تند ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ذہن میں الاؤ دہک رہے تھے۔ میرے جسم کا انگ انگ اس طرح دکھ رہا تھا جیسے میں برسوں پیدل چلتی آ رہی ہوں اور میرے پاؤں میں آبلے پھوٹ گئے ہوں۔

اچانک میری چارپائی زور سے ہلی۔ شاید ماں کو اندھیرے میں ٹھوکر کھانی پڑی ہو۔ اور ماں۔۔۔ تو بھی کیا سوچتی ہوگی۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ اس زندگی میں قسمت اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہے ماں۔۔۔؟

اس سوال کا جواب مجھے تو بھی نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ تو خود بھی اس سوال کا جواب نہ پا سکی۔ ہم کریں بھی تو کیا؟

غریب لوگوں کو آنکھیں سختی سے بھینچ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ سورج کی تیز روشنی اپنی چمک اور حدت کھو چکی ہے۔ اب تو گہری تاریک رات ہے اور یہ رات جانے کتنی لمبی ہو۔ کتنی طویل۔

''رات تو دنیا بھر میں گناہ، ظلم، جبر اور آمریت کا سمبل ہے۔''

''ماں تم کیوں ٹھوکریں کھا رہی ہو۔ پانی کے لیے مجھے آواز دے لینی تھی۔ میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور میری آواز بھی شاید سیل زدہ دیواروں سے چپک گئی ہے۔ آواز کی بازگشت کو بھی بوسیدہ چھت نے نگل لیا ہے۔

میں نے جانے کیا سوچ کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ غالباً رات کا نصف سے زیادہ حصہ گزر چکا تھا دور کہیں گیدڑ اپنی بےسُری آوازوں میں تنہائی کا راگ الاپ رہے تھے۔ مگر رات کے اس

ہولناک سناٹے میں مجھے ان کی آواز بڑی دلکش اور سُریلی لگ رہی تھی۔ شاید اس بھری دنیا کے قبرستان میں مجھے ان کی آوازوں میں ہی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

زندہ لوگوں کے قبرستان میں کتنا شور تھا۔ ہر کوئی اپنے سائے سے بے خبر، بے پرواہ آگے آگے بھاگے جانے کی فکر میں گم نظر آتا تھا۔ اور اسی بھاگ دوڑ میں سڑک پر بکھرے ہوئے سانسوں کے ٹکڑے وزنی وزنی پیروں تلے روندے جاتے اور سرخ سرخ خون کی بوندیں بہت جلد اپنا رنگ بدل ڈالتیں تا کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

ہم بھی اسی مک چلے ہوئے گروہ سے نکلتے ہیں۔ ہمارے چہرے اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ تبھی تو ماں ۔۔۔ تُو سب سے کہتی ہے۔۔۔

''یہ بچیاں ننگے سر ہیں۔ ان کو تیز نظروں سے نہ دیکھو۔''

ماں میں تیری نظر میں نادان اور معصوم بچی ہوں۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تُو نے جس غلط بات کا پروپیگنڈہ کیا۔ وہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ تجھے اپنے سر پر سایہ کیے دیکھا اور اسی کے تحت میں نے جھلستی رہتی ریت پر پیر رکھ دیئے۔

''ماں۔۔۔! وقت کتنا خوب صورت دھوکہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے زندگی ایک عظیم بھیانک مذاق ہے۔''

اور ہم سب ان دونوں کے درمیان بانوری چکوری کی طرح سر پٹختے رہتے ہیں۔ جبھی تو آج چلتے چلتے تھک کر گر پڑی ہے اور دکھ سے میرا سر پھٹنے لگا ہے۔

آج جانے کیوں مجھے سب باتیں یاد آ رہی ہیں اور بڑی شدت کے ساتھ میں ان کی تلخیوں کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنے آپ کو حقیقت پسند سمجھتی ہوں اور فضول باتوں کو دہرا کر یا ان کے سوچنے پر اپنی قوت کو ضائع کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ مجھے آج دوپہر کا واقعہ یاد آ گیا۔

رات اور دوپہر میں زیادہ فاصلہ نہیں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب بھی وہی تیز اور جھلسی ہوئی دوپہر ہے، اس کی گرمی اور تپش کو اس ماحول کی ٹھنڈک بھی دور نہیں کر رہی۔

آفس میں کام کرتے کرتے میری انگلیاں تھم گئیں اور مجھے متلی کا احساس ہونے لگا۔ دماغ میں ایک اور گوندا سا لپکا۔

''ماں کی دوائی کہاں سے آئے گی۔؟''

''خرچ کیا ہوگا۔؟''

ساجدہ راہ دیکھ رہی ہوگی۔اس کی آنکھوں میں امید کے جلتے دیئے کس طرح دیکھوں گی۔وہ تجھے تسلیاں دے رہی ہوگی۔بالکل اسی طرح تو ہمیں بچپن میں جھوٹی تسلیاں دیا کرتی تھی۔خوبصورت جھوٹے سے بنگلے میں کھیلنے کے خواب دکھایا کرتی تھی۔تو کہتی تھی نا ماں۔۔۔میری بچیاں تو ماں باپ کا نام روشن کریں گیاور پھر ہمارے دکھ درد میں ڈوبے دن ختم ہو جائیں گے۔

مگر ماں۔! کاش آج بھی تو ہمیں یونہی تسلیاں دیتی تو شاید ہم اس خواب کے سہارے ہی دکھ بھول جاتے۔دراصل ماں یہ خرابی بھی تو نے پیدا کی۔تو نے ہمیں خواب دیکھنے کی بری عادت ڈال دی۔لیکن شاید ایسا نہ ہو سکے۔

'' مجھے یہ احساس اور بھی کچو کے لگاتا ہے کہ ہمارے ذرا سے اشارے پر تو اپنے دودھ سے بھرے گھڑے ہمارے گٹروں میں انڈیل دیتی تھی اور میں آج مرتی ہوئی ماں کے منہ دودھ کی چند بوندیں بھی نہ ٹپکا سکوں گی۔''

اس خیال کے آتے ہی ٹپ ٹپ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

وہ سامنے والی میز پر بیٹھا تھا ایک دم چونک کر اٹھا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔وہی۔

ماں! جسے میں دنیا کے سب مردوں سے پُر خلوص اور سچا دوست سمجھتی تھی۔

''تم اپنی صحیح کیفیت مجھ سے کیوں چھپاتی ہو۔''

''کہہ دو نا تمہیں کیا دکھ ہے۔؟''

وہ پوچھتا رہا۔۔۔اور پھر میں نے گیلی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔اس نے میری جھولی میں بہت سے نوٹ ڈال دیئے۔

میں نے ایک نظر اسے،اور ایک نظر جھولی میں پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا اور پھر اسی سے سوال کر ڈالا۔

''قرضے کی شرائط۔۔۔؟''

وہ ہنسا اور دھنسی دھنسی سی ہنسی میری روح کو کجلا گئی۔اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔میری جوان اور کھلی

آنکھوں نے اس کی بات سن لی تھی۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اپنے سر کی چادر خریدنا چاہتی تھی۔مگر نہیں۔"

"تم خود مفلس ہو۔۔۔۔۔اور ابھی نادان۔"

"تم سود کا لین دین اپنے اصل نام کے ساتھ نہیں کر سکتے۔"

اور میں نے سارے نوٹ اس کے چہرے کی طرف اچھال دیئے، اور ایک موٹی سی گالی اسے تحفتاً دے دی۔

اور لمحے کسی ٹھنڈے یخ جھونکے کی طرح چیختے چلاتے آئے۔اور میری روح سے لپٹ کر بین کرنے لگے۔ مجھے ان کے لمس سے ماں کے جسم کی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔

(ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء انتخاب افسانہ اردو ،اکادمی ادبیات)

کوائف

نام نگہت یاسمین

قلمی نام نگہت یاسمین

تعلیم - بی اے، بی ایڈ

پیشہ :- شعبہ تعلیم

پہلا افسانہ ادبیات میں شائع ہوا "شہزادہ ماما بہت سویٹ ہیں" اور جنگ کے ادبی ایڈیشن میں [illegible] بدرہ کے نام سے شائع ہوا

میرے افسانے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، سہ ماہی قبول، سہ ماہی الانشاء کراچی، چہار سو راولپنڈی، ماہ نو، اور سہ ماہی نوادر لاہور۔

میرا پہلا افسانوں کا مجموعہ "خواب، دستک، رستا" جس کے افسانوں کے بارے میں محترم حمید شاہد کی رائے۔۔ اتنی سی زندگی کے عین آغاز میں کہانی کو قرینے سے بیان کرنے کا ہنر نگہت یاسمین کو عطا ہوا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے

مجھے یقین ہے ان کی سادہ زبان میں سہولت سے لکھی گئی ان کہانیوں کو توجہ اور محبت سے پڑھا جائے گا۔

کایاپلٹ

نگہت یاسمین

خیمے کے باہر فضا رات کی مہیب تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے، اور خیمے کے اندر نیم روشن افسردہ سا ماحول اونگھ رہا ہے۔

چہروں پر ویرانیوں کی دھول سمیٹے دل شکستہ لوگ ساکت بیٹھے ہیں ایک طرف سولہ سترہ سال کا نوجوان ہاتھ میں موبائل لیے بیٹھا ہے اس نے موبائل پر ایف ایم ریڈیو کو آن کیا ہوا ہے، اس پر کسی مذہبی اسکالر کی اسپیچ نشر ہو رہی ہے آیات مقدسہ کے حوالے کا ایک ایک لفظ، ان کا مفہوم دلوں پر شبنم کی طرح قطرہ قطرہ گر رہا ہے ان کی آنکھوں سے ندامت اور پشیمانی کے آنسو تواتر سے گر رہے ہیں۔ رب ذوالجلال کے پراثر کلام نے جیسے پہلی بار ان کے دلوں کو چھوا ہو۔

خیمے کے ایک کونے میں وہ پریشان سی بدحواسی کے عالم میں بیٹھی ہے۔ وہ محسوس کر رہی ہے جیسے وہ مسلسل اس نوجون کی نگاہوں کے حصار میں ہو، وہ شرم سے اندر ہی اندر سمٹی جا رہی تھی۔ نوجوان نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھ کر خیمے سے باہر چلا گیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ واپس آ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں دو چادریں ہیں۔

"پلیز! یہ آپ اوڑھ لیں ابھی ابھی کوئی خاتون ریلیف فنڈ میں donate کر کے گئی ہیں"۔ ہزار تشکر سے وہ ایک موٹی سی چادر لے کر اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ لیتی ہے۔ چادر اوڑھ کر اسے عجیب سے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ ورنہ مہین سے جارجٹ کے سوٹ اور ہلکے سے ریشمی دوپٹے میں اتنے لوگوں میں بیٹھنا اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ خیمے میں آیت کریمہ کی دھیمی دھیمی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، مگر وہ آس پاس سے بے نیاز گزرے دن کے واقعات اپنے ذہن کی سکرین پر گزرتے دیکھ رہی تھی۔

اپنی پینٹنگز کی ایگزیبیشن کے سلسلے میں وہ بے حد مصروف تھی اس وقت ڈرائنگ روم میں شہر کے معزز تاجر شیخ ایاز اپنی بیگم اور بیٹے کے ہمراہ اس کے پرپوزل کے لیے اس کے ڈیڈی کے ساتھ بات جیت میں

مشغول تھے۔

ڈیڈی کے مخصوص پرجوش قہقہے فضا میں گونج رہے تھے ان کی فخر وانبساط اور رعونت سے بھرپور آواز اس نے اپنے کمرے میں سنی تھی۔

''تو جناب ! شیخ صاحب ۔۔۔۔تین بیٹیاں ہیں میری ۔۔۔اللہ کی رحمت اور یہی میرا اثاثہ ہیں۔۔۔سب ماشااللہ بے حد ذہین اور اپنے اپنے شعبے میں بے حد نامور۔۔۔۔ بڑی بیٹی ماہتاب نے فائن آرٹ میں ماسٹر کیا ہے اور وہ ایسی مہارت سے پورٹریٹ پینٹ کرتی ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔لگتا ہے تصویر ابھی بولنے لگے گی۔سارے ایکسپریشن۔۔امید۔۔۔حیرت۔۔مسرت۔۔کوف۔۔اداسی غرض خفیف سی مسکراہٹ اور سوچ کی ہلکی سی پرچھائیں بھی رنگوں کی آمیزش سے چہرے سے یوں چھلکاتی ہے کہ دیکھنے والا کتنے ہی لمحے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتا ہے۔یہ سامنے دیکھئے۔۔۔اس پینٹنگ میں اس نے فریدہ خانم کو اپنے مخصوص گائیگی کے انداز میں گاتے ہوئے دکھایا ہے''۔

''واہ۔۔۔کیا کہنے، ماشاءاللہ'' شیخ صاحب بے ساختہ داد دے رہے ہیں۔

''اور دوسری بیٹی نایاب ہے جرنلزم میں ماسٹر اور مشہور افسانہ نگار ہے اس کے افسانے ہندو پاک کے ادبی رسائل میں چھپ کر ادب میں منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔۔۔اس کا بے باک انداز انٹرنیشنل لیول کو چھو رہا ہے اس کے علاوہ وہ ایک ادبی رسالہ ''نیا ادب'' کی نہایت کامیابی سے ادارت کر رہی ہے۔اور یہ ننھی سی گڑیا جو صوفے پر ہارمونیم لیے بیٹھی ہے۔۔۔سیماب ہے۔۔۔میوزک کی دیوانی۔۔۔اس کے شوق اور جذبے کے پیش نظر میں نے شہر کے مشہور میوزیشن ساغر سے اسے باقاعدہ تربیت دلوائی ہے۔پورا سائڈ بورڈ طرح طرح کے میوزیکل انسٹرومنٹس سے بھرا پڑا ہے۔ٹی وی پر کئی دفعہ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہے۔تینوں بیٹیاں ماشاءاللہ انتہائی خوش لباس، خوش ذوق اور خوش گفتار ہیں۔اللہ میاں کا بے حد کرم، بڑا احسان ہے۔اس نے بیٹیوں کی شکل میں مجھے بیٹوں سے نوازا۔''

''ماشاءاللہ۔۔۔ماشاءاللہ جناب احسان صاحب ملوائیے نا مہتاب کے بیٹے سے۔۔۔''

''میں نے کہا نا وہ آج کل اپنی پینٹنگز کی نمائش کے سلسلہ میں بے حد مصروف ہے۔''

''بس ایک دومنٹ کے لیے۔۔۔'' شیخ صاحب کی بے تابی قابل دید ہے۔

''ٹھہریں میں بلاتا ہوں۔مہتاب بیٹے ذرا کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔۔۔۔۔''

ڈیڈی کی آواز پر وہ دوڑی چلی آئی تھی۔اورنج کلراور براؤن کلر کی دیدہ زیب کنٹراسٹ سوٹ میں ۔۔دوپٹے سے بے نیاز۔۔۔چہرے کے دونوں اطراف ریشمی بھورے تراشیدہ بال لہراتے ہوئے اس کے شانوں پر بھی مچل رہے تھے۔سر وقد۔۔۔شاہانہ چال چلتی ہوئی مہتاب ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی اور وہ تینوں کے تینوں مبہوت سے اسے یوں دیکھ رہے تھے کہ آنکھیں جھپکانہ تک بھول گئے۔تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لیے اٹھی تو شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں اس کی کمر پر تھپکی دی۔بیگم شیخ نے پرس سے دو گولڈ کے جگمگاتے کڑے نکال کر پہنائے ،بیٹے نے اس کا ملائم ہاتھ تھام کر ڈائمنڈ کی بیش قیمت رنگ پہنائی۔جیسے ہی وہ پلٹی اس نے تصویر کی آنکھ سے دیکھا کہ تینوں کی نگائیں اس کی پشت پر لگی زپ کے اطراف بنے ڈیزائن پر اس کے اوجھل ہونے تک ٹکی رہیں۔

پینٹنگ کو آخری ٹچ دے کر جب وہ کمرے سے نکلی اس نے نایاب کو فون کسی سے گرما گرما بحث کرتے سنا تھا۔

''سیما صاحبہ! آپ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتی ہیں اچھے افسانہ نگار کا کمال تو یہی ہے کہ وہ اپنے افسانے میں آس پاس کی آلودگیوں اور غلاظتوں کی نشاندہی کرے اور آپ جیسے vulgarity کہہ رہی ہیں نا یہ تو reality ہے۔vulgarity نہیں۔۔۔اوہ اس سے جنسی بے راہ روی کیا پیدا ہوگی۔افسانہ نگار تو ڈیگنوز کرتا ہے سرجری ان کا کام نہیں۔۔۔۔اوہ مائی گاڈ۔۔یہ کوئی مذہبی رسالہ نہیں،درست ہے۔۔۔کئی ادبی رسائل حمد ونعت شائع کرتے ہیں مگر میرا تو یہ خالص ادبی رسالہ ہے ۔۔کیا کہا۔۔اصلاح معاشرہ۔۔۔اخلاقیات ارے بابا یہ ہمارا headach نہیں،مذہبی تنظیمیں آخر کس لیے ہیں۔اوکے''

وہ جیسے ہی فون بند کر کے باہر آئی مہتاب نے اسے دبوچ لیا'' کون تھا کیا چکر ہے اس کا؟''

''ارے مہتاب کیا بتاؤں دماغ چکرا کے رکھ دیتی ہے یہ لڑکی۔ہمیشہ اسے گلہ رہتا ہے کہ میں وہ اپنے افسانے جوں کے توں کیوں شائع کر دیتی ہوں۔کانٹ چھانٹ کیوں نہیں کرتی۔۔بھئی کوئی قابل اعتراض بات ہو تو تب نا۔ایڈیٹر کی زمہ داری سمجھا رہی تھی مجھے۔۔۔۔۔''

''ارے چھوڑو۔۔۔۔۔نایاب موڈ آف نہ کرو۔۔۔باہر دیکھو کیا زبردست موسم ہو رہا ہے۔آسمان پر امڈتی سرمئی گھٹائیں اور ان سے ٹپکتی شفاف بوندیں،آؤ۔۔۔کہیں آوٹنگ پر چلتے ہیں''۔

''اوہ گڈ آئیڈیا'' وہ جھوم جھوم گانے لگی۔۔۔

''ارے۔۔۔ارے۔۔۔ارے بند کرو یہ گانا وانا''

''سنو تو! یہ سائرن کیوں اتنے تسلسل سے بج رہا ہے''۔

''وارننگ۔۔۔۔۔''

زبردست طوفانی بارشوں اور بند ٹوٹنے سے شہر کو زبردست خطرہ۔۔۔۔شہر کو بچانے کی تمام کوششیں ناکام۔۔۔عوام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر فوراً شہر کو خالی کر دیں اور محفوظ مقامات پر پہنچ جائیں، ان کی ذرا سی غفلت اور لاپرواہی جانی نقصان کا باعث بن سکتی ہے''۔

سیماب بھی ہارمونیم چھوڑ بدحواس ہو کر بھاگتی ہوئی باہر آ گئی۔ممی ڈیڈی بھی پریشان کھڑے تھے۔

''کیا کرنا چاہیے۔۔۔۔ویسے میرا خیال ہے کہ کم از کم ہمارے مکان کو کوئی خطرہ نہیں۔مکان کی کرسی پانچ چھ فٹ اونچی ہے''

ڈیڈی نے اطمینان دلایا اور وہ سب برستی بارش میں ٹیرس پر کھڑے ہو گئے۔مگر دیکھتے ہی دیکھتے بارش تیز سے تیز تر ہو گئی۔سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا اور ہر سو، رات کی تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی۔سائرن مسلسل چیخ رہا تھا۔۔۔اور تند و تیز سیلابی ریلا کسی وحشی جانور کی طرح اندھا دھند بڑھتا آ رہا تھا۔انتہائی وحشت زدہ ہو کر وہ ٹیرس سے کود پڑے۔

افراتفری کے عالم میں انہوں نے جلدی جلدی اپنے اپنے بیگوں میں کپڑے ٹھونسے۔۔۔ایک بیگ میں زیورات رکھے اور باہر کی سمت بھاگے پانی ان کے گھر کے آگے گھٹنوں گھٹنوں بلند ہو گیا۔تھوڑے فاصلے پر کسی امدادی ٹیم کا ٹرک ہارن دے رہا تھا۔ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ پانی کے منہ زور تھپیڑوں سے بمشکل گزر رہے تھے۔وہ ٹرک کے قریب پہنچنے ہی والے تھے کہ مہتاب کا ہاتھ چھوٹ گیا۔۔۔''بچاؤ''۔۔۔۔''بچاؤ'' وہ چیخی۔اس سے بیشتر کہ اس کا توازن بحال نہ رہتا کسی نے جلدی سے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ سب ٹرک کے قریب پہنچ چکے تھے۔اور مہتاب کو نہ پا کر انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھڑے تھے۔مگر ٹرک روانہ ہونے والا تھا۔

''آپ کی بیٹی دوسری گاڑی سے آ جائے گی۔فکر نہ کریں''۔کسی نے تسلی دی اور وہ روتے دھوتے ٹرک میں بیٹھ گئے۔

اصل میں اس آدمی کو اس کے بازوؤں میں چمکتے دمکتے کڑے اور انگلی میں جگمگاتی انگوٹھی نظر آ گئی تھی۔وہ انہیں اتار کر جیب میں ڈال چکا تھا۔ٹرک اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔''چھوڑو''۔۔۔مجھے جانے دواس ٹرک میں میرے ممی ڈیڈی اور بہنیں ہیں''۔

''کیوں گھبراتی ہو بی بی !نہیں ہے جگہ اس ٹرک میں''اس نے بے دردی سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔''اس گاڑی میں بیٹھو''۔وہ روتی رہی سسکتی رہی۔۔۔چیختی چلاتی رہی۔۔۔مگر وہاں کوئی اس کی پکار سننے والا نہیں تھا۔عجب نفسا نفسی کا عالم تھا۔خیمے کے اس ماحول میں وہ سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔سیماب، نایاب اور ممی ڈیڈی کے بغیر اس کا دل ہول رہا تھا۔وہ مسلسل اللہ کا ذکر کر رہی تھی۔استغفار کر رہی تھی۔

''اے ہمارے رب ہمیں معاف کر دے۔ہمارے گناہوں کو بخش دے ہمیں اپنی پناہ میں لے لے''۔موبائل کے ایف ایم ریڈیو پر مذہبی اسکالر کی تقریر جاری تھی۔اللہ پاک فرماتا ہے۔خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے کرتوتوں کے سبب فساد برپا ہیں۔یہ طوفانی بارشوں کے سلسلے، یہ قیامت خیز سیلاب یہ مصیبتیں کسی عذاب سے کم نہیں۔پہلے قومیں صرف ایک حکم کی نافرمانی کرتی تھیں تو ان پر فوراً عذاب نازل ہو جاتا تھا مگر ہم تو طرح طرح کی برائیوں اور گناہوں کی لذت میں سر تا پیر ڈوبے ہوئے ہیں۔سادگی اور حیا کو چھوڑ کر عیاشی اور بے حیائی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ہر شعبہ زندگی میں رب کی نا فرمانی ہمارا شعار بن چکا ہے۔لوگو! ہم نے اپنے رب کو ناراض کر دیا ہے۔اسلام کے نام پر وطن کو حاصل کر کے ہم بے عہدی کا مرتکب ہوئے ہیں۔اللہ تو نے ہم پر نعمتوں کی بارش کر دی ہے۔مگر ہم ناشکرے بنے رہے کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہم نے اسلام کی اچھی باتوں کو چھوڑ کر غیر قوموں کی تقلید میں اپنے کلچر ،مذہب اور اخلاقی اقدار کو داؤ پر لگا دیا۔اب بھی وقت ہے اپنے گناہوں سے تائب ہو کر اللہ سے بخشش مانگو اپنے رب کو راضی کرو۔وہ بڑا غفور ورحیم ہے۔

گرینڈ ماما کی باتوں کی بازگشت قرآنی آیات کی سچائی کے ساتھ مدغم ہو کر اس کے دل کو پگھلا رہی تھی۔گرینڈ ماما جب بھی گاؤں سے آتیں نصیحت کے بول ہی بولتی رہتیں ڈیڈی سے انہیں ہمیشہ شکایت رہتی۔بیٹیوں کی تربیت والدین کی ذمہ داری ہے انہیں اتنی آزادی نہ دو۔۔۔۔ان کے دل میں آخرت کا خوف پیدا کرو۔۔۔۔یہ لباس سرا سر غیر شرعی ہے لباس کا مقصد جسم کی نمائش نہیں ستر پوشی ہے۔یہ

تصویریں بنانا سخت گناہ اور یہ گانا بجانا۔افسانوں میں سیکس اپیلنگ باتیں لکھنا یہ سب قیامت کے آثار ہیں۔مگر ڈیڈی جذباتی ہونے لگتے ہیں۔انہیں گرینڈ ماما کی مداخلت سخت ناگوار گزرتی '' پتہ نہیں اماں آپ کو فیشن اور فن سے کیوں اللہ واسطے کا بیر ہے۔آپ نے اپنی عمر گزار لی اب ان کے اوڑھنے پہننے اور کھانے کھیلنے کے دن ہیں مگر وہ اصرار کرتی رہتیں۔بیٹا انہیں جہنم کی آگ سے بچاؤ۔۔۔آخرت کے دن سے ڈراؤ۔۔۔وہ بہت سخت دن ہوگا۔۔۔ہم سب ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور آتا ہی کیا ہے۔؟نماز روزہ،تسبیح رولنا اور مصلے بچھا کر بیٹھے رہنا اور بس۔۔۔''

جدید تعمیر کا شاہکار،شاندار بنگلہ قیمتی فرنیچر اور غیر ملکی سامان آرائش سے آراستہ۔۔۔۔۔گلیمر فل لائف ،انٹرنیٹ پر چیٹنگ۔ہر ایک کی اپنی اپنی نئے ماڈل کی گاڑی۔۔۔نکالی اور سڑکوں پر دوڑا دی۔کوئی روک ٹوک نہیں۔۔۔مذہب اخلاقیات اور خدائی احکامات سے چشم پوشی۔۔۔آزادی،خوشی۔۔۔خوشحالی۔۔۔بے فکری۔۔۔اسے اپنی سب کوتائیاں یاد آ رہی تھیں اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں تھے۔اچانک باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی۔۔۔کھانا آ گیا۔۔۔کھانا آ گیا،فاقہ زدہ۔۔۔بھوکے پیاسے نڈھال لوگ بے تحاشا باہر بھاگے۔مگر وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔۔۔وہ جو دن بھر میں کئی کئی مرتبہ جوس پینے،آئس کریم کھانے ،برگر،فروٹ چاٹ کھانے کی عادی تھی اب اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔

لوگ کھانا لے کر اندر آئے اور بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے،کسی نے اس پلیٹ میں بھی تھوڑے سے دال چاول ڈال دیئے مگر منہ ڈالتے ہی بدمزہ ابلے چاولوں کی بساند سے اس کا دل متلانے لگا۔اس نے کسی برتن سے دو گھونٹ پانی پیا اور پھر اللہ کو پکارنے لگی۔اس وقت صرف اللہ کریم کی یاد ہی اس کے ٹوٹے پھوٹے دل کو سہارا دے رہی تھی۔دفعتاً کسی نے اس کے شانوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

'' نہ رو بیٹی!اللہ مسبب الاسباب ہے۔میں نے سنا ہے ابھی کچھ خیمے لگائے گئے ہیں جن میں شاداب کالونی کے کچھ خاندانوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔چلو میرے ساتھ شاید تمہارے ماں باپ اور بہنیں ان خیموں میں آئی ہوں،وہ نڈھال سی اٹھ کر خاتون کے ساتھ چل دی اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔۔۔قدم ڈگمگا رہے تھے امید و بیم کے درمیان ڈولتی ہوئی خاتون کا ہاتھ تھامے وہ ایک ایک خیمہ دیکھ رہی تھی ۔۔۔۔اچانک ایک خیمے سے اسے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔'' ممی ڈیڈی وہ دیکھئے مہتاب آ رہی ہے

''۔ یہ بلاشبہ سیماب کی آواز تھی اس کی ننھی منی پیاری بہن جو خیمے کے باہر کھڑی تھی۔۔۔مہتاب ۔۔۔مہتاب میری بہن وہ بے تحاشا اس کی طرف لپکی۔ممی ڈیڈی جو اس کے غم میں ڈھے چکے تھے یکدم جی اٹھے۔جیسے ہی وہ خیمے میں آئی سب بے اختیار اس سے لپٹ گئے۔ضبط کا یارا نہ تھا۔وہ سب زار و قطار رو رہے تھے۔اس کی ممی اور بہنوں نے بڑی بڑی چادروں سے اپنے جسموں کو ڈھانپ رکھا تھا وہ جن کے شب و روز اپنی اپنی مصروفیت میں بسر ہوتے تھے،جن کو ایک دوسرے سے بات کرنے فرصت نہ تھی۔اب یوں جڑے بیٹھے تھے جیسے ذرا بھی کھسکے تو دوبارہ بچھڑ جائیں گے۔

کڑے اتارنے سے اس کے بازو سوج چکے تھے ان پر نیل کے نشان پڑے تھے اس نے حسرت سے اپنے بازوؤں کو دیکھا مگر جان،عزت اور آبرو کے آگے قیمتی سے قیمتی چیز کی بھی کیا اہمیت تھی۔

سب ساکت و خاموش بیٹھے تھے کہ ڈیڈی کی آواز پر چونک اٹھے۔''میرا خیال ہے چند دن کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں پھر کسی رشتہ دار کے ہاں چلیں گے ہاں چلیں گے،یہاں تو ایک ایک پل گزارنا مشکل ہے۔سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا مگر ان کی حیرت اور پریشانی کی انتہا نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ نقدی اور زیورات والا بیگ تو کوئی لٹیرا لے اڑا تھا۔اب وہ مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر تھے۔

باہر کالی بھجنگ رات،تیز بارش کی آواز اور طوفانی ہوا کے سوا کچھ نہیں تھا۔مغموم دلوں پر مایوسی سے بھرپور موسم چھایا ہوا تھا۔

مہتاب کی بیش قیمت پینٹنگز۔۔۔نایاب کی شاعری اور ادب کی بے شمار کتابیں سیماب کے میوزیکل انسٹرومانٹس۔۔۔ان کی چمکتی دمکتی نئی نویلی گاڑیاں جن کی طرح طرح کے ہارن وقفے وقفے سے رات گئے تک پڑوسیوں کی سماعتوں میں گونجتے رہتے تھے۔اب پانی کی بپھرتی لہروں کی زد میں تھے۔کوئی مژدہ کوئی نوید کوئی خوش خبری کچھ بھی نہیں۔خیموں کی اس محدود اور دلدوز فضا میں نہ معلوم ابھی کتنی طویل مسافتیں طے کرنا تھیں۔کمرے کی پرسکون فضا میں سب کے ہونٹوں پر ایک ہی صدا،ایک ہی دعا تھی جو باہر کے شور بادو باراں سے کہیں بلند تھیں۔

اے غفور الرحیم ہمارے گناہ بخش دے،مولا کریم ہماری ہدایت کا حکم صادر فرما دے۔

(ماہنامہ سیپ،شمارہ ۷۹،مئی،جون ۲۰۱۱)

نام -- طلعت نورین

قلمی نام -- طلعت نورین سحر

تعلیم : بی۔اے

بچپن ہی سے مجھے لکھنے کا شوق تھا۔ پہلے میں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور قارئین کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ بچوں کے صفحے (جنگ) کے انچارج نے میری کہانی خلش کو سراہتے ہوئے کہا "کہانی کی اٹھان بہت اچھی ہے۔ اور پھر اس نے اپنے ارتقائی مراحل بہت خوبصورتی سے ادا کیے"

میرا پہلا افسانہ "پناہ گاہ" جنگ کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔

ادبیات پاکستان کے مدیر اعلیٰ محترم عاصم بٹ نے میرا افسانہ "شناخت" کو اپنی کتاب "۲۰۱۱ء کے بہترین افسانوں کا انتخاب" میں شامل کیا۔

میرے افسانے معروف ادبی رسائل "ماہ نو، الزبیر، زرنگار، جمالیات، شعور سخن، ادب لطیف، اور سبیل" میں شامل اشاعت ہوئے۔

میرا پہلا افسانوں کا مجموعہ "نیلی آنکھوں کے خواب" ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ میرا دوسرا افسانوی مجموعہ "سبز جزیرے" اسی سال ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آگیا ہے۔ اور پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔

میں نے اسی سال محترم حسین امجد کی شاعری کی کتاب "رہگذر" پر لکھے گئے مضامین کو کتابی صورت میں مرتب کیا ہے جس میں "رہگذر" کو بھی شامل کیا گیا ہے جو حال ہی میں "امتزاج" نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔

نعم البدل

طلعت نورین سحر

میں ابھی ابھی اپنی ٹیم کے ساتھ ایبٹ آباد کے نواحی گاؤں سے لوٹا تھا۔

زلزلے کی تباہ کاریوں سے گاؤں تقریباً اجڑ چکا تھا۔

سارے مناظر خواب کی طرح میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

میں خیموں میں بہت سے لوگوں کو دیکھا تھا آرزدہ اور غم ناک تھے جن کی آنکھوں میں آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے۔ دل دہلانے والی آئیں سسکیاں ابھی تک ان کے ہونٹوں پر بین کر رہی تھی۔۔۔۔

کچھ ہی سال پہلے صائمہ کے بے حد اصرار پر ہم یہاں اس گاؤں میں آئے تھے۔۔۔۔ حالانکہ کہ میری خواہش مری جانے کی تھی۔

اس قدر خوبصورت ماحول اور دل کو چھو لینے والے مناظر تھے کہ مجھے صائمہ کے انتخاب کی داد دینی پڑی۔

ہم گھنٹوں چلتے رہے ہر قدم، ہر لمحہ ہمارے لیے انوکھا اور دلربا تھا۔۔۔۔ اور یہاں سے جانے کو ہمارا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اچھلتے کودتے ہنس مکھ سیب جیسے گال والے بچوں سے باتیں کر کے جو لطف اور مزا ہم نے لیا وہ کہیں نہیں ملا۔

اس وقت گاؤں والوں کی خوش خلقی نے ہمارے دل موہ لیے جب انہوں نے ہمیں بے حد محبت کھانے کی دعوت دی۔ ہم چوں کہ ہوٹل سے کھانا کھا کر اسی وقت لوٹے تھے اس لیے معذرت کرنی پڑی۔

پھر کتنے ہی دنوں تک ہم اس گاؤں کے خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ خوبصورت لوگوں کی زندہ دلی کا تذکرہ کرتے رہے اور اب اس گاؤں کی بدحالی اور تباہی دیکھ کر میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔

میں نے اپنے ادارے کی طرف سے جو امداد، رقوم اور اجناس کی صورت میں اکٹھی کی تھیں ان سب میں بانٹ دیں۔

واپسی پر میں اس عمارت میں بھی گیا جہاں سب بچے تھے۔

سہمے ہوئے خوف زدہ، منتظر اور بے بس بچے۔۔۔۔۔۔۔!!

اس لمحے میرا جی چاہ ان سب کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں اور ان سب کے سارے غم، دکھ اور اداسیوں کو اپنے اندر اتار لوں۔

سب بچوں نے مجھے افسردہ اور غم ناک نگاہوں سے دیکھا تھا ایک کرب سا تھا سب کے چہروں پر۔ ان کہے درد کی لہریں ان کے وجود کو اپنے حصار میں لیے تھیں۔

میں سب بچوں کے قریب باری باری گیا سب کے سروں پر ہاتھ رکھا ان کو سینے سے لگا کر کر سسک اٹھا۔

کچھ لمحوں کے لیے سہی بچے میری آغوش میں رہے اور میری تسکین کا باعث بنے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔

عجیب طرح کی شبنمی سے محبت کی لہر میرے وجود میں اتر رہی تھی، اور سکون بخش رہی تھی۔

ایک بچے پر میری نگائیں ٹک سی گئی تھیں۔ میری آنکھیں اس پر اس طرح سے جمی تھیں کہ جو ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ پھر میں اس کے قریب گیا۔ اپنا پُر شفقت ہاتھ اس کے قریب کیا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر انوکھا سا رنگ پھیل گیا جس کو میں کوئی نام نہ دے سکا۔

وہ بچہ اس قدر خوبصورت تھا کہ شاید بہاروں کے رنگ بھی شرما جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس Adopt کرلوں۔۔۔ میں اسے اپنے ساتھ لگائے بچوں کی انتظامیہ کے پاس چلا گیا۔ جانے کیسے میں نے ان سے بات کی پھر یہ کیسے ہوا کہ مجھے اس کی اجازت مل گئی۔

صائمہ اور میں دونوں یہ چاہتے تھے کہ کوئی بچہ Adopt کرلیں۔۔۔ میری شادی کو ابھی چند سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن بچوں کی محرومی نے پاگل کیا ہوا تھا جہاں بھی بچے نظر آتے حسرت ہوک بن کر میرے دل کو بھسم کر دیتی۔۔۔ اب یہ خواہش پوری ہوگئی تھی اور مجھے نعم البدل مل گیا تھا۔۔۔۔۔۔ صائمہ آج کل اپنے بھائی کے پاس لندن گئی ہوئی تھی اور میں اس وقت اکیلا ہی اس خوشی کو سمیٹے بچے کو لیے اپنے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے بہت سے کھلونے، تصویروں والی بے شمار کہانیاں اور سوئیٹس اس کے سامنے ڈھیر کر دیں اور پھر اس کے ساتھ ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

اب میں نے دیکھا ایک بار پھر اس کے چہرے پر ویسا ہی رنگ پھیلا۔۔۔۔

پھر وہ یک دم بول اٹھا ''نہیں چاہیے مجھے یہ سب کچھ۔۔۔۔''

وہ پہلی بار بولا تھا میں نے وارفتگی سے اپنے سلگتے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیئے۔

''میری جان۔۔۔۔۔'' میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اپنے قریب کیا۔

''کیا چاہیے تمہیں۔۔۔۔۔۔بتاؤ۔۔۔تم جو کہوگے میں تمہیں ہر قیمت پر دوں گا۔۔۔۔۔''

اس کے چہرے پر روشنی کی ایسی جگمگاہٹ پھیلی کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کائنات کی ساری روشنیاں اس کے سامنے ہیچ ہو جائیں۔۔۔۔

''ہاں۔۔۔۔۔ہاں بولو۔۔۔۔۔۔میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔۔۔۔ہاں بولو۔۔۔میں تمہیں دے سکتا ہوں۔۔۔ہاں بولو کیا لوگے۔۔۔۔۔؟''

اس نے اپنے خوبصورت گلابی ہونٹوں کو ذرا سا کھولا اور جگمگاتی جگنو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔۔۔۔

اور پھر شہد آمیز پر یقین لہجے میں بولا۔۔۔۔۔۔''ماما۔۔۔اور پاپا۔۔۔!!!''

(مشمولہ نیلی آنکھوں کے خواب، ۲۰۱۳)

نام	طارق اسمٰعیل ساگر
ولدیت	حافظ غلام جیلانی خان
پیدائش	۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء
جائے پیدائش	لاہور
آبائی قصبہ	کامل پور موسیٰ (اٹک)
تعلیم	ایم اے پولیٹکل سائنس

طارق اسمٰعیل ساگر کے آباواجداد کا تعلق علاقہ چھچھ کے ایک گاؤں کیمبل پور موسیٰ (اٹک) سے ہے۔ان کے والد حافظ غلام جیلانی سرکاری ملازم تھے اور بہ سلسلہ ملازمت لاہور میں مقیم تھے جہاں طارق اسمٰعیل ساگر کی ولادت ہوئی۔ان کا بچپن اور لڑکپن لاہور میں ہی گزرا۔

۱۹۶۸ میں انہوں نے سنڑل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک کی اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِتعلیم رہے اور ۱۹۷۰ء ایف اے کیا ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے گریجویشن کی۔زمانہ طالب علمی ہی سے صحافتی سفر کا آغاز کیا بعدازاں پولیٹکل سائنس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

پاکستان آرمی کے لیے خدمات انجام دیں بعدازاں انہوں نے طویل عرصہ تک نوائے وقت میں بہ طور میگزین اڈیٹر کام کیا۔بہ طور اڈیٹر ''سیارہ ڈائجسٹ'' اور ''روزنامہ جنگ'' میں بھی صحافتی خدمات انجام دیں اس کے علاوہ ''ماہنامہ حکایت'' اور قومی ڈائجسٹ کے ڈپٹی اڈیٹر بھی رہے۔انہوں نے لاہور میں اپنا پبلی کیشن ادارہ ''ساگر'' بھی قائم کر رکھا ہے۔جس کے زیرِاہتمام وہ ''ماہنامہ ساگر'' کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جس کے وہ چیف اڈیٹر ہیں اس ادارہ کے تحت بے شمار علمی وادبی کتب کی اشاعت کر چکے ہیں علاوہ ازیں ہفت روزہ ''نیا جہان میں بھی صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں اور مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہتے ہیں۔

ادبی سفر کا آغاز مختصر کہانیوں سے کیا ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ فیروزسنز ۱۹۸۹ء لاہور نے شائع کیا

۔اردو فلم سلاخیں کے علاوہ ۲۳ سے زاہد ڈرامہ سریل اور کئی خصوصی پلے لکھے۔

طارق اسمٰعیل ساگر نے ناول نگاری میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے ان کے قلم میں روانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک ان کی سو کے قریب کتابیں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔انہیں قومی زبان اردو، انگریزی، پنجابی، ہندکو، گورمکھی، ہندی کے علاوہ دیگر کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ان کی شخصیت و فن پر پنجاب یونی ورسٹی، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور، اور انٹرنیشنل یونی ورسٹی اسلام آباد میں ایم اے کے تھیسس لکھے گئے۔طارق اسمٰعیل ساگر سے راقم کا رابطہ ۲۰۰۹ء میں ہوا تھا۔اس کے بعد بھی انہوں نے محبتوں سے نوازا بعد ازاں خاور چودھری اور راشد علی زئی کی دعوت پر حضرو تشریف لائے۔

مطبوعات:

۱۔فرار کے بعد	۲۔شملے کا سوامی	۳۔کٹ آوٹ
۴۔گرفت	۵۔تھرڈ ایجنسی	۶۔دھوئیں کی دیوار
۷۔افغانستان پر کیا گزری	۸۔محاصرہ	۹۔حیدران
۱۰۔ٹارگٹ کہوٹہ	۱۱۔کریک ڈاون	۱۲۔کمانڈو
۱۵۔ڈبل کراس	۱۶۔اسامہ بن لادن	۱۷۔شکنجہ
۱۸۔دہشت گرد	۱۹۔وادی لہورنگ	۲۰۔آپریشن بلیوسٹار
۲۱۔میں دہشت گرد تھا	۲۲۔یلغار	۲۳۔جاسوس کیسے بنتا ہے
۲۴۔برف کا جہنم	۲۵۔فالکن کون	۲۶ کرپشن کا بھوت ناچ
۲۷۔تعاقب	۲۸۔بلیک واٹر	۲۹۔پاکستان (عالمی سازش کے نرغے میں)
۳۰۔عورت رات اور خون		۳۱۔اے راہ حق کے شہیدو
۳۲۔را	۳۳۔انکل ٹام کا دیس	
۳۴۔شری کانت	۳۵۔میں ایک جاسوس تھا	۳۶۔ریڈ الرٹ
۳۷،داعش دولت اسلامیہ عراق وشام	۳۸۔سازش	

۳۹۔کمانڈو جرنیل کا سرنڈر
۴۰۔آدم خور کا تعاقب
۴۱۔بے نام سی عقیدت ۴۲۔کفارہ
۴۳۔لال مسجد (آپریشن سائلنس)
۴۴۔مسافت
۴۵۔وطن کی مٹی گواہ رہنا
۴۶۔ڈرگ مافیا
۴۷۔کراس فائر
۴۸۔آخری گناہ کی مہلت
۴۹۔بھٹکا ہوا راہی
۵۰۔روشنی کا راز ۵۱۔الاؤ
۵۲۔کٹ آوٹ
۵۳۔شکاریوں کا شکاری
۵۴۔کورٹ مارشل
۵۵۔لہردار پانیوں کی کڑواہٹ
۵۶۔لہو کا سفر
۵۷۔نجات
۵۸۔بیس کیمپ
۵۹۔دیتا کی موت
۶۰۔آپریشن ڈیزرٹ سٹارم
۶۱۔چناروں کے آنسو
۶۲۔کارگل کراس
۶۳۔جب دشمن نے للکارہ
۶۴۔تم کتنے بھٹو مارو گے
۶۵۔آن دی ریکارڈ
۶۶۔اور حصار ٹوٹ گیا
۶۷۔پھندا
۶۸۔محمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ
۶۹۔مکتی بانی سے آپریشن بلیو سٹار تک
۷۰۔خفیہ ایجنسیوں کی دہشت گردی
۷۱۔اور امریکہ لرز اٹھا
۷۲۔پورب کی سمت
۷۳۔بلوچستان کا آتش فشاں
۷۴۔بارہ اکتوبر کی کہانی ۷۵۔ٹارگٹ پاکستان تھا

سدا سہاگن

طارق اسمٰعیل ساگر

گوہر جان! حوالدار نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا، چاچا علم دین اور صغراں خاصے پیچھے رہ گئے تھے وہ رک کر ان کا منتظر ہو رہا۔

''بیٹی بشیر کو مجھے پکڑا دے، تو تھک جائے گی۔۔'' وہ اپنی بہو سے مخاطب ہوا۔

''نہیں چاچا، میں اسے وہاں تک خود لے کر جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ گھمبیر اور پر سکون تھا۔ ایسا کہ جیسا خاموش پانیوں کے نیچے چکراتے طوفان کا۔

چاچا خاموش ہو گیا، اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ بڑی عجیب سی خواہش تھی صغراں کی چھوٹے سے اسٹیشن سے اتر کر تانگے پر بیٹھ کر وہ یہاں تک آئے تھے۔ اس سے آگے راستہ کچا تھا اور انہیں پیدل چل کر جانا تھا۔ چاچا علم دین اور گوہر جان حوالدار دونوں نے اس ننھے بشیر کو گود میں اٹھانے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں علم تھا کہ صغراں پچھلے ایک ہفتے سے بیمار ہے لیکن گھر سے یہاں تک اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی بشیر کو خود سے جدا نہ کیا۔

''پاگل ہے'' چاچا علم دین نے اپنے گلے میں پھنسے کرب کا گلہ گھونٹتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغراں یا گوہر جان کے سامنے کسی بزدلی کا مظاہرہ کرے۔ پچھلے دو تین برسوں سے وہ گاؤں والوں سے چھپ چھپ کر بہت رو چکا تھا اور اب تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے ہوں گے، لیکن اب جو اچانک یہ کرب اس کے اندر سے پھوٹا تو اسے یہی گمان گزرا کہ اس کے وجود میں خون کی بجائے آنسوؤں کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ ان کے قریب آنے پر گوہر جان نے قدم آگے بڑھانا چاہا تو جیسے ٹھٹھک کر رہ گیا۔

''کیا نام بتایا تھا تو نے بچہ اس کا؟''

''جا کے۔ چاچا! جا کے۔'' گور جان نے اس کی طرف مڑے بغیر جواب دیا۔

''جاکے'' کا نام سنتے ہی چاچا علم دین کو جیسے ایک دم سے ساری کہانی یاد آ گئی، وہ کہانی جسے بھلانے کے لیے اس نے بیس سال کا سنیاس بھگتا تھا بیس سال تک اس نے جس درد کو اندر ہی اندر دبائے رکھا تھا، وہ زہر یاد بن کر اس کی شریانوں میں پھوٹ پڑا۔ گاؤں کا نام جان کر چاچا علم دین کو یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر ہونے والے زوردار دھماکے سے پھٹ کر فضا میں بکھر گیا ہو۔

سرحد یہاں سے بمشکل تین چار میل دور ہی ہوگی۔ اس کے لاشعور سے زینب زندہ پیر کی طرح انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ بٹالے سے وہ اپنے دو بیل، ایک گڈا، غلام محمد اور زینب کو لے کر بمشکل ہی قافلے میں شامل ہو پایا تھا۔ باقی سارا اثاثہ تو پہلے ہی لٹ چکا تھا، پھر اس کا زینب اور غلام محمد کے سوا اور تھا بھی کیا۔ ساری برادری کی مخالفت مول لے کر اس نے زینب کو اپنایا تھا۔ کس کس نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ علم دین میں کیا کمی تھی، گھر بار، ڈھور ڈنگر، اپنی زمین کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ برادری والا تھا۔ اردگرد کے دس پندرہ دیہاتوں میں تو اس کی برادری کے لوگوں کی چودھراہٹ تھی، لیکن تھا راجپوت کا بچہ۔ بس ایک مرتبہ جب زینب سے کھڑی مالی کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو زینب سے ورنہ ساری عمر یونہی گزار دے گا تو پھر ڈر کا ہے کا۔

اور ایک روز ہرچول کے راجپوت جیسے زمین میں گڑ گئے، جب ان کے لڑکے نے ماچھیوں کی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ چوہدری اللہ وسایا نے پہلے تو طیش میں آ کر بھری پنچایت میں اسے عاق کر دیا۔ لیکن ٹوٹی بانہیں گلے کو ہی آتی ہیں۔ جب اسے علم ہوا کہ اس کا گھبرو پتر سر پر ٹوکری رکھ کر منڈی میں پلے داری کرنے لگا ہے تو جیسے وہ تڑخ کر رہ گیا۔ راجپوتی آن بان کی فلک بوس عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی اور ہرچول کے باسی انگشت بدنداں رہ گئے۔ جب انہوں نے ایک روز اپنے نمبردار چوہدری اللہ وسایا کو ماچھیوں کے گھروں میں جاتے دیکھا۔

''چل اٹھ پتری اپنے گھر چل۔'' اس نے زینب کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ غلام محمد تب بمشکل سے تین چار ماہ کا ہوا تھا۔

''میرے ایسے بھاگ کہاں تھے۔ یہ تو بس میرے غلام محمد کی وجہ سے مجھے یہ مان ملا۔'' اس نے چوہدری اللہ وسایا کے گھر پہنچتے ہی خوشی سے بے قابو ہو کر علم دین سے کہا۔

''بڑے نصیبوں والا ہے میرا لال۔'' علم دین نے بڑھ کر غلام محمد کو گود میں بھر لیا۔ کرنے کو تو چوہدری

اللہ وسایا اپنی سی کر گزرا۔لیکن برادری نے اس کے فیصلے کو بادل نخواستہ قبول کیا تھا۔

بٹوارہ ہوا تو غلام محمد بمشکل ڈیڑھ دو برس کا ہوگا۔ان کے گاؤں پر جیسے سارے بٹالے کے سکھوں نے مل کر حملہ کر دیا تھا کیونکہ اردگرد کے دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کر مسلمان انہی کے ہاں پناہ لے رہے تھے۔راجپوت بھی کسی مائی کے جنے تھے۔بلوائی تب ان کے گھروں تک پہنچ پائے جب ایک ایک کر کے سارے کٹ گئے جو بچے وہ نہتے تھے یا زخمی۔کیا مجال جو جیتے جی انہوں نے کسی کو اپنے گاؤں کی جوہ میں پھٹکنے دیا ہو۔

کیا کیا عذاب نہیں بھگتا تھا علم دین اور دوسرے قافلے والوں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ابھی وہ سرحد سے بمشکل دس بارہ میل دور تھے۔جب اچانک ایک منظم بلوائیوں کا گروہ ان پر آن پڑا۔علم دین نے بیلوں کو بھگانا چاہا،لیکن بھوکے پیاسے جانور کہاں تک حقِ نمک ادا کرتے۔ایک کرپان سے مسلح بلوائی اس کے گڈے پر بھی چڑھ آیا اس نے کرپان لہرا کر پہلا وار ہی زینب کی آغوش میں دبکے غلام محمد پر کیا تھا۔زینب نے تڑپ کر بچے کو اپنے نیچے دبا لیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغی کسی گدھ کو دیکھ کر اپنے بچوں کو پروں کے نیچے پناہ دیتی ہے،لیکن کرپان اپنا کام کر چکی تھی۔زینب کی گردن ایک طرف سے کٹ کر دوسرے کندھے سے آن لگی۔علم دین جو بدستور بیلوں کو بھگانے میں مصروف تھا تب جونکا جب وہ لٹ چکا تھا۔زینب کی چیخ نے اس کے تن مردہ میں بجلیاں دوڑا دیں،اس نے اپنے دائیں رکھی کلہاڑی تھامی وحشی بلوائی پر پل پڑا اور اسے کاٹ کر پھینک دیا۔پھر وہ دیوانہ وار زینب کی طرف پلٹا۔

''علمے ! رب رکھا ۔۔۔۔میرے ۔۔۔۔بچے کا خیال۔۔۔رکھنا ۔۔۔میرے کرموں میں اپنا۔۔ملک دیکھنا نہیں لکھا۔۔۔'' زینے نے آخری ہچکیاں لیں۔

''ہوش کر زینبے !ہوش کر۔۔پاکستان آنے والا ہے !زینبے۔نہیں۔۔نہیں۔۔!

''اوہ میرے مولا''،علم دین نے زینب کی ڈھلکی گردن دیکھ کر سسکاری بھری۔

اس نے غلام محمد پر ٹکی آنکھوں کے پپوٹے بند کر دیئے اور اسی طرح نڈھال سا بیٹھا رہا۔اسے نہ غلام محمد کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں نہ ہی قافلے والوں کی چیخم دھاڑ۔وہاں تو بس وہ تھا اور زینبے ۔پاکستان کب آیا؟اور مسلم لیگی ورکروں نے کب اسے زینبے سے الگ کیا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔وہ تو جیسے خواب میں چل رہا تھا۔

مہاجر کیمپ میں غلام محمد اس کے سینے سے چمٹا رہتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھا چپ چاپ فضاؤں میں بکھری اپنی زینب کی یادیں سمیٹتا رہتا۔ کارکنوں نے ہی اس کی تدفین کی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب علم دین کو ایک دوسرے ضلع میں تھوڑی سی زمین اور مکان الاٹ کر دیا گیا۔ پانچ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ ہر سال دبے پاؤں آتا اور اس کے فگار کلیجے پر قدم رکھتا آگے کو سرک جاتا۔ علم دین باقاعدگی سے ہر سال ''جاکے'' جایا کرتا یہی تو تھا وہ ''جاکے'' جہاں اس کی زینبے دفن تھی۔

بڑا سیلاب آیا تو قبرستان بھی بہہ گیا اور یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔ سارے خاندان نے اس اثنا میں اسے مجبور کیا کہ وہ دوسرا بیاہ کر لے لیکن وہ بھی ایک راجپوتنی کا جنا تھا کہ زینب کو دیا قول کبھی نہ بھلایا اس نے زینب سے کہا تھا۔ ''اگر اس کی شادی ہوگی تو زینب سے دور نہیں''۔

کہہ کہہ کے خاندان والے بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ علم دین نے زینب کی امانت میں خیانت نہ کی غلام محمد پر بھی جوانی اڈا اڈ کر آئی۔ جس کی راہ سے گزرتا، گاؤں بھر کی کنواریاں آنکھیں بچھاتیں۔

ایک روز سننے والوں نے سنا غلام محمد بھرتی کرنے والوں کی ٹیم کا انٹرویو دینے جا رہا ہے۔ اس وقت علم دین کو یوں لگا جیسے کسی نے ہاتھ بھر کر اس کا کلیجہ باہر نکال لیا ہو۔ کون تھا اس کا؟ تب زینب نے اس کے دل کے بند کواڑوں پر دستک دی اور اسے مبارک دی کہ اس نے زینبے کی امانت کی لاج نبھائی ہے۔ جس روز غلام محمد پہلی بار گاؤں چھٹی آیا اور علم دین کے سینے سے لگا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ غلام محمد نے آج پہلی مرتبہ باپ کو روتے دیکھا تھا، اسے کون بتاتا کہ علم دین کب نہیں رویا تھا۔ یہ الگ بات کہ سب الگ تھلگ اس نے اپنے غم کو غم ذات ہی بنایا سب سے اپنا روگ چھپا رکھا تھا۔!

''ابا جی'' اس نے حیرانی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں پتر آج تجھے وردی میں دیکھا تو خوشی سے آنسو نکل آئے۔ تیری ماں جیوندی ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔''

سال بعد ہی اس نے غلام محمد کو بیاہ دیا اور جب اس روز وہ بیٹے کی پیدائش کے چھ سات ماہ بعد چھٹی آیا تو علم دین کے گھر دیگیں چڑھیں۔ اس نے اپنے پوتے بشیر کی خوشی اپنے پتر کی آمد پر کی تھی چھٹیوں کے بمشکل پانچ روز بعد ہی نائیک غلام محمد کو بلاوا آ گیا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا، اسے امیر جنسی واپس بلا لیا گیا۔

گاؤں کے اسٹیشن تک وہ سب اکٹھے ہی آئے تھے پھر علم دین اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر الگ ایک کونے میں لے گیا۔اس کا سینہ دھوکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''پتر میں اس دن کا پچھلے اٹھارہ سال سے انتظار کر رہا ہوں۔پتر ان لوگوں نے تیری ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا۔تب میں اکیلا تھا اور نہتا بھی۔میرا انتقام لینا بچہ! اپنی ماں کا بدلہ ضرور لینا۔تو اکیلا نہیں! نہتا بھی نہیں ہوگا تو۔۔۔بچہ یہ سب بلوائی ہیں۔بڑے خونخوار ہیں۔انہیں بتا دینا پتر کہ اب غلام محمد جوان ہو گیا ہے وہ اپنے ماں باپ کے دودھ کی لاج پال سکتا ہے۔''

نائیک غلام محمد صغراں کے قریب پہنچا تو بشیر ہمک کر اس کی بانہوں میں آرہا۔صغراں وقت بڑا کم ہے، میں جینے کی خواہش لے کر نہیں جا رہا۔

دعا کرنا اللہ سرخروئی عطا کرے قسمت پھر کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دے۔میری امانت کی راکھی کرنا جس طرح میرے باپ نے میری ماں کی امانت کو سنبھالا تھا۔وہ نجانے کیا کہتا رہا۔۔۔صغراں بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔اس کے سینے میں غلام محمد کی طرح فولاد کا دل تو تھا ہی۔

گاڑی میں غلام محمد بیٹھا تو صغراں نے روتے روتے اس کے ہاتھ میں سرخ کڑھائی والا رومال تھما دیا۔غلام محمد نے چند ثانیے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا پھر اپنی اگلی جیب میں رکھ لیا۔گھی والے پراٹھے اور اچار ایک دوسرے دسترخوان میں بندھے اس کے قریب رکھے تھے اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا اور گاڑی رینگنے لگی۔علم دین ان دونوں سے ذرا پرے کلیجے پر سل رکھے کھڑا تھا۔گاڑی رینگی تو وہ بے اختیار آگے بڑھا اور چلتی گاڑی سے باہر نکلے غلام محمد کے سر کو چوم لیا۔گاؤں کے لوگ اس وقت تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب تک ان کا غازی مردان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔علم دین البتہ وہیں کھڑا رہا۔سسکیاں بھرتی صغراں اس کے سینے سے آن لگی تھی۔

جس روز غلام محمد سرخرو ہو کر لوٹا تو چاچا علم دین کا جلال دیدنی تھا میت فوجی ٹرک میں آئی تھی۔اس کی یونٹ کے جوانوں نے تابوت کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔غلام محمد گلاب کے پھولوں میں کھلا پڑا تھا۔

''خبردار کوئی نہ رونا۔میرے بچے نے میرا مان بڑھایا ہے۔زینبے زینبے! دیکھ رہی ہے تو اپنے لال کو تیرے پاس آ گیا ہے زینبے! مجھے اکیلا چھوڑ کر۔۔۔حوالدار گوہر جان نے چاچا علم دین کو بازو سے پکڑ کر

وہاں سے ہٹا دیا۔

اردگرد کے سارے گاؤں اس کے لال کی بارات پر امڈ پڑے تھے۔فلک نے ایسا جنازہ نہ کبھی دیکھا نہ ہی اس گاؤں سے پھر کوئی اس دھج سے اٹھا۔عدت کے ایام پورے ہوئے تو صغراں کے والدین اسے لینے آئے۔

''کونسا گھر۔۔۔میرا گھر تو یہی ہے۔''اس نے جانے سے انکار کر دیا۔چاچا علم دین دہل اٹھا۔''خدایا! تاریخ کیا خود کو کبھی دہرائے گی۔''اس نے ایک سال تک سارے ہی حربے آزما لیے لیکن صغراں نے کبھی خود کو بیوہ نہ جانا۔۔وہ نائیک غلام محمد کی چوکھٹ سے یوں لگی کہ پھر کبھی نہ اٹھی۔دو سال تک چاچا علم دین کی خواہش رہی کہ وہ خود اپنے بچے کی شعادت گاہ دیکھے۔وہ ان راہوں کی دھول کو اپنی آنکھوں سے چننا چاہتا تھا۔جہاں اس کے جیالے شہید نے اپنے قدم رکھے تھے۔تین سال بعد ایک روز حوالدار گوہر جان اپنا وعدہ پورا کرنے آ گیا۔

اس روز سارا گاؤں حیران رہ گیا جب صغراں نے اپنا سہاگ کا جوڑا پہنا۔وہ دلہن بنی جا رہی تھی۔گاؤں والے رخصت کرنے اسٹیشن تک گئے اور وہ لوگ ''جا مکے'' پہنچ چکے تھے۔علم دین کے گبھرو نے اس مقام پر اپنی ماں کا قرض چکایا تھا۔جہاں وہ دفن تھی۔

کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک ایک جگہ پہنچ کر گوہر جان رک گیا۔گاؤں کے لوگوں نے یہاں ایک چھوٹی سی خانقاہ بنا رکھی تھی۔جہاں طاقچوں میں بجھے ہوئے دیئے رکھے تھے۔انہوں نے کئی مرتبہ یہاں سے روشنی پھوٹتے دیکھی اور اب اس جگہ کو عقیدت گاہ بنا لیا تھا۔

''یہ ہے وہ جگہ چاچا جہاں نائیک غلام محمد مورچہ بند تھا۔''اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی۔

''اور یہاں وہ گن دشمن نے چھپا رکھی تھی۔''اس نے خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔یہاں سے رینگتا رینگتا غلام محمد یہاں تک پہنچا۔اس جگہ اس کے سینے پر برسٹ لگا۔یہاں سے اس نے رفتار لگائی اور گن پر گرنیڈ پھینک دیا۔اس سے آگے گوہر جان کچھ نہ کہہ سکا اس کا گلہ رندھ گیا۔صغراں نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس مٹی کو بوسہ دیا۔پھر چاچا علم دین سحر زدہ سا آگے بڑھا اور اس کی دیکھا دیکھی گاؤں کے ان لوگوں نے بھی جو وہاں اکٹھے ہو گئے تھے دعا کو ہاتھ اٹھا دیئے۔آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے پلٹ کر اس

نے ننھے بشیر کی طرف دیکھا جو اپنی ماں کے قریب ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ پھر بشیر میں سے غلام محمد کی لرزتی شبیہہ ابھری اور چاچا علم دین نے اپنی پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر اسے بے اختیار سینے سے چمٹا لیا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے اور سورج کا آتشیں گولا ریلوے لائن کے پار درختوں کے وسیع سلسلے میں ڈوب رہا تھا، اور گاؤں کے لوگ عقیدت سے سدا سہاگن کے گرد دائرہ باندھے کھڑے تھے۔

(لہردار پانیوں کی کڑواہٹ، فیروز سنز لاہور ۱۹۸۹ء)

نام	اقبال حسن خان
ولدیت	اخلاق حسن خان
تاریخ پیدائش	۲مئی ۱۹۵۳ء
جائے پیدائش	راول پنڈی
تعلیم	ایم اے(انگریزی،اردو)
رہائش	حسن ابدال(اٹک)

ڈرامہ رائٹر، ناول نگار اور افسانہ نویس اقبال حسن خان کا تعلق ضلع اٹک کی تحصیل حسن ابدال سے ہے۔ابتدائی تعلیم سنٹ میریز سے حاصل کی، گوال منڈی کے ایک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، بعدازاں مزید تعلیمی مراحل طے کیے۔اردو اور انگریزی میں ایم اے کیا۔

سیاسی اعتبار سے کمیونسٹ ہیں۔۱۹۶۹ء میں ریڈیو پاکستان سے بہ طور ڈرامہ رائٹر آغاز کیا اور ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامے اور متعدد فیچر لکھے اور کئی ڈراموں میں خود صداکاری بھی کی، ریڈیو کے لیے ایک پروگرام ''آدمی نامہ'' بھی کیا جسے انہوں نے خود ہی لکھا اور براڈ کاسٹ کیا۔

ٹیلی ویژن کے لیے تیرہ اقساط پر مشتمل پچاس منٹ کے دورانیہ کے کئی کھیل لکھے، پچیس منٹ کے بہت سے ڈامہ سیریل اور ڈرامہ سیریز لکھیں، جن میں نیند، آدھی دھوپ، اچانک، تنکے، آتش، ایندھن، طلوع، ایک اور لوسٹوری، کی جاناں میں کون، کھڈونے وغیرہ نے مقبولیت حاصل کی۔بارہ مرتبہ پی ٹی وی ڈرامہ ایواڈ کے لیے ان کی نامزدگی ہوئی۔

۲۰۰۲ء میں ڈرامہ ''ایندھن'' کے لیے بہترین ڈرامہ رائٹر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔اب تک انہیں تین بار پی ٹی وی ایوارڈ دیا گیا جن میں پنجابی ڈرامہ سیریز ''کھڈونے'' بھی شامل ہے۔علاوہ ازیں جیو ٹی وی کی ٹیلی فلم کی جاناں میں کون کو بہترین ٹیلی فلم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ناول ''گلیوں کے لوگ کا ہندی ترجمہ ہو رہا ہے اور اس ناول پر ''گلیوں کے لوگ'' کے نام سے بولی

وڈ میں فلم بھی بنائی جا رہی ۱۹۸۱ء میں اقبال حسن خان کی شادی ہوئی، ان کے دو بچے ہیں اور دونوں ہی ڈاکٹر ہیں۔

مطبوعات:

۱۔ آخرِ شب

۲۔ شہزادے کی سرگزشت

۳۔ راج سنگھ لاہوریا

۴۔ گلیوں کے لوگ

۵۔ یہ راستہ کوئی اور ہے
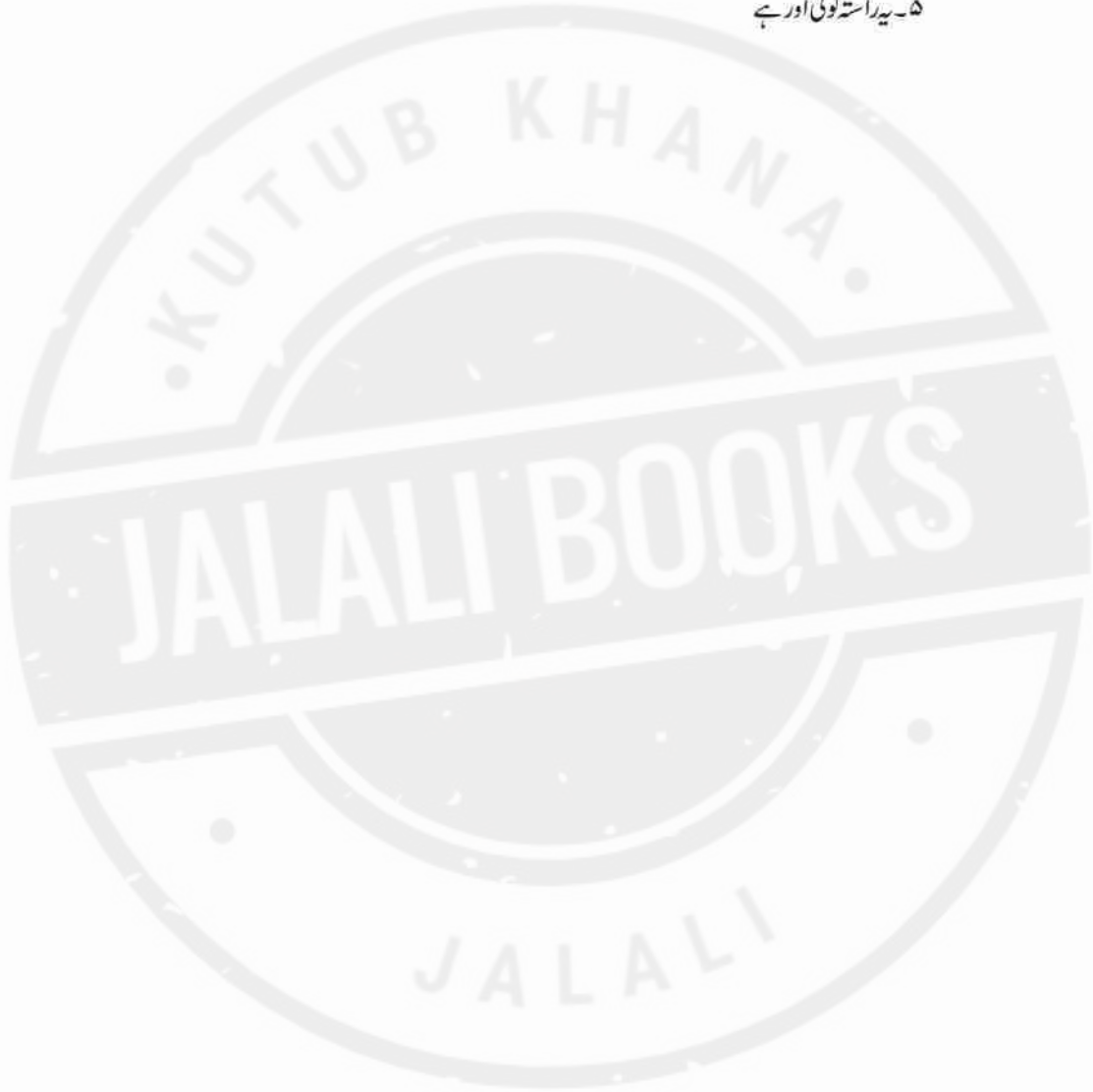
مٹی کا ڈھیر

اقبال حسن خان

ہم دونوں نے ایک ساتھ نو سال ایک ہی دفتر میں نوکری کی تھی۔

دوستی ہونے کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ ہم دونوں کی نشستیں اگے پیچھے تھیں اور شاخ بھی ایک ہی تھی۔

وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا آدمی تھا، بس ایک خرابی تھی جسے میں شروع میں مذاق سمجھا لیکن پھر جب اسے سنجیدہ دیکھا تو مجھے کچھ چڑ سی ہونے لگی۔اس کے پاس دفتر کے ہر شخص کی ریٹائرمنٹ کا حساب تھا ہر ماہ وہ صرف اسی دفتر کے نہیں، ہیڈکواٹر کے ریٹائر ہونے والوں کے بھی نام بتاتا:

''یہ اصغر صاحب ہیں، ارے بھائی وہی جو یہاں آڈٹ ٹیم کے ساتھ آئے تھے۔نومبر کو ریٹائر ہو رہے ہیں اسی سال۔''

وہ خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ مجھے مطلع کرتا مجھے تو اصغر کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ میں نے کہا:

''ہوگا یار ہمیں کیا۔''

''ہوگا یار ہمیں کیا۔؟'' وہ سنجیدہ ہو جاتا اور کہتا:

''تمیں کیا ارے تمہیں اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں کہ میں اس طرح سینیارٹی لسٹ میں گیارویں نمبر پر آ جاؤں گا؟ اس کے بعد نعیم کا نمبر ہے، پھر بشیر اور پھر سہیل کا۔ یوں سمجھو اگلے چھ سال اگلے چھ سال میں تو یہ تینوں گئے۔'' وہ ہنس کر کہتا

''پھر کیا ہوگا۔۔۔۔؟ ''

وہ ہنستا اور خلا میں دیکھ کر کہتا

''سہیل کے بعد احمد صاحب اور پھر میرے منیجر بننے میں فقط دو سال رہ جائیں گے۔۔۔۔'''' اور

اس میں وقت کتنا لگے۔۔''میں پوچھتا۔

وہ ہنس کر چٹکی بجاتا اور کہتا؛

''گیارہ سال۔۔صرف گیارہ سال، دیکھو میں ابھی پینتیس کا ہوں۔گیارہ سال بعد چھیالیس کا ہوں گا۔چودہ برس ہوں گے میرے پاس۔اس دوران ترقیاں ہونا بند تو نہیں ہو جائیں گی، ہوسکتا ہے آپ کا بھائی ایم ڈی تک جا پہنچے۔ڈی ایم ڈی کی پوسٹ تو کہیں گئی ہی نہیں۔''

مجھے بیرون ملک ایک اچھا موقع مل گیا اور میں چلا گیا۔شروع میں کچھ خط و کتابت ہوئی، دو چار مرتبہ فون پر بھی بات ہوگئی لیکن دھیرے دھیرے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، کبھی چھٹی پر آتا تو اتنا وقت ہی نہ ہوتا کہ دفتر کے پرانے ساتھیوں سے مل سکوں۔اس مرتبہ بھی شاید ایسا ہی ہوتا میں صدر میں گرم موزے تلاش کر رہا تھا ،ایک موڑ مڑا تو سامنے سے وہ نکل آیا۔ہم بہت گرم جوشی سے ملے۔وہ مجھے قریب ہی ایک ہوٹل گیا ۔پرانے قصے چھڑ گئے ،لیکن اس کی دفتری ساتھیوں کی ریٹائرمنٹ کی فہرست رکھنے والی عادت نہیں گئی تھی۔

وہ بولا'' دیکھو میرا حساب کیسا درست بیٹھا؟ مین اس وقت سپروائزر ہوں، نعیم اگلے ماہ ریٹائر ہو رہا ہے۔بشیر بھی ساٹھ کو پہنچنے والا ہے۔یوں سمجھو یہ دونوں دو تین مہینے کے فرق سے جائیں گے۔سہیل البتہ دو سال اور نکالے گا اور پھر احمد صاحب میرے رستے میں کچھ سال کھڑے رہے گے پھر تمہارے یار کا نمبر ہے۔تم پردیس میں جہاں بھی، جیسے ہی دو ہزار تین کی سترہ جون آئے، سمجھ لینا تمہارا یار منیجر کرسی پر بیٹھ چکا ہے۔''

جدا ہونے سے پہلے میں نے وعدہ کیا کہ واپسی سے پہلے ایک مرتبہ اس کے گھر ضرور آؤں گا۔تین چار دن گزر گئے ساڑھے چھ بجے مجھے بیوی نے سوتے سے جگا دیا اور بتایا کہ پرانے دفتر سے کلیم صاحب کا فون ہے۔میں پریشان ہوگیا۔

کلیم صاحب بتا رہے تھے کہ رات اچانک اس کا انتقال ہوگیا۔مجھے بڑا دکھ ہوا ابھی تین چار دن پہلے ہی تو ہم ملے تھے۔

میں اس کے جنازے میں شامل ہوا۔جب اسے قبر میں اتار رہے تھے تو میرے عقب میں کھڑے دو آدمی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔جیسا کہ ہمارا دستور بن گیا ہے۔ایک صاحب بولے۔

"آپ فکر نہ کریں ایک ہفتے میں آپ کا کام ہو جائے گا وعدہ ہے۔"

میں نے دوسری آواز سنی۔

"یعنی چوبیس تک، آج سترہ ہے نا۔یعنی میں سمجھوں۔۔۔۔۔"

میں نے مٹی کے ڈھیر کی طرف دیکھا جو تیزی سے ابھر رہا تھا۔ مجھے وہ پرامید چہرہ دکھائی دیا جو چند روز پہلے میرے سامنے بیٹھا دو تین سال بعد آنے والی اس تاریخ کا حوالہ دے رہا تھا اور جس کے انتظار میں اس نے نجانے کتنے ہی برس گزار دیئے تھے۔

نام	سعید اختر ملک
ولدیت	محمد خان
پیدائش	۱۴اپریل ۱۹۵۵ء
جائے پیدائش	دربٹہ تلہ گنگ ضلع کیمبل پور (حال) ضلع چکوال
تعلیم	ایم۔بی۔اے

ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول دندہ شاہ بلاول سے حاصل کی، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول لاوہ سے کیا اس کے بعد سیالکوٹ چلے گئے اور گورنمنٹ مرے کالج میں داخلہ لے لیا جہاں سے انہوں نے ایف۔ایس۔سی پاس کی۔گریجویشن اور ایم۔اے کی ڈگری پنجاب یونی ورسٹی سے حاصل کی۔بعدازاں پرسٹن یونی ورسٹی اسلام آباد سے فناس اینڈ اکاونٹس میں ایم۔بی۔اے کیا۔ابتدا میں شعبہ تدریس کو ذریعہ معاش بنایا اور واہ کنٹ سے ملازمت کا آغاز کیا پھر پاک فضائیہ میں کچھ عرصہ اسی شعبہ میں خدمات انجام دیں۔اس کے بعد css کا امتحان پاس کر کے آڈٹ اینڈ اکاونٹس گروپ میں شمولیت اختیار کی اور وفاقی حکومت کے مختلف محکموں میں خدمات انجام دیں جن میں بہ طور کنٹرولر ملٹری اکاونٹس راولپنڈی، ڈائریکٹر جنرل پاکستان ہاوسنگ اتھارٹی اسلام آباد کے علاوہ AGPR ، PTCL اسلام آباد، راولپنڈی کلیکٹوریٹ سیلز ٹیکس، راولپنڈی میڈیکل کالج اینڈ الائیڈ ہاسٹل راولپنڈی حکومت پنجاب میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔اور اپنی مدتِ ملازمت کے دوران سب سے آخر میں آزاد جموں کشمیر مظفر آباد اور ERRA اسلام آباد میں بہ طور ڈائریکٹر جنرل آڈٹ ریٹائر ہوئے۔

ادبی سفر کا آغاز زمانہ طالب علمی میں نثر ہی سے کیا اور جب ان کی پہلی کہانی آداب عرض میں شائع ہوئی تب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے اس کے بعد ماہ نامہ ہلال ملٹری میں ان کی تحریریں چھپتی رہیں۔میٹرک تک ان کے قابل ذکر اساتذہ میں سید ارشاد حسین اور محترم صداقت حیات ہیں جن کے زیرِ اثر ان میں ادبی ذوق پروان چڑھا۔بعدازاں مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر آسی ضیائی سے ادب کو

پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

سعید اختر ملک نے فورم فار آرٹس اینڈ کریٹیو ٹیلنٹ ''فیکٹ'' اسلام آباد کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اس فورم کے زیرِ اہتمام بہت ساری تقریبات کا اہتمام کیا جو باقاعدگی نیشنل لائبریری اسلام آباد اور اکیڈمی آف لیٹرز میں منعقد کی جاتی رہیں۔ ۲۰۰۵ء میں جب ان کا پہلے افسانوی مجموعہ چھپا تو اسی تنظیم ''فیکٹ'' نے اس کتاب کی تقریب رونمائی کا اہتمام ہالی ڈے ان اسلام آباد میں کیا جس میں محترمہ عائشہ مسعود ملک اور ان کی جانب سے دعوت پر مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ اس تنظیم نے اس تقریب کو پروقار بنایا اور بانو قدسیہ، پروفیسر فتح محمد ملک، عطا الحق قاسمی، احمد فراز، منشا یاد، حمید شاہد کے علاوہ راول پنڈی اسلام آباد اور دیگر شہروں سے بھی معتبر اہلِ قلم اور فاطمہ جناح یونی ورسٹی اسلام آباد سے ادب سے دلچسپی رکھنے والی طالبات کو بھی بڑی تعداد میں اکٹھا کیا۔ بہت قلیل وقت میں اس تنظیم نے ادبی حلقوں میں اپنا سکہ جمالیا۔

ملازمت اور ادب کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات کا خیال بھی دامن گیر رکھا خاص طور پر اپنے علاقے میں تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ انہوں نے اس وقت کے سینئر جوائنٹ سیکٹری وفاقی حکومت ملک محمد ظہور انور کے ساتھ مل کر اعوان فاونڈیشن پاکستان کی بنیاد رکھی اور اپنے علاقے میں اکیڈمی آف ایکسلینس کے نام سے تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی جو تلہ گنگ، ٹمن، ونہار اور لاوہ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ آج کل آپ اعوان تنظیم پاکستان کی سپریم کونسل کے بہ طور مرکزی سیکٹری جنرل خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مطبوعات:

سوچ دالان (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۵ء

سوچ دالان

سعید اختر ملک

بابا جیون خان میرے چھوٹے سے گاؤں کا لوہار بھی تھا اور بڑھئی بھی۔ لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، چہرے پر سفید داڑھی اور سر پر ہر وقت ایک اُجلی سی پگڑی بجی رہتی تھی۔ وہ پانچوں وقت کا با جماعت نمازی تھا۔ اس کے دھیمے لہجے میں متانت اور شائستگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر قدم رکھتا اور گلی میں پاس سے گزرنے والا خیر وعافیت پوچھتا تو ڈھیروں دعاؤں اور دور بلاؤں کی پوٹلیوں کا گویا منہ کھل جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گاؤں کی بہت ساری عورتیں اس یقین واعتقاد کے ساتھ اس کے پاس مرغے حلال کروانے کے لئے آتیں کہ بابا جیون خان کے ہاتھوں ذبح کی ہوئی مرغی کے گوشت کی پاکیزگی اور لذت کا کوئی جواب نہیں۔ اس کے چھوٹے سے صحن میں صبح منہ اندھیرے ہی گاؤں کے چھوٹے بڑے ہر عمر کے لوگ کاندھوں پر کیکر، پھلاہ اور کہو کی لکڑیاں اٹھائے اپنے اپنے ہل، پھال، پنجالی، مانجھا، کراہ، ترینگل وغیرہ مرمت کروانے کے لئے اکٹھے ہوتے جاتے اور ایک نیم دائرے کی شکل میں بابا جیون خان کے کے ارد گرد بیٹھتے جاتے۔ اُن میں سے بعض آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تو کچھ اپنی کمر اور گھٹنوں کے ارد گرد اپنے اپنے پٹکے لپیٹ کر انہیں مخصوص انداز میں کس کر اور گرہ لگا کر بیٹھ جاتے۔ اور دنیا جہاں کے موضوعات زیر بحث لائے جاتے۔ نظریں بار بار آسمان کی جانب اُٹھتیں اور بادل کے ٹکڑوں اور رنگت کا قیاس کرتے ہوئے بارشوں کی آس لگائی جاتی۔ بعض شہر پلٹ نوجوان مختلف سائنسی ایجادات اور کمالات کا ذکر کر دیتے۔ تو کئی بوڑھوں کے منہ حیرت واستعجاب سے کھلے کے کھلے رہ جاتے۔

بابا جیون خان ہمیشہ اپنے کام میں جتا رہتا۔ دائرے میں موجود ہر شخص کی نظریں اس کے ہنر مند ہاتھوں کی حرکات وسکنات پر مرکوز رہتیں۔ اسے جب بھی کسی مخصوص اوزار کی ضرورت پڑتی تو وہ فقط اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا اور پھر فوراً ہی کئی ہاتھ لپکتے اور وہ اوزار اسکے ہاتھوں میں جا پہنچتا۔ وہ بہت کم

بولتا تھا۔ بس دھیرے سے کسی کی بات پر مسکا دیتا۔ ہاں البتہ جب بابا فتح دین اور بابا مہر خان لاٹھیوں کو ٹیکتے ہوئے اور ایک دوسرے کو ٹہوکتے ہوئے صحن میں داخل ہوتے تو پھر ہنسی مذاق اور قہقہوں کا ایک ''گھڑس'' سا مچ جاتا۔ ایسے میں بابا جیون خان اپنے اوزار پھینک کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگتا اور جب اس کی ہنسی...... کھانسی میں تبدیل ہونے لگتی تو وہ پھر اپنے کام میں جت جاتا۔ ایسے موقعوں پر موجود نوجوان ان دونوں بوڑھوں کی چھیڑ چھاڑ اور بذلہ سنجی سے خوب محظوظ ہوتے۔ بابا جیون کی بیوی کسی کی اماں تھی، یا کسی کی دادی، پھوپھی ماسی یا بہن، غرضیکہ ایسے کون سے رشتے تھے جو اس سے منسوب نہ تھے۔

وہ اکثر اوقات صحن میں ہلکے ہلکے جھاڑو دیتے ہوئے دائرے کے پاس آ کر بڑے غیر محسوس طریقے سے اس میں شامل ہو جاتی اور گھنٹوں ان سب کی باتوں سے لطف اٹھاتی رہتی۔ اُن کے صحن میں داخل ہونے والا ہر شخص ایک دوسرے سے مانوس ہوتا تھا اور ہر آنکھ سے اپنائیت کا نور برستا رہتا تھا۔ البتہ دوپہر کو عام طور پر گاؤں کی عورتیں پیڑھی، مدھانی، گھڑونچی، چرخہ، پنگھوڑے وغیرہ مرمت کروانے کے لیے ان کے گھر آتیں۔ تو پھر بابا جیون کی بیوی جانِ محفل بن جاتی۔ اکثر خواتین کے سر پر یا بغل میں ایک آدھ ایلومینیم کی دیگچی ضرور ہوتی جس میں مناسب مقدار میں دودھ، دہی، لسی، مکھن کا پیڑا یا تازہ بنی ہوئی بوہلی وغیرہ ہوتی۔ بعض تو بابا جیون کی بکریوں کے لیے سبز چارے کی گٹھڑی یا بیری کی دو چار ہری بھری شاخیں جن کو عرف عام میں ''لانگی'' کہا جاتا ہے، بھی لیے چلی آتیں۔ اس دوران جب گاؤں کے سارے دکھ پل بھر میں پلکوں کی منڈیروں سے چھلکنے لگتے تو پھر انہیں میلے دوپٹے کے پلوؤں سے لپیٹ لپیٹ کر رکھ لیا جاتا۔

بابا جیون کے لیے سال بھر میں اٹھائی جانے والی فصلوں کا ایک مخصوص حصہ مقرر ہوتا تھا۔ اس کے گھر میں چنے، گندم، جو، جوار اور باجرہ کی اتنی بوریاں اکٹھی ہو جاتیں کہ بسا اوقات سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ سردیوں کے موسم میں چھوٹے زمیندار بابا جیون سے غلہ وغیرہ خرید کر یا اُدھار لے کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے تھے۔ ہر دیکھتی آنکھ نے اس گھرانے کو ہمیشہ خوشحال پایا۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا اور پھر اُس کے ایک بیٹے جمال خان نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور شہر میں ایک سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ جبکہ دوسرے بیٹوں کمال خان اور حیات خان نے گاؤں کے باقی تمام لڑکوں کی طرح پڑھائی پر کوئی توجہ نہ دی تو بابا جیون نے انہیں اپنے ساتھ کام پر لگا لیا اور پھر تینوں

بیٹوں کی شادیاں بھی دھوم دھام سے کردیں۔ جمال خان دوتین مرتبہ خلیجی ریاستوں کا چکرلگا آیا۔ تو ہرفرد کی کلائی پرچمکتی گھڑی اور چار چار بینڈ والے ریڈیو نے گھر کی پوری فضا ہی بدل ڈالی...... جمال خان نے شہر میں ایک خوب صورت گھر بنوایا...... بوڑھا باپ اپنے بیٹے کے لائق فائق ہونے کی تعریفیں کرتے نہ تھکتا تھا۔ اس کی اجلی سی پگ میں اب دوتین بل اور بڑھ گئے تھے۔ جمال خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر کی پرتعیش زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ اوراس کے بچے کبھی کبھار جب عید کی چھٹیاں منانے گاؤں آتے ......تو کمال خان اور حیات خان کی بیویاں اور بچے انہیں رنگ برنگے اور انگریزی تراش خراش کے لباس میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے۔ رشک وحسد اور اجنبیت کی ایک نامعلوم سی دیوار ان کے بیچ کھڑی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ کمال اور حیات کی بیویوں نے باقاعدہ خود کو حقیر اور پست گردانا شروع کر دیا گھر میں کشیدگی اس قدر بڑھتی چلی گئی ...... کہ بالآخر بابا جیون نے اپنے بیٹوں کو بلا کر اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کو کہہ دیا۔ کمال اور حیات خان نے بیویوں کی نوکیلی دلیلوں کے سامنے ہتھیار پھینک ڈالے اور قریبی شہر میں بچوں سمیت منتقل ہوگئے...... ماڈرن ازم کا وہ چور جس نے جمال خان کی شہر کی کوٹھی میں جنم لیا تھا اب پورے گھرانے کے ہرفرد کے ذہن میں تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔

کمال اور حیات جب صبح سویرے کام پر نکلتے تو خاکی رنگ کے بیگ میں اپنے اوزار رکھ کر کاندھے پر لٹکاتے ہوئے یک گونہ خوشی کی لہر محسوس کرتے ان کے لاشعور میں جمال خان کا مقررہ اوقات میں بن سنور کر دفتر جانا سما گیا تھا اور اسی طرح شام کو مخصوص اوقات میں واپسی بھی ان کے لئے وجہ اطمینان بن گئی ۔انہیں اس خیال سے بڑی کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی...... کہ گاؤں میں کام کرنے کے کوئی اوقات نہیں مقرر کیے گئے تھے جب بھی کسی کا جی چاہتا تو منہ اٹھائے گھر میں کام کروانے گھس آتا اور پھر فوری معاوضہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ اب شہر میں کم از کم اس احساس اور عذاب سے تو جان چھوٹ گئی تھی۔

دونوں بھائی کبھی کبھار گاؤں آتے تو بڑے غرور کے ساتھ کاندھے پر لمبے لمبے رنگین تولیے ڈال کر ہاتھوں میں انگریزی صابن کی ٹکیاں لئے گاؤں کی جامعہ مسجد میں غسل کیلئے روانہ ہوتے تو ان کی چال دیدنی ہوتی تھی۔ صاف ستھرے، اجلے اور کلف لگے کپڑے پہن کر گویا وہ اپنے پچھلے سارے شرمندہ ماضی کا قرض اتار رہے تھے۔

بابا جیون پر باقاعدہ حکم صادر کر دیا گیا تھا کہ وہ آری تیشے کو ہاتھ نہ لگائے گا اور نہ گاؤں میں اس کی

پہچان بطورلوہار یا بڑھئی ہوگی۔ بابا جیون اپنے جوان ہمت بیٹوں کی دلیلوں کی یلغار کے سامنے ہتھیار ڈال بیٹھا تھا۔ اسے خود کیا معلوم تھا...... کہ زندہ رہنے کے لئے دولت کے علاوہ بھی کسی اور شے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب تک اس کے بیٹے اور پوتے پوتیاں گاؤں میں رہتے تو بابا جیون اور بڑی اماں کے صحن میں رونقیں پلٹ آتیں اور کھنکتے قہقہے ان کی سماعتوں میں رس ٹپکاتے رہتے...... لیکن ان کے واپس شہر جانے کے بعد بڑی اماں کو کھانسی کے شدید دورے پڑنے لگ جاتے، بابا جیون سارا دن چارپائی پر لیٹا عجیب عجیب سوچوں اور وسوسوں میں گھرا رہتا...... وہ مسجد میں اب اور اہتمام کے ساتھ جانے لگا تھا۔ مسجد میں جا کر دیر تک تسبیح کے دانے رولتا رہتا لیکن اب وہ شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا کہ لوگ اتنی جلدی نماز پڑھ کر گھروں کو کیوں چلے جاتے ہیں؟

وہ جب مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو گھر کی جانب بادل نخواستہ روانہ ہونے لگتا تو اس احساس ہونے لگتا کہ اس کے پاؤں میں کسی نے بھاری بھرکم زنجیر ڈال دی ہو۔ اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی گھر کا فاصلہ بہت جلد ختم ہو جاتا، وہ گھر پہنچتے ہی اگلی نماز کا پھر سے انتظار کرنے لگ جاتا۔ اس خیال سے وہ آنکھیں بھی نہ موندتا...... کہ مبادا اس کی آنکھ لگ جائے اور نماز میں دیر ہو جائے...... گاؤں میں اس کے لئے مصروفیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔

گاؤں کے زمیندار اور اس کے دوسرے ہم عمر سارا سارا دن کھیتوں میں نکل جاتے اور شام ڈھلتے ہی اپنے اپنے گھروں میں چارپائیوں پر ڈھیر ہو جاتے۔

بابا جیون کو سمجھ نہیں آرہا تھا...... کہ یہ گاؤں یکا یک سنسان کیوں ہو گیا ہے...... اس کی رونقوں کو نہ جانے کونسا سانپ نگل گیا ہے...... دونوں بوڑھے میاں بیوی اب ذرا ذرا سی بات پر آپس میں الجھ پڑتے اور کئی کئی دن اپنے پوتے پوتیوں اور بیٹوں سے ملنے شہر جانے کے لیے لمبے چوڑے پروگرام بنانے لگ جاتے۔ جب وہ پورے اہتمام کے ساتھ شہر میں اپنے بیٹوں کے گھروں میں پہنچ جاتے تو پوتے پوتیوں کو دیوانہ وار چوم کر بے حال ہو جاتے۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہونے لگتا کہ بچوں کی آنکھوں میں محبت و انسیت کی بجائے وڈیو گیمز، کمپیوٹر اور ٹی وی پروگرام کی اتنی ڈھیر ساری تصویریں جھلملا رہی ہوتی ہیں کہ کوشش کے باوجود بھی بچوں سے اپنے بوڑھے دادا، دادی، کی تصویر ذہن کے کسی بھی چینل میں ٹیون نہیں

ہو پاتی تھی۔ بیٹے روزمرہ کے معمولات میں اس قدر کھو گئے تھے کہ ان کے پاس اپنے والدین کے لئے ذرا بھی وقت نکالنا محال ہو گیا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ گھروں کو لوٹتے تو بار باران سے علی الصبح گاؤں جانے والی ویگن کا ٹائم پوچھنے لگتے ......اور پھر یوں وہ دل پر ہاتھ رکھ کر آزردہ واپس گاؤں میں لوٹ آتے۔ یہ وہ دکھ تھا...... جو وہ کسی دوسرے کو نہیں بتا سکتے تھے۔

پچھلے دنوں گاؤں میں بابا جیون سخت بیمار پڑ گیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اس کی شدید کھانسی کے دورے کی آواز سنی تو میں بے اختیار اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ بابا جیون کی چارپائی کی پائینتی کی جانب بیٹھ کر جب میں نے حال احوال اور دوا دارو کا پوچھنا شروع کیا......تو بابا جیون کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی......پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچوں بیچ مجھے سنائی دیا...... بیٹا......ہماری سگی اولاد نے ہم سے ہماری زندگی چھین لی ہے......وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی زندگی بسر کریں......یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟......ویسے سچی بات تو یہ ہے......کہ جب عورت مرد کی عقل پر راج کرنے کی کوشش کرنے لگے تو گھر یونہی برباد ہو جایا کرتے ہیں......!

لیکن بابا جیون......یہ ہماری بڑی اماں جی......بھی تو......ایک عورت ہیں......!! میں نے بابا جیون کو ٹوکتے ہوئے کہا......نہیں......نہیں بیٹے......! انہوں نے عقل پر نہیں......دل پر راج کیا ہے......اور آج کی پڑھی لکھی عورت یہی نکتہ تو بھول گئی ہے......! بابا جیون بولے جا رہے تھے......اور پھر میں نے دیکھا...... کہ بڑی اماں جو کافی دیر سے آنکھیں موندے چپکے چپکے سے ہماری باتیں سن رہی تھی......دفعتاً اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے میلے تکیے کے نیچے سے دستی پنکھا اٹھایا......اور پھر بے دھیانی سے اتنی زور سے پنکھا جھلنے لگی......کہ اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بابا جیون کے کندھوں سے ہوتی ہوئی سارے کمرے میں پھیلنے لگی تھی......!

(مشمولہ سوچ دلان، ۲۰۰۵ء)

نام　　　محمد حمید شاہد

ولدیت　　　غلام محمد

پیدائش　　　۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء

جائے پیدائش　　　پنڈی گھیب کیمبل پور (اٹک)

تعلیم　　　گریجویشن

معروف افسانہ نگار اور نقاد محمد حمید شاہد کے جدامجد کا مسکن چکی تھا جہاں سے ان کے دادا حافظ غلام نبی نقل مکانی کر کے پنڈی گھیب تشریف لے آئے۔ جہاں ان کی ولادت علاقہ کی ایک سیاسی و سماجی شخصیت غلام محمد کے ہاں ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب اعوان اجمال ہے۔ ابتدائی تعلیم پنڈی گھیب سے ہی حاصل کی ۱۹۶۹ء میں پرائمری، ۱۹۷۲ء میں مڈل اور ۱۹۷۴ء کو گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مطالعہ کا شوق آپ کو گھر میں موجود والدِ گرامی کے کتب خانہ سے ہوا جس سے آپ زمانہ طالب علمی میں ہی ادب کی جانب راغب ہوئے۔ میٹرک کے بعد زرعی یونی ورسٹی فیصل آباد میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے ایف ایس سی اور پھر گریجویشن کی۔ یونی ورسٹی میں تعلیمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ طلبہ سیاست میں بھی حصہ لیا۔ انہوں نے اپنی پہلی کتاب پیکرِ جمیل اسی دوران لکھی، یونی ورسٹی کے ''مجلّہ کشتِ نو'' کے مدیرِاعلیٰ بھی رہے۔ ۱۹۸۳ء میں فیصل آباد سے فارغ التحصیل ہوئے۔ بعدازاں پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں قانون کی ڈگری کے حصول کے لیے داخل ہوئے لیکن والد کی شدید علالت اور وفات کے باعث انہیں یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

ملازمت کا آغاز ۱۵ ستمبر ۱۹۸۳ء کو زرعی ترقیاتی بنک ریجنل آفس راول پنڈی سے بہ طور ایکسٹرا اسسٹنٹ کیا۔ بعد ازاں فتح جنگ، پنڈی گھیب، جنڈ، چکوال، کہوٹہ، مری اور اسلام آباد کی برانچز میں مختلف عہدوں پر تعینات رہے۔ کچھ عرصہ ریکوری پالیسی میں بہ طور ہیڈ خدمات انجام دیں ۲۰۱۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

محمد حمید شاہد نے پہلی تحریر میٹرک کے دوران نظامِ تعلیم پر لکھی جو نوائے وقت کے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثری نظموں اور انشائیہ نگاری سے کیا بعد ازاں افسانہ نگاری کی جانب مائل ہو گئے۔ان کا پہلا افسانہ ''ماسٹر پیس'' کے عنوان سے ''سیارہ'' ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ 'بند آنکھوں سے پرے' اور ''جنم جہنم'' کے بعد بہ طور افسانہ نگار مقبولیت حاصل کی۔انہوں نے پاک و ہند میں افسانہ نگاری کے علاوہ ناول اور تنقید میں بھی یکساں مقبولیت پائی اخبارات میں کالم اور تبصرے بھی لکھے۔ان کی افسانہ نگاری پر مختلف یونیورسٹیوں میں ایم اے اور ایم فل اردو کے تحت مقالے لکھے گئے۔ ادبی خدمات کے صلہ میں انہیں میاں محمد بخش اور دیگر کئی ایوارڈ سے نوازا گیا۔گزشتہ سال انہیں تمغہ امتیاز سے سرفراز کیا گیا۔

مطبوعات:

ا۔پیکرِ جمیل (سیرتِ النبی) ۱۹۹۵ء بارِ اول ۲۔ لمحوں کا لمس (شاعری) ۱۹۹۵ء

۳۔بند آنکھوں سے پرے (افسانے) ۱۹۹۴ء

۴۔جنم جہنم (افسانے) ۱۹۹۸ء ۵۔ مرگ زار (افسانے) ۲۰۰۴ء

۶۔محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (انتخاب) ۲۰۰۹ء

۷۔ آدمی (افسانے) ۲۰۱۳ء ۸۔دشت میں محبت (افسانے) انتخاب ۲۰۱۵ء

۹۔ اشفاق احمد شخصیت اور فن ۱۹۹۸ء

۱۰۔ ادبی تنازعات (تنقید) ۲۰۰۰ء ۱۱۔ کہانی اور یوسا سے معاملہ (تنقید) ۲۰۱۱ء

۱۲۔مٹی آدم کھاتی ہے (ناول) ۲۰۰۷ء

۱۳۔ پارو (اردو افسانوں کا ترجمہ) سرائیکی ادبی بورڈ ۱۹۹۹ء

۱۴۔راشد میراجی فیض: نایاب ہیں ہم (تنقید) ۲۰۱۴ء

۱۵۔اردو افسانہ: صورت و معنی (تنقید) ۲۰۰۶ء

۱۶۔سعادت حسن منٹو: جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ (تنقید) ۲۰۱۳ء

۱۷۔اردو فکشن نئے مباحث ۲۰۱۶ء ۱۸۔ الف سے اٹکھیلیاں ۱۹۹۵ء

۱۹۔سمندر اور سمندر (تراجم)۱۹۹۵ء

انتخاب/ترتیب:

پاکستانی ادب (اکادمی ادبیات)۲۰۰۲ء

سارک ممالک: منتخب تخلیقی ادب (اکادمی ادبیات)۲۰۰۴ء

آٹھ اکتوبر: تحریر کے آئینے میں (اکادمی ادبیات)۲۰۰۶ء

محمد حمید شاہد کی شخصیت و فن پر مختلف یونی ورسٹیوں میں کام:

۱۔محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات (منظور احمد) مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۲۔محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات (محمد کامران شہزاد) مقالہ برائے ایم فل اردو، سرگودھا یونیورسٹی

۳۔محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری (طالب چوہدری) مقالہ برائے ایم اے اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

۴۔محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات (آمنہ یونس) مقالہ برائے ایم فل اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

۵۔محمد حمید شاہد کی تصانیف: ایک جائزہ (اُم حبیبہ) مقالہ ایم فل اردو، قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد

ماخذ

محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات، منظور احمد، ایم فل اردو، ۲۰۱۵ء

قیوم طاہر، مدیر، مجلّہ آفاق، راولپنڈی ۲۰۰۳ء

سید اذلان شاہ، مدیر، سہ ماہی نزول، گوجرہ ۲۰۱۴ء

اصغر عابد، پارو، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۱۹۹۹ء

سورگ میں سور

محمد حمید شاہد

جب سے تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اذیت سے بھی شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔

تاہم ایک زمانہ تھا۔۔۔۔اور وہ زمانہ بھی کیا خوب تھا کہ ہم دکھ کے شدید تجربے سے زندگی کی لذت کشید کرتے۔اس لذت کا لپکا اور چسکا ایسا تھا کہ خالی بکھیوں کے بھاڑ میں بھوک بھونجے چھولے تڑ تڑاتے بھنتے رہتے مگر ہم حیات افروز لطف سے سرشار ہوتے تھے۔بجا کہ ہم بے بسی کے مقابل رہتے تھے لیکن ہمیں اپنی بے بسی کا اس قدر احساس نہیں ہوتا تھا۔بہت بندھی رہتی اور ہم موت کا مقابلہ بھرپور زندگی کے دل نواز حوصلے سے کرتے تھے۔

وہ پھڑکی والا سال بھلا کوئی کیسے بھول پائے گا کہ جس میں بتیلیں، کجلیاں، کموریاں اور ناچیاں ایک ایک کر کے موت کی اوڑھ لے رہی تھیں، بہ ظاہر قدرے سخت آنے والی بربری نسل کی ٹیڈی ٹھگنیاں بھی اس موت کی وادی میں کودنے کے بہانے تلاش کرنے لگیں تھیں۔۔۔۔تب جس طرح ہم نے اپنے ڈوبتے دلوں پر قابو پایا تھا وہ کچھ ہم ہی جانتے تھے۔اسی برس چھوٹی پتلی دُم اور بڑے حوانے والی سرخ جیتل، کہ جسے ہم سب رتی کہتے تھے، پھڑکی سے پھڑک گئی تھی اور کچھ ہی گھنٹوں کے اندر اندر موٹے سینگوں والی چتری، لٹکے ہوئے کانوں والی بھوری اور تکون جیسے تھنوں والی لنگڑی پل کی پل میں بے سُدھ ہو گئی تھیں۔ایسے میں آوازوں کا میلہ سا لگ جاتا۔۔۔۔اوئے فضلو! دیکھ اس نمانی کا پنڈا گرم ہے اسے اُدھر لے جا۔۔۔اوئے شریفے وہاں چتری ماں کو کیوں ٹوہے جاتا ہے ادھر آ اور اس بگی کے کُھروں کو دیکھ، ان کے اندر ورم آ گئے ہیں۔میرو، نظاماں، خیرو، شوقی، ناماں چھونی۔۔۔ہم سب بھاگ بھاگ کر ایک ایک کے پاس پہنچتے تھے، ہر ایک کا منہ کھول کھول کر دیکھتے، بدن ٹٹولتے، حوانے ٹوہ کر اندازے لگاتے، ٹانگیں دہری کر کے کھروں کو کریدتے، منہ اٹھاتے اور انگلیاں گھسیڑ گھسیڑ کر موت کی اُن علامتوں کو بھی تلاش کر لیا کرتے تھے جو بہ ظاہر نہ آتی تھیں۔

پھڑ کی نشانیاں ہمیں کبھی نہ ملتیں۔۔۔۔اس موذی مرض کی علامتیں ہیں بھی کیا، ہم نہ جان پائے۔۔۔۔۔جب تک اندازے اس طرف جاتی پھڑ کی اپنا وار چلا چکی ہوتی اور ہم پھڑ کنے والی کو چھوڑ دوسیوں کو بچانے میں لگ جاتے تھے۔جس کا تھوڑا سا جثہ گرم ہوتا، جس کے اُٹھے کان ڈھلکنے لگتے یا پھر جو دانتوں کو باہم پیش کر رہی ہوتی، ہم اسے الگ کر دیا کرتے تھے۔اُس برس ہمیں پھڑ کی کی موتوں نے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔۔۔مگر ہم اُس برس بھی اتنے بے بس نہیں ہوئے تھے جتنا کہ بعد میں تھوتھنیوں والوں کے سبب ہو گئے تھے۔

پہلے بے بسی ضرور تھی لیکن ہمت ہی ٹوٹ جائے ایسی لاچاری اور بے کسی نہ تھی۔نہ پھڑ کی والے سال نہ ہی آنے والے برسوں میں۔۔۔۔ہم کوئی نہ کوئی سبیل کر ہی لیا کرتے تھے۔جب بکریوں میں سے کسی کی چال بگڑ جاتی اور اگلے دن پہلے سے بھی زیادہ لنگڑانے لگتی، کوئی اپنے کُھر زمین پر جُھک جُھک کر مارتی یا کسی کا بدن ڈھلکنے لگتا، کسی کے منھ میں سفید سفید چھالے نکل آتے یا تھنوں کے سفید دانے پھٹ کر سرخ ہو جاتے، کسی کے منھ سے جھاگ اور رالیں بہنے لگتیں یا پھر ناک منھ اور پیچھے سے لیس دار مادہ نکلنے لگتا، کسی کا پھل گر جاتا یا اُن میں سے کسی کا پہلا میمنا اگلی ٹانگوں کے بہ جائے پہلے پچھا نکالنے لگتا، کوئی سوئے کی پیڑوں سے چیخے جاتی یا جھلی پھٹ جاتی اور ہم ترکیبیں کر کر کے پھل چھوڑنے میں مدد دے رہے ہوتے یا تر و بنے والی زندگی بڑھانے کے کٹھن کر رہے ہوتے تو ہمیں دُکھ، موت اور زندگی دونوں کے مقابل کرتا تھا۔مرنے والیاں مر جاتیں مگر یہی تو ہماری زندگی تھی۔۔۔ہمیں یاد رہتا تھا کہ کس سال پھڑ کی کا حملہ ہوا تھا، کب منھ کُھر آیا، گل گھوٹو اور ماتا نے کب پھیرا ڈالا تھا، چاندنی سے چشمک کب ہوئی تھیں، سنگ رھنی کے سبب کس کس نے چرنا چگنا چھوڑ دیا تھا، کسے خارش ہوئی تھی، کون نمونیے بیمری تھی، کس کے پھپھڑوں میں کرم پڑ گئے تھے اور ناک مکھی نے کسے اوندھایا تھا۔

سردیوں کی یخ بستہ راتیں ہوتیں یا گرمیوں کی کڑی دوپہریں، ہم ایک ایک لمحے کو۔۔۔ایک ایک واقعے کو۔۔۔اور ہر ایک متاثر ہونے والی یا مر جانے والی کو یاد کرتے تھے۔۔۔۔اور اسی موت کے کھیل میں سے زندگی کا چہچہا برآمد ہو جایا کرتا تھا۔یہ ٹھیک سے بتانا تو مشکل ہے بکریوں کے اجڑ کے درمیان لرزتے ہاتھوں میں اپنی کمر جیسی خم لیتی لاٹھی کے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا، بتایا تھا کہ ہمارے گاؤں سورگ کی زمین اور ہمارے بدنوں کی مٹی کے اجزاء کا مطالبہ ہی یہی تھا کہ ہم اس پاک فریضے میں مشغول

رہتے۔ باباجی کا وجود اور ان کی باتیں ہمیں ایمان جیسی لگا کرتی تھیں لیکن جب انہوں نے بتایا تھا تو اس وقت تک ہم خاصے ہوش مند ہو چکے تھے لہذا ہمیں پاک فریضے کے لفظوں نے چونکا دیا تھا اور ہم میں سے کئی ایک نے دہرایا تھا:

باباجی پاک فریضہ؟۔۔۔۔''

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا:

''اُچیاں شاناں والے کے صدقے یہ دھندا پاک فریضہ ہی تو ہے۔''

پھر اُن کی آنکھیں محبت کے پانیوں سے بھر گئیں تھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں نہوں نہوں عقیدت کی کپکپاہٹ اور لرزتی انگلیوں کی ساری پوروں کو باہم ملا کر خیال ہی خیال میں بوسہ لیتے ہونٹوں پر تھراتی سسکاری کو چھو لیا اور ہم سے یوں بے نیاز ہو گئے کہ ان کی چھاتی کے اندر گونجتی آواز ہم تک پہنچنے لگی تھی۔

باباجی کے چل بسنے کے بعد ہم مونگ پھلی کی کاشت کی طرف راغب ہو گئے۔

یہ لگ بھگ وہی برس بنتا ہے جب اُدھر کی ایک بڑی بادشاہی میں ایک مونگ پھلی والے کو حکمرانی مل گئی تھی۔ یہ بات ہمیں شہر سے آنے والے بیوپاریوں نے بتائی تھی۔ انہوں نے ہمیں اُدھار بیج دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ مونگ پھلی تو سونے کی ڈالی ہوتی ہے۔ اس سال ہم نے بے دلی سے تھوڑا سا بیج زمین میں دبا دیا تھا اور باقی بھون کر مزے لے گُڑ کے ساتھ کھا گئے تھے۔۔۔۔۔ تاہم جب فصل تیار ہوئی اور کھڑی فصل کا سودا کرنے بیوپاری پہنچ گئے تو ہمیں مونگ پھلی واقعی سونے کی ڈالی جیسی لگنے لگی تھی۔

سورگ کی زمین کی دو روپ تھے۔۔۔۔ اوپر کے جنوب مشرقی حصے کی ساری زمین ریتلی تھی، ہم اسے اُتاڑ کہتے۔ اُتاڑ کی زمین ایسی ریتلی بھی نہ تھی کہ مٹی میں بھریں تو ذرے پھسلنے لگیں۔۔۔ ریتلی میرا کہہ لیں۔۔۔ مگر اُسے میرا یوں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بارش کا جھڑا پڑتا تو پانی سیدھا اُس کے اندر اُترتا جاتا، اوپری تہوں میں ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ کئی دھوپیں جو لگاتار پڑ جاتیں تو وتر کا نشان تک نہ ملتا۔ نیچے شمال مغربی حصے کی زمین رکڑ تھی۔۔۔۔ رکڑ بھی نہیں، شاید پتھریلی کہنا مناسب ہوگا۔۔۔۔ پتھریلی اور کھردری۔ اس پر بھی پانی نہ ٹھہرتا، فوراً پھسل کر گاؤں کو دولخت کرتے نملی کس میں جا پڑتا تھا۔ اس حصے کے ڈھلوانی علاقوں میں کہیں کہیں ایسے ٹکڑے تھے جن میں وَتر ٹھہر جاتا تھا اور زمین بیج قبول کر لیتی تھی۔ ایسے قطعات اتنا اناج اور چارا اُگا ہی لیتے تھے کہ گاؤں والوں کے معدوں میں بھڑکتی آگ کے

شعلے بجھتے تو نہ تھے تاہم مدہم ضرور پڑ جاتے تھے۔۔۔اور لہاریاں بھی بھوکی نہ رہتی تھیں۔

سارے اُتاڑ میں بکریاں خوب چرتی تھیں۔ یہاں ہر نسل اور مزاج کی بکریوں کی بھوک مٹانے اور ان کے بدنوں کو فربہ بنانے کا سامان موجود تھا۔ اپنے کھروں کو درختوں کے تنوں پر جما کر اوپر کی شاخوں سے رزق نوچنے والیوں کے لیے لذت بھرے پتوں والے مختلف النوع درختوں کے جھنڈ تھے، تھوڑا سا گردن کو خم دے کر جانے اور آگے ہی آگے بڑھتے جانے والیوں کے لیے جھاڑیاں اور بیلیں تھیں۔ بچھی ہوئی اور پھیلتی ہوئی نرم و شیریں گھاس بھی کہیں کہیں تھی کہ جسے بربریاں شوق سے کھاتیں اور اپنی نسل تیزی سے بڑھاتی تھیں۔ مگر جس تیزی سے تھوتھنیوں والے پلیدوں نے نسل بڑھائی تھی اُس نے سورگ والوں نیندیں حرام کر دی تھیں۔

اُتاڑ سے پرے اُدھر جہاں ہموار زمین پر سرکاری رَکھ تھی، تھوتھنیوں والے وہاں سے غول در غول آتے تھے اور ہماری زمینوں پر تباہی مچا کر واپس رَکھ میں جا چھپتے تھے۔ جب تک بکریاں ہمارے التفات کا محور رہیں، تباہی مچا کر چھپ جانے والوں کی تعداد بھی محدود رہی۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔ شاید اُن کا پھیرا ہی اِدھر کم کم لگتا ہوگا۔ تاہم ہم احتیاط بھی تو کیا کرتے تھے۔۔۔۔ بیری کنیر کیکر کے درختوں کی خار دار ٹہنیوں کے چھاپوں کی رَکھیاں جوڑ کر ہم بکریوں کے باڑوں کو چاروں طرف سے محفوظ بنا لیا کرتے تھے۔ جب تھوتھنیوں والے ادھر آ نکلتے اور اپنی تھوتھنیوں کو ان چھاپوں پر مارتے تو کانٹوں کی چبھن اُنہیں الٹا بھاگنے پر مجبور کر دیتی تھی۔۔۔۔ لیکن جب ہمیں مونگ پھلی کی فصل نے لگ بھگ بکریوں سے غافل ہی کر دیا تو وہ اندر تک گھس آتے۔ ان کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ناچار ہم سورگ والوں کو اُنہیں بھگانے کے لیے پالتو کتوں کی تعداد بڑھا دینا پڑی تھی۔

یوں نہیں تھا کہ پہلے سورگ والے کتے نہیں رکھتے تھے۔۔۔ گاؤں کے مستقبل مکینوں پر ہی کیا موقوف، وہاں مختصر عرصے کے لیے آنے والے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں میں کتے ہوتے تھے۔ خانہ بدوشوں کے پاس عموماً گدی نسل کے کتے ہوتے جب کہ سورگ والوں میں جنہیں خرگوش کا شکار مرغوب تھا وہ جہازی اور تازی رکھا کرتے تھے۔ ایک دو شوقین مزاجوں کے پاس السیشن تھے جب کہ گاؤں کے کھوجیوں کے پاس پوائنٹر تھا۔۔۔۔۔۔ تاہم باقی سب گھروں میں وہ عام نسل کے کتے تھے جو اجنبیوں کو دیکھ کر اُچھل اُچھل کر بھونکتے تھے بکریوں کو شام پڑنے پر دوڑ دوڑ کر اکٹھا کرتے تھے۔

سورگ والوں نے کتوں کی تعداد بڑھائی ضرور تھی مگر تعداد کبھی کافی نہ ہو پاتی کہ لائن لگانے والا یہ بے شرم جانور بڑھتا بھی سرعت سے تھا۔ ہر اڑھائی مہینے کے بعد ان حرام زادیوں کی بکھیاں بھر جاتیں اور سال بعد پتہ چلتا کہ پچھلے برس کے مقابلے اس بار تین گنا زائد آئے اور مونگ پھلی کے کھیتوں کو کھود کر پلٹ گئے۔

شروع شروع میں اپنے ایمانوں کو بچانے کے لیے ہم اس پلید نسل کا نام زبان پر نہ لاتے تھے۔ انہیں مارنے کو جی بھی نہ چاہتا کہ انہیں دیکھتے ہی کراہت ہونے لگتی تھی مگر جب یہ بہت زیادہ زیاں کرنے لگے تو ہم نے بندوقیں اٹھالیں۔ خوب منسوبہ بندی کر کے ان کا شکار کرتے۔۔۔۔۔۔اور پھر جب سرکار نے کسی سرکاری مصلحت کے تحت اسلحہ رکھنے پر پابندی لگادی تو ہمیں شکاری کتوں کی تعداد بڑھادینا پڑی۔

ہم ان کتوں کو لے کر شکار پر نکلتے تو ہمارے ہاتھوں میں کلہاڑیاں، برچھیاں اور بلم بھی ہوتے۔ کتے انہیں دوڑ دوڑ کر گھیرتے اور ہماری جانب دھکیلتے جاتے۔۔۔۔۔ہم ان پر حملہ آور ہو جایا کرتے اور ان کی تکابوٹی کر دیتے تھے،۔ تاہم یہ ایسا موذی تھا کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو ہر بار ضرور زخمی کر دیتا تھا۔ ہم ان کا شکار کھیلتے تھے مگر ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ جس تیزی سے وہ بڑھ رہے تھے اس کے مقابلے میں ہمارے ہاتھ لگنے والوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ لہٰذا تشویش ہمارے بدنوں کے خوب کا حصہ ہوگئی تھی۔

تھوتھنیوں والوں کی بڑھتی تعداد ہمیں مونگ پھلی کاشت سے نہ روک پائی کہ اس فصل کے طفیل بھوک ہماری بکھیوں سے نکل کر انہیں فربہ بنا گئی تھی۔ بیوپاری کھڑی فصل کا اتنا عمدہ بھاؤ لگاتے اور نقد رقم سے ہماری جھولیاں بھر دیتے کہ ہمارے دیدے حیرت سے باہر کو اُبلنے لگتے تھے۔ یہ حیرت تب بھی کم ہونے میں نہ آئی جب ہمیں یہ پتہ چلا تھا کہ بیوپاری تو ادھر شہر میں کارخانے والوں سے کہ جو اس کا تیل نکالتے تھے یا اسے مزے مزے کے کھانوں کا حصہ بناتے تھے، ہمیں دیئے جانے والے بھاؤ سے کئی گنا کماتے تھے۔۔۔کہ۔۔۔کوئی اور جنس ہمیں اتنا بھاؤ نہ دیتی تھی۔۔۔۔شاید اسی بھاؤ کی شِک نے ہمیں بکریوں سے بدکا دیا تھا۔

دِھیرے دِھیرے سارے اُتاڑ پر مونگ پھلی ہی کاشت ہونے لگی۔ یہ علاقہ اس کی کاشت برداشت کے لیے خوب موزوں نکلا۔ اس فصل کو نسبتاً لمبا اور گرم موسم چاہئے، تو وہ اس علاقے والوں کا ازلی مقدر

تھا،کم از کم جتنی بارش اس فصل کی طلب تھی اتنی خشک سالی کے موسم میں بھی ہو ہی جایا کرتی تھی۔زمین بھاری ہوتو بہت سا پھل وہی دبائے رکھتی ہے،سارا اُتاڑ ریتلا میرا تھا،اُدھر پودے پر ہاتھ رکھا جاتا اِدھر ہلکی پھلکی زمین پھلوں کے گچھے اُگل دیتی۔ہم سردیوں کے خاتمے سے پہلے پہلے ہل چلا کر مونگ پھلی کی کاشت کے لیے وتر محفوظ کرلیا کرتے تھے۔انگریزی حساب سے تیسرے مہینے کے آدھے میں اس کی گریاں بوئی جاتیں۔یہ بوائی کبھی کبھار چوتھے کے آدھے تک چلتی تھی۔جب پھلیاں بننے پرآتیں تو ہم ان کے بچاؤ کے لیے جنگلی چوہوں کے بل ڈھونڈ ڈھونڈ کران میں زہر کی گولیاں ڈالا کرتے۔چوہے اور سیہہ پھلیوں کے خاص دشمن تھے مگر ہمیں شہر والے بیوپاریوں نے سائینوگیس،کہ جسے ہم پہلے پہل سینوگیس کہتے تو شہر والے ہنسا کرتے تھے،اور زہر کی گولیاں لادی تھیں یہ ان کے تدارک کے لیے خوب موثر تھیں اور ہم خوش تھے کہ ہم نے تقریباًان پر قابو پا ہی لیا تھا۔۔۔مگر تھوتھنیوں والوں نے ہمارے سارے حوصلے چھین لیے تھے۔ایک ایک بکری کو بیماری سے۔۔۔۔۔بگھیاڑوں سے۔۔۔۔اور موت کے منہ سے بچانے والے ہم سب بے بس ہو چکے تھے۔کبھی ہم مستقل دکھوں سے مقابل ہونے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔۔۔۔اوراب بے بسی کی فرصت ساری مصروفیت پرغلبہ پا گئی تھی۔

مونگ پھلی کی کاشت بجائے خود زیادہ مصروفیت کا مشغلہ نہ نکلا۔پہلے برس اُتاڑ کو ہموار کرنا پڑا تھا،اپنے اپنے نام کھتوئے گئے خسروں کے حساب سے کھیتوں کے گرد حدیں بنائی تھیں۔کھیتوں کے اندر آجانے والے کیکروں،بیریوں،جھڑ بیریوں اور کنیروں کو کاٹ کاٹ کر بالن بنانے کے لیے ان کے ٹوٹے ٹوٹے کئے تھے۔ہل چلا کر کھبل اور مروا کو جڑوں سے اکھیڑا گیا اور گھاڑ ایک جگہ اکٹھا کیا تھا۔۔۔۔۔بس وہ پہلا برس ہی شدید مصروفیت والا نکلا۔یہی پہلا برس بکریوں کے پیٹ بھر کر چرنے کا آخری سال بن گیا تھا۔وہ درختوں سے اترنے والے سبز پتوں سے لدی چھانگوں پر منہ مارتے ہوئے اُکھڑی ہوئی نرم نرم جھاڑیوں کو جبڑوں میں چباتے اور ڈھیروں کی صورت پڑے گھاڑے کو چرتے ہوئے ہمیں اس بات کا احساس تک نہ دلا پاتی تھیں کہ آنے والے برسوں میں ان کی بکھیاں خالی بھبھان رہیں گی حتیٰ کہ وہ خود بھی نہ رہیں گی۔تاہم ہمارے پیٹ چربیلے ہونے شروع ہو گئے اور عجب طرح کی فرصت نے ہمارے وجودوں میں کاہلی کا بےلذت پانی بھر دیا تھا۔

مونگ پھلی کی کاشت کے بعد سے لے کر زمین رنگ پھلیاں بننے تک ہم فارغ رہنے لگے۔پھلیاں

بنتیں تو ہم بلوں کو تلاش کر کے ان میں زہریلی دوا ڈالتے۔ یہ بھی کوئی ایسی مصروفیت نہ نکلی تھی کہ ہمارے وجودوں میں زندگی کی ہمک بھر دیتی لہٰذا بہت جلد اُوب جایا کرتے کھا ٹیں لمبی کرتے اور اب تک پکے ہو چکے گھروں کے دبیز سایوں میں دراز ہو جاتے۔

ہمیں کسالت نے جکڑے رکھا۔۔۔۔اور تھوتھنیوں والے اس قدر بڑھ گئے کہ کتوں کی خاطر خواہ تعداد بڑھا دینا پڑی۔

اور اب یہ ہو چکا ہے کہ کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔۔۔۔ بہت زیادہ اور بہت قوی۔۔۔اتنے زیادہ کہ ہمارے حصے کا رزق بھی کھا جاتے ہیں۔۔۔۔۔اور اتنے قوی کہ ان کی زنجیریں ہماری ہتھیلیوں کو چھیل کر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ یہ کتے ہمارے کھیت اجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں۔۔۔۔عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے۔۔۔۔ممکن ہے ان پلیدوں کے بار بار بدن تان کر کھڑا ہو جانے کے سبب کوئی سہم ان کے دلوں میں سما گیا ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو، صورت احوال یہ ہے کہ تھوتھنیوں والوں کو غراہٹوں کی اوٹ میسر آ گئی ہے۔ کتے دور کھڑے فقط غرائے جاتے ہیں۔ ہم سے زخمی ہتھیلیوں میں بلم، برچھیاں اور کلہاڑیاں تھامی ہی نہیں جا رہیں لہٰذا ہم خوف اور اندیشوں سے کانپتے جاتے ہیں۔۔۔۔اور کچھ یوں دِکھنے لگا ہے کہ جیسے اس بار تھوتھنیوں والے انہی کتوں کی غراہٹوں کی محافظت میں ہمارے کھیت گھود کر ہی پلٹیں گے۔

(ڈاکٹر رشید امجد پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء انتخاب افسانہ اردو، اکادمی ادبیات)

نام	محمد ارشاد
قلمی نام	ارشاد علی
ولدیت	محمد یوسف
پیدائش	۵ اگست ۱۹۶۳ء
جائے پیدائش	شکر درہ (اٹک)
تعلیم	ایف اے

ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری اسکول شکر درہ سے حاصل کی اس کے بعد انہیں گورنمنٹ پائیلٹ سکینڈری اسکول اٹک میں داخل کروایا گیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۷۷ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک گورنمٹ اسلامیہ اسکول اٹک سے ۱۹۷۹ء میں کیا۔ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج اٹک میں داخل ہوئے لیکن آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے یہاں ان کے اساتذہ میں سعد اللہ کلیم، اقبال اختر اور اشرف الحسنی شامل تھے۔ بعد ازاں دورانِ ملازمت ۱۹۸۶ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۸۲ء کو ملازمت کا آغاز محکمہ تعلیم میں بہ طور مدرس مکتب پرائمری اسکول بسال سے کیا لیکن چند ماہ بعد اس نوکری کو چھوڑ کر محکمہ صحت میں بہ طور ویکسی نیٹر ملازمت اختیار کی ۱۹۸۴ء میں بہ طور ویلفیئر اسسٹنٹ محکمہ بہبود آبادی میں نوکری جوئن کی۔ ابتداً دیہی فلائی مراکز میں خدمات انجام دیں پھر اٹک مرکز میں تبادلہ ہوا تا حال اٹک شہر میں ویلفیئر اسسٹنٹ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادبی سفر کا آغاز شعر گوئی سے کیا ہائیکو ان کی من پسند صنف رہی ارشاد علی ناشاد کے نام سے ان کا کلام شائع ہوا بعد ازاں افسانہ نگاری پر توجہ مرکوز رہی، ان کی پہلی کہانی ۱۹۸۲ء میں روز نامہ نوائے وقت میں شایع ہوئی۔ جلد ہی ان کا میلان علامتی و تجریدی افسانہ کی جانب ہوا۔ ان کا پہلا علامتی افسانہ ۱۹۸۴ء میں سہ ماہی ''ادبیات'' میں چھپا۔ بعد ازاں ان کے افسانے سہ ماہی فنون لاہور، ماہنامہ ماہِ نو لاہور، سہ ماہی

ارتکاز کراچی، ماہنامہ آئندہ کراچی، سہ ماہی قندیل اٹک، جمالیات اٹک، اور سالانہ میگزین گورنمنٹ کالج اٹک میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان راول پنڈی اور پشاور کے لیے بہ طور پروگرام اناؤنسر اور فیچر رائٹر کام کیا۔ ایک پروگرام ''جواں سال'' میں میز بانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔

یکم جولائی ۲۰۰۱ء سے ''روز نامہ اساس'' میں کالم لکھ کر کالم نگاری کا با قاعدہ آغاز کیا بعد میں روز نامہ جنگ، نوائے وقت، ازکار، اوصاف، جناح ایکسپریس، روز نامہ کائنات اور دیگر کئی روز نامہ او ہفت روزہ اخبارات میں کالم لکھے۔ ۲۰۰۴ء سے بہ طور نامہ نگار روز نامہ جنگ کے لیے کام شروع کیا۔ اس کے علاوہ روز نامہ اسلام کے لیے بھی رپورٹنگ کی۔

۱۹۸۹ء میں ادبی تنظیم ایوان ادب کی بنیاد رکھی اور صدر کی حیثیت سے ۱۹۹۲ء تک کامیاب ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد کروائے۔ ان اجلاسوں میں اختر شادانی، علی جان نسیم، فاروق روکھڑی، خلش ہمدانی، عبدالعزیز ساحر، ارشد محمود ناشاد، وقار آس اور دیگر کئی مقامی شعراء شرکت کرتے رہے۔ ایوان ادب نے کئی نئے مقامی شعراء کو متعارف کرایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایوان ادب کے علاوہ آپ صدر سول سوسائٹی پاکستان، صدر قلم قافلہ اٹک، بہ طور نائب صدر تنظیم ادب و ثقافت، قندیل ادب اٹک اور کاروان قلم اٹک کام کیا۔ پنجابی ادبی سنگت اٹک، فروغ نعت اکیڈمی اٹک کے ممبر اور تحریکِ ادب کے اساسی رکن ہیں۔ علاوہ ازیں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان بی فیئر NEHD، پریس کلب اٹک، پاک ایشاء جرنلسٹس ایسوسی ایشن اور ورلڈ کالمسٹ یونین کے ممبر ہیں۔

زیرِ ترتیب: دھتورے کا پھول (افسانوی مجموعہ)

کالی پڑی

ارشاد علی

وہ اپنے بوگیر کتوں کے ساتھ میرے تعاقب میں تھے۔

آدھی رات کی پچھل پیری، دہشت کی بکل مارے الٹے پیروں، میری مشکی گھوڑی کے ساتھ دوڑتی چلی جارہی تھی۔

میں نے تھوک نگل کر خشک ہوتے گلے کو تر کرتے ہوئے اپنے پیچھے کھنڈی ہوئی سیاہی میں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنا چاہا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ جان پایا کہ میرے تعاقب میں خوف اور اندیشوں کے ننگ دھڑنگ ملنگ، بے طرح دھمال ڈالے چلے جا رہے تھے اور بہت دور پیچھے سے تکبیر کے نعروں، دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں جلد از جلد جرنیلی سڑک تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سرپٹ بھاگتی گھوڑی اچانک پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو کر ہنہنانے لگی۔ گندم کے کھیتوں میں سے کوئی لالٹین بردار، یکدم نمودار ہو کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

وہ کالی پڑی کا مقام تھا جسے بچپن کی پراسرار یادوں کے حوالے سے کبھی نہیں بھولا۔ میرا دادا کالی پڑی کی طرف ڈھور ڈنگر چرانے اور ایندھن کے لیے کھب اور کاہی کاٹنے جاتا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر میں بھی اس کے ساتھ ہو لیتا۔

دادا کو کام میں منہمک پا کر میرے چھوٹے سے وجود میں بہت بڑا وحشی جاگ اٹھتا اور میں دور دور تک، تادیر کودتا بھاگتا رہتا، تا آنکہ دادا لاٹھی لے کر میرے سر پر پہنچ جاتا۔

''ادھر آ جا پتر اوئے، سو دفعہ سمجھایا ہے تجھے نہ دوڑا کر ادھر اُدھر۔ بڑی بھاری ہے یہ جگہ آسیب بستے ہیں یہاں۔''

یہ سن کر میں خوف زدہ ہو جاتا، تب دادا مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیتا۔ بزرگوں

سے سنا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت ادھر کی قریبی آبادیوں، کامرہ، مانسر، ملا منصور اور کچھ پرے شکر درہ، سروالہ اور سوجھنڈا باٹا کے دیہات میں رہنے والے مٹھی بھر ہوس زر جنونی پجاریوں نے یہاں سے ہجرت کر کے جانے والوں کو یہ کہ کر ٹرکوں میں سوار کر لیا کہ انہیں جرنیلی سڑک پر چڑھا آتے ہیں۔

لیکن وہ ٹرک کالی بڑی کے اجاڑ بیاباں میں پہنچ کر رک گئے اور ان بدقسمت نہتے مہاجروں کو موت کی شاہراہ پر چڑھا دیا۔

ان دنوں سے آئے روز اندھیری راتوں میں اس مقام سے گزرنے والے کتنے مسافر فضا میں تیرتی ہوئی روشنیاں دیکھ چکے ہیں۔۔۔۔۔

میں نے وہاں سے بچ نکل جانا چاہا مگر میری گھوڑی اڑ گئی۔

ہوسکتا ہے میرا ہانکا کیا جا رہا ہو۔ اس خیال نے میری بے بسی میں اضافہ کر دیا۔

''گھبراؤ نہیں مسافر میں تمہاری دشمن نہیں، دوست ہوں۔'' وہ نسوانی آواز تھی۔

غور سے دیکھا تو وہ نوجوان عورت تھی اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں ایک کوڑیالہ سانپ پکڑ رکھا تھا جو اس کے بازو کے گرداگرد لپٹا ہوا تھا۔

''میرے راستے سے ہٹ جا، اور اس بلا کو چھوڑ دے۔ میری گھوڑی بدک کر بھاگ جائے گی اور مارا جاؤں گا میں ان کے ہاتھوں'' میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے سانپ کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنے بازو سے اتار کر ایک طرف کھیتوں میں ڈال دیا۔

''اب بتا کون ہے تو اور کیوں روک رکھا ہے میرا راستہ۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہاں قریب ہی میرا گھر ہے۔ میں ہر روز چراغ بتی کے وقت ادھر سے گزرنے والے، کسی نہ کسی مسافر کو اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتی ہوں۔

''آج بڑے انتظار کے باوجود کوئی مہمان نہیں ملا، مایوس ہو کر لوٹ رہی تھی کہ تو مل گیا''۔

''دیکھ میرا پینڈا کھوٹا نہ کر، وہ ابھی آلیں گے مجھے اور۔۔۔۔۔

''بھگوان کے لیے میری پیش کش نہ ٹھکرا، میں بنتی کرتی ہوں تیری۔ میرے ساتھ آجا، اس طرح پناہ بھی مل جائے گی تجھے''۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔ جانے اس کی التجا کا اثر تھا یا مصلحت کا تقاضا کہ میں چپ چاپ اس کے پیچھے چل دیا۔

گندم کی فصلوں میں سے ہوتے ہوئے ہم جلدی ہی پتھروں سے بنی ایک بہت بڑی حویلی میں پہنچ گئے۔

حویلی کا دیوہیکل چوبی دروازہ ہمارے قریب پہنچتے ہی خودکار انداز میں، ایک پراسرار چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

اندرونی عمارت تک جانے والے راستے میں بجھے، چھوٹے گول پتھروں اور سوکھے پتوں پر دہشت کے ناگ لہریے لے رہے تھے اور میرا رؤاں رؤاں خوف کی زنجیروں میں جکڑا جا رہا تھا۔

''آؤ''۔اس کی سرد آواز کسی نامعلوم پرندے کی دہشت انگیز کرلاہٹ کے ساتھ لپٹ کر ابھری اور خوف میری رگوں میں دوڑنے لگا۔

عمارت کے اندر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے کمروں کے درمیان ایک ہال ہے جس میں چار چو فیرے کافوری شمعیں جل رہی ہیں۔

میں عنبر ولوبان میں بسے اس خوابناک ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ یکدم بج اٹھنے والی مترنم گھنٹیوں نے مجھے چونکا دیا۔

ایک طرف چبوترے پر ایستادہ وہ ایک بے رنگ مورتی کے روبرو، وہ آنکھیں موندھ کر ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑی تھی۔

اس کی چوٹی سے بندھے سفید موتیے کی خوشبو نے مجھے سحر زدہ کر دیا۔

بڑی دیر کی محویت کے بعد جب وہ میری طرف پلٹی تو اس کا سفید ساڑھی میں لشکارے مارتا بدن دیکھ کر ایک لمحے کو یوں لگا جیسے وہ برہنہ ہو میں نہیں جان پا رہا تھا کہ اس کے جسم کے کس حصے کو ساڑھی نے ڈھانپ رکھا ہے اور کون سا حصہ عریاں ہے۔

''آجاؤ اجنبی'' اس نے آواز کا جلترنگ بجایا اور مجھے ایک رہائشی کمرے میں لے گئی۔

''تم زرا دم لو، میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے لئے پلٹی اور پھر رک گئی۔ جیسے جان گئی ہو کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

''بے فکر رہو تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ کیا پتا کون سی مچھلی پانی پی گئی ہے اور وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں لیکن پروا نہیں کرو، کوئی یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ غضب کا اعتماد تھا اس کے لہجے

میں۔۔۔۔نامعلوم کیوں مجھے ایک گونہ اطمینان محسوس ہونے لگا۔

''سچ مانیئے بالکل نہیں ہے بھوک مجھے، تردد نہ کیجئے ویسے بھی تھوڑی دیر بعد چلے جانا ہے مجھے۔''میں نے مروتاً نہیں حقیقتاً کہا۔

''ہاں جانا تو ہے ہر ایک کو، کون رکتا ہے یہاں''وہ میرے اتنے نزدیک کھڑی تھی کہ اس کی سانسوں کی تپش مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔

بڑی دیر سے جو انجانی بات مجھے بے چین کئے جا رہی تھی، اس کے قریب آنے پر ایک دم واضح ہو گئی۔ کیوں کہ، کیف آگیں خوبصورتی کے برعکس، اس کی ویران آنکھوں میں کھنڈی ہوئی زردی، میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر رہی تھی۔

''آؤ میرے ساتھ''وہ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باورچی خانہ میں گئی اور وہاں سے پیتل کی ایک تشتری اور تھیلا اٹھا کر مجھے ساتھ لئے، باہر درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دی۔ درختوں کے جھنڈ میں جا بہ جا جلتے دیئے تیرتے پھر رہے تھے۔

میں زیادہ حیران نہیں ہوا کہ تا دیر اپنی رگوں میں لڑی جانے والی ایک طلسماتی جنگ کے سبب غیر ارادی طور پر اس پراسرار فضا کا ایک کردار بن چکا تھا۔

وہ ایک ایسے درخت کے پاس رک گئی، جس پر کوئی رطوبت سی لگی ہوئی تھی جسے اتار کر اس نے تشتری بھری اور مجھے تھما دی۔

ہنوز وہ معاملہ سمجھ نہ پایا تھا کہ معاً بہت سے بٹیر ہمارے پیروں میں آگرے، چند کو پکڑ کے اس نے تھیلے میں ڈالا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر کی طرف چل دی۔

اندر پہنچ کر اس نے باورچی خانہ کا رخ کیا اور آرام کی تاکید کرتے ہوئے مجھے مہمان خانہ میں بھیج دیا۔

مسہری پر سفید بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں نیم دراز ہو کر پڑ رہا۔ بستر کی حدت سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں سے ابھی کوئی اٹھ کر گیا ہو۔

میں کیوں فرار ہوا، کہاں جانا تھا اور کدھر پہنچ گیا۔ جانے کتنی دیر سوچتا رہا اور میرے گرد اگرد کافور کی بو پھیلتی گئی۔

''پدھاریئے کھانا چن دیا گیا ہے''اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

دستر خوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ بھنے ہوئے بٹیر اور درختوں سے اتاری ہوئی رطوبت، وہ میرے برابر بیٹھ گئی اور میں چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

کھانے کے بعد مجھے اپنے وجود میں قدرے حرارت اور آسودگی محسوس ہوئی میں تا دیر اپنے ذہن میں کلبلاتے سوال پوچھنے پر کمر بستہ ہو گیا۔لیکن وہ تو جیسے میری سوچ کو گرفت میں لئے بیٹھی تھی ''نہیں اجنبی! کوئی سوال نہیں۔تو برسوں کا تھکا ہارا ہے۔اب سو جا۔شائد تو بہت لمبی مسافت طے کرے گا'' اس نے برتن سمیٹے اور شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔

جانے کتنی دیر اسی عالم میں گزر گئی اور نیند کی دیوی نے ہولے سے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

رات کا پچھلہ پہر تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے شدید گھبراہٹ ہو رہی تھی اس لئے ننگے پیر راہداری سے گزر کر ہال اور کمرے تک پہنچ گیا۔وہاں جو منظر دیکھنے میں آیا وہ میرا کلیجہ نکال دینے کے لئے کافی تھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ خون آلود سفید ساڑھی میں ملبوس ایک بے سر کا دھڑ ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔مارے خوف کے میری چیخ نکل گئی اور میں باہر کی طرف بے طرح بھاگ اٹھا۔

باہر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ چہار سو خون آلود، بے سر کے دھڑ بھاگتے پھر رہے ہیں اور ایک ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔بچوں اور عورتوں کی کربناک کراہٹوں اور غضبناک آوازوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن ہے۔

''معاف کر دو، چھوڑ دو''

''بھگوان کے لئے مت مارو''

''کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا، ہم تو بہن بھائی ہیں''

''ایک جگہ کھایا پیا ہے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے ہیں''

''بھلائیاں کی ہیں، اک دوجے کے ساتھ۔ان بھلوں کا ہی پالن کرو ظالمو'' !

''تمہیں اللہ رسول کا واسطہ، اس دودھ پیتے معصوم کو چھوڑ دو''

میری جوان لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو''

اور بہت سی کمزور فریادیں، واویلے کے سمندر میں ابھرا بھر کر ڈوبتی جا رہی تھیں اور میں ان سب کی

تاب نہ لاکر گرتا پڑتا اس خونی حویلی سے باہر نکل گیا۔

اندر کی نسبت باہر چپ چڑا نگ تھی۔ لیکن ہر سو خوف کا عفریت دندناتا پھر رہا تھا۔

میری گھوڑی وہیں رہ گئی اور میں بہ عجلت تمام، ڈگمگاتے قدموں، دوڑتا گیا۔

میرے سامنے کچے راستے کے دونوں طرف درختوں پر دیئے جل رہے تھے میں دوڑتے ہوئے دیکھتا گیا کہ ہر درخت کے ساتھ بچوں، عورتوں بوڑھوں کے بریدہ سر جھول رہے ہیں اور انہی میں سے ایک نسوانی سر کی چوٹی میں خون آلود سفید موتیے کے پھول گندھے ہوئے ہیں۔

اچانک مجھے ٹھٹھک کر رکنا پڑا کہ ایک کوڑیالہ سانپ، میرے سامنے تن کھڑا تھا۔

اس کی دہشت ناک شوکار نے میرے اندر رہی سہی توانائی کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا اور میں دائیں بائیں آگے پیچھے جولتا مونہہ کے بل گر پڑا بعداس کے مجھے چنداہوش نہ رہا۔

چڑیوں کے چہچہانے کی صدا میرے کانوں میں پڑی تو میری آنکھ کھل گئی اور میں خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کو گھورنے لگا۔ بے دھیانی کے اس عالم میں جانے کتنے پل یا صدیاں بیت گئیں۔

میں اپنے گھر میں بستر پہ پڑا تھا پھر بھی اپنے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لے کر یقین کیا کہ مبادا، اس خونی حویلی میں تو نہیں ہوں۔

سب کچھ ٹھیک تھا لیکن خلاف معمول پلنگ کے قریب تپائی پر ایک بھوج پتر نظر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا، اٹھا کر دیکھا تو سرخ روشنائی سے لکھا تھا۔

اجنبی مسافر !

نمستے ! گھر کے حالات خواہ کیسے بھی ہوں اپنا گھر کبھی نہ چھوڑنا۔ تمام زخم بھر جاتے ہیں پر ہجرت کے گھاؤ بعداز مرگ بھی ہرے رہنے والے ہیں۔ اور پھر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ہجرت کا انجام مدینہ ہو؟

اس لئے پڑے رہو چپ کی چادر تان کر سر جھکانے میں ہی مصلحت ہے کہ اٹھی ہوئی گردنیں کاٹ دینے کا موسم ابھی جاری ہے۔

پھر بھی شاید آنے والے سمے، بھگوان تمہارے کالے لیکھوں کو اجال دے۔'' میں خط پڑھ کر پہروں سوچتا رہا۔

پھر اللہ کا نام لیا اور چھت پر چڑھ کر پھیپھڑوں کا پورا زور صرف کرتے ہوئے چلایا

”ہوکا ہوکا سن لو بھلا ہواواو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

آج میں نے اپنا قلم توڑا اور تمام روشنائی حیاتی کے سمندر میں انڈیل دی، سن لو بھلا ہواواو۔۔اس کارروائی کو دیکھ کر میری مشکی گھوڑی جو نجانے کب اور کیسے گھر پہنچ گئی تھی، زمین پر سم مار مار کر ہنہنانے لگی اور میرے اندار کا آدمی، اپنے حصے کی روشنائی کشید کر کے ٹوٹے پھوٹے قلم کے ساتھ لکھتا چلا گیا لکھتا چلا گیا۔

(سالانہ میگزین، مشعل، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اٹک، ۲۰۱۴ء)

نام	سید نصرت حسین شاہ بخاری
قلمی نام	سید نصرت بخاری
ولدیت	سید لعل شاہ بخاری
پیدائش	۶ جون ۱۹۶۸ء
مقام پیدائش	کامرہ کلاں (ضلع اٹک)
تعلیم	ایم اے ایم فل (اردو)

کامرہ کلاں اٹک شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک قدیم گاؤں ہے جہاں ان کی ولادت ایک سنی سید گھرانے میں ہوئی ان کا بچپن بل خصوص لڑکپن اسی گاؤں کی گلیوں اور میدانوں میں کرکٹ کھیلتے گزرا۔

ابتدائی تعلیم اسی گاؤں کے ایک اسکول سے حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ پائیلٹ سکینڈری سکول اٹک میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۸۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد پاکستان ایرفورس کے لیے سلیکشن ہوئی لیکن کرکٹ کے شوق میں انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج اٹک میں پڑھتے رہے اور ۱۹۸۹ء میں ایف اے پاس کی۔

۱۹۹۳ء میں بہ طور پی ٹی سی ٹیچر پاکستان ایروناٹیکل کمپلکس کامرہ کے ایک اردو میڈیم سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ چند ماہ بعد ان کا تبادلہ بہ طور ای ایس ٹی برہان میں ہوا جہاں انہوں نے دو سال تک پڑھایا اور پھر دوبارہ پی اے سی ہائی سکول کامرہ میں ہی ان کی واپسی ہوئی، جہاں وہ تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران انہوں نے پرائیویٹ طور پر تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۹۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۔ ۲۰۰۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔

۲۰۰۹ء اردو لیکچرر کے لیے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ بوائز کالج حضرو میں تقرر ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اردو کی سند کے لیے "مکاتیب مشاہیر

بنام حق نواز خان'' کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ دسمبر ۲۰۱۵ء کو ان کا تبادلہ حضرو کالج سے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اٹک میں ہوا جہاں ہنوز اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ادبی سفر کا آغاز ۹۰ کی دہائی میں شعر گوئی سے کیا بعدازاں اردو افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے اور بہت جلد خود کو اہم افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے ان کے افسانوں کو احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر انور سدید، محمد حمید شاہد اور دیگر کئی معتبر افسانوں نگاروں کی توجہ حاصل رہی۔

افسانہ نگاری کے ساتھ وہ پختہ کار شاعر، نقاد اور محقق بھی ہیں حال ہی میں اٹک کے اخبارات ورسائل پر ان کا ایک مقالہ مدیر ''جمالیات'' طاہر اسیر نے اپنے رسالہ میں شائع کیا اس کے ساتھ ہی حسین امجد نے ان کی ایک کتاب ''اٹک کی شخصیات'' کی دو جلدیں شائع کیں۔

سال ۲۰۱۷ء میں سرگودھا یونی ورسٹی کی ایک طالبہ حنا منیر نے ''نصرت بخاری کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ایم اے (اردو) کا مقالہ لکھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ عرصہ حضرو کے ایک اخبار ''تیسرا رخ'' کے ادبی ایڈیشن کی ادارت کی۔ جب ان کا تقرر گورنمنٹ کالج حضرو میں ہوا تو بہ طور مدیر اعلیٰ کالج میگزین ''سنگم'' خدمات انجام دیں انہوں نے طلباء میں صحت مند ادب کا رجحان پیدا کرنے کے لیے میگزین میں طلباء کی نگارشات کے ساتھ ساتھ معتبر اہلِ قلم کو شامل کر کے کالج میگزین کو معیاری ادب کا ترجمان بنایا۔

مطبوعات:

۱۔ حدیثِ دیگراں (مرتب)

۲۔ گھاؤ (افسانے)

۳۔ مکاتیب مشاہیر بنام حق نواز خان (تحقیق)

۴۔ سخن یہ ہے (شاعری)

۵ شخصیاتِ اٹک (جلد اول)

۶۔ شخصیاتِ اٹک (جلد دوم)

۷۔ ضلع اٹک کے اخبارات ورسائل (تحقیق) مطبوعہ جمالیات نمبر

دائم آباد

سید نصرت بخاری

آج سورج نکلنے سے پہلے ہی سے آسمان نے گہرے کالے بادل اوڑھ لیے تھے۔اس لیے دن کے دس بجے بھی یہی محسوس ہورہا تھا کہ ابھی سورج نکلنے میں بہت وقت ہے۔ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے گرمی کو شہر بدر کر دیا تھا۔لوگ حسب معمول زندگی کی پر پیچ زلفیں سنوارنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔خوش گوار موسم لوگوں کے مزاج پر اثر انداز ہورہا تھا۔مزدور ایک دوسرے سے ٹھٹھا مخول اور دھکم پیل کرتے خوش دلی سے اپنے کاموں میں جٹے ہوئے تھے۔

''جان بچا سوہنیا۔دیکھتا نہیں ناں سٹاپ آرہی ہے''ایک مزدور نے ریڑھی دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک گھنٹے بعد اس ناں سٹاپ کے سوگز میں سوسٹاپ ہوں گے''۔دوسرے نے جواب دیا۔

''ماں کا دودھ پیا ہے۔دیسی خوراکیں کھائی ہیں۔تیری طرح چائے کی پیدائش نہیں ہوں۔کل اس وقت تک گھوڑے کی طرح کام کر سکتا ہوں''۔

دکان دار بھی کب کی جھاڑ پونچھ کر کے گاہکوں کو قائل کرنے میں مصروف تھے۔سادہ گاہک کو تو وہ ایک جھپٹ میں شکار کر لیتے لیکن شاطر گاہک کچھ وقت لیتا تھا۔دکان داروں کی حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ کوئی گاہک چھٹ تا نہ جائے۔

''سات سو سے ایک روپیہ کم نہیں۔اتنے کی تو اپنی خرید ہے''

''اچھا چھ سو دے دیجیے۔آپ پرانے گاہک ہیں اس لیے لحاظ کر رہا ہوں''

''پانچ سو بھی نہیں''؟

''اچھا لائیں باجی چار سو ہی دے دیں۔قسم سے اس میں ایک پیسہ بھی کمائی نہیں۔''

وہ دکان دار جن کے ہاں ابھی تک کوئی گاہک نہیں پہنچا تھا وہ باہر آ کر دوسرے دکان داروں کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔لیکن ان کی شکاری نظریں چوکس تھیں کہ مبادہ کوئی گاہک

پھسل کر اِدھر سے اُدھر چلا جائے۔بعض بے فکرے لوگ ہوٹل میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ٹھنڈے موسم کا لطف اُٹھا رہے تھے۔خواتین کی ایک بڑی تعداد کو موسم انگلی پکڑ کر آج بازار کھینچ لایا تھا۔ بعض کا واقعی خریداری کا ارادہ تھا لیکن اکثریت موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے بازار میں چلی آئی تھیں یہ الگ بات کہ دکان داروں نے اپنے مخصوص ہتھکنڈوں اور چکنی چپڑی باتوں سے ان کی جیبیں بھی کاٹ لی تھیں۔سرخ،سبز اور نیلے پیلے آنچلوں نے بازار میں چاروں طرف رنگ بکھر دیئے تھے۔بدمعاش ہوا آنچل کھینچ کھینچ کر سینے بے نقاب کر رہی تھی۔کچی عمر کے لچکتی کمروں والے لڑکے جن کے اپنی کم سنی کو کئی خطرات درپیش تھے چست پتلونیں پہنے ٹولیوں کی شکل میں لڑیوں کا پیچھا کرتے،چھیڑتے اور آوازیں کستے جا رہے تھے۔

''کل سے کالج جانا بند''ایک لڑکے نے کہا

''ریڑھی لگانے کے ارادے ہیں؟''دوسرے نے چہکتے ہوئے پوچھا

''اس کھمبے کے پاس کسی کا انتظار کیا کریں گے''ایک لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے جواب دیا۔لڑکی نے غصے سے دیکھا تو سب نے بہ یک وقت قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ گئے۔آتے جاتے لوگ انھیں ناپسندگی سے دیکھتے مگر پھر اُنھیں اپنا زمانہ یاد آ جاتا اس لیے بڑبڑاتے ہوئے گزر جاتے۔

''دل کلیجہ،دل کلیجہ''۔بھونی ہوئی کلیجی بیچنے والے نے لڑکیوں کا غول دیکھ کر ذومعنی صدا لگائی۔

''سپر سودے،سپر سودے''۔ایک سبزی فروش نے دودھاری فقرہ پھینکا۔

بارش آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی لیکن پھر بھی ایسی شدت نہیں تھی جو کسی پریشانی یا خوف کا باعث بنتی۔دکان دار بدستور گاہکوں کی جیبیں ہلکی کرنے میں مصروف تھے۔سبزی اور فروٹ بیچنے والے اب بھی اپنے مخصوص انداز میں آوازیں لگا رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے بچے معصومیت سجائے جانگیے پہنے ادھر ادھر پانی اچھالتے بھاگ رہے تھے۔اچانک موسم کے نتھنے پھول گئے۔بادل غصے سے گرجا اور اپنا سارا پانی زمیں پر انڈیلنے لگا۔جس سے آنا فانا چاروں طرف پانی کی چادر بچھ گئی۔ہوا جو کچھ دیر پہلے بڑی آہستگی سے نرم نرم دستکیں دے رہی تھی اب دروازے پیٹنے اور توڑنے پر اُتر آئی تھی۔کالی گھٹاؤں نے نہ جانے کہاں سے اتنا اندھیرا کھینچ کر وقت سے پہلے رات کر دی۔موسم کا رنگ بدلتے دیکھ کر خواتین خریداری چھوڑ جلدی جلدی خریدی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

مردوں کے ہاتھ ان سے بھی زیادہ تیزی سے چلنے لگے۔ سارے کا سارا بازار کچھ ہی دیر میں گاہکوں سے خالی ہو کر سائیں سائیں کرنے لگا۔ ریڑھی والے اپنی ریڑھیاں وہیں چھوڑ مکانوں اور دکانوں کے بڑھے ہوئے شیڈز کے نیچے پناہ لے چکے تھے۔

بازار میں اب بھی اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے مگر یہ وہ لوگ تھے جن کو کسی خاص مجبوری نے گھر سے باہر دھکیل دیا تھا یا پھر بہت جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچنا چاہتے تھے۔ ورنہ موسم کی طرف سے کسی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ننگ دھڑنگ دوڑتے، قہقہے لگاتے بچے بھی اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر طرف پر نالوں سے بہنے والے پانی کا شور تھا۔ اگرچہ گرمی کا موسم تھا لیکن سردی رینگتی ہوئی بدن میں داخل ہوتی جاتی تھی۔ دکانوں کے دروازے جن کے منہ کچھ دیر پہلے گاہک ہڑپ کرنے کے لیے کھلے ہوئے تھے بند ہو چکے تھے۔ مکانوں کی بھیگی ہوئی کھڑکیوں نے آنکھیں موند لی تھیں۔ بارش کی شدت اور پرنالوں سے پانی گرنے کی آواز نے ماحول کو خوف زدہ بنا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آسمان نے سارے بادل یہاں ہی نچوڑنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ پانی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ دکان دار اس منظر کو دیکھنے کے لیے دکانوں سے باہر آ کھڑے تھے۔ شروع شروع میں جب پانی پر کوئی برتن یا کپڑا بہتا نظر آتا تو دکان دار دوسرے دکان داروں کو متوجہ کرتے ہوئے قہقہے لگاتے مگر اب پانی کی غراہٹ، بہاؤ اور اس میں بہتی ہوئی چیزوں میں اضافہ ہو چکا تھا اس لیے دکان داروں کے مذاق نے سنجیدگی تان لی اور زبان توبہ توبہ کے ورد میں ڈوب گئی۔ مسلسل موسلا دھار بارش کی وجہ سے پانی کی سطح اتنی بلند ہو چکی تھی کہ بعض دکانوں میں گھس گیا۔

دکان داروں نے بڑی کوشش کی لیکن ان کا کوئی حیلہ منہ زور پانی کو اندر آنے سے نہ روک سکا۔ بلکہ بعض دکانوں میں اپنا پانی بھر چکا تھا کہ دکان دار بمشکل اپنی جانیں بچا کر کسی پناہ گاہ تک پہنچے۔ ان کا سارا سامان پانی میں ادھر ادھر تیرتا نظر آ رہا تھا۔ اچانک نالہ لئی شہر میں ایک سیلابی ریلے کی طرح چنگھاڑتا داخل ہوا۔ اور لوگوں کے کچے مکان روندنے لگا۔ طاقت کے نشے سے اس کے مزاج ہی بدل گئے۔ وہ مکانات جو کبھی اس کی پیاس بجھانے کا سبب بنتے تھے لپک لپک کر ان کے صحن اور کمروں میں داخل ہونے لگا۔ اور سامان کے ساتھ ساتھ کئی لوگ بھی رگیدتا ہوا لے گیا۔ مزدوروں کی ایک ٹولی نے بھاگ کر نزدیکی زیر تعمیر مکان کی دوسری منزل پر پناہ لی۔ اسی مکان کے پچھواڑے میں ایک پینتیس چھتیس سالہ عورت اس سیلابی

ریلے کے خلاف برسرِ پیکار تھی۔ وہ اپنے دو معصوم بچوں سمیت اوپر والی منزل پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی ۔کئی ایک بار وہ خود تو سیڑھیوں تک پہنچ گئی جہاں سے اوپر جانا کوئی مشکل نہیں تھا لیکن چونکہ بچے نہ پہنچ سکے اس لیے واپس لوٹ گئی۔

اسی اثنا میں صحن میں اتنا پانی بھر گیا کہ اب سیڑھیوں تک پہنچنا بھی محال ہو گیا۔ ایک مزدور جو اوپر سے بپھرے ہوئے لئی کی بدمستیاں دیکھ رہا تھا اس کی نظر اس عورت اور اس کے دو معصوم بچوں پر پڑی۔

''اوئے جلدی سے رسی لاؤ۔'' اس نے چیخ کر کہا

''لوگوں کو اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے اور کمینہ پانی میں اترنے کی سوچ رہا ہے''۔ ایک مزدور نے کہا۔

''کوئی گٹھڑی یا صندوق تیرتا نظر آ گیا ہوگا'' دوسرے نے جواب دیا۔

''اس پانی میں اترے گا تو جان سے جائے گا''۔ تیسرے نے کہا

''اوئے مرن جوگیو! ادھر آؤ بچے اور عورت ڈوب رہے ہیں۔ اس نے اور زور سے چیخ کر کہا۔''

بچوں کا سن کر سارے مزدور دوڑے آئے۔ انھوں نے ایک رسی نیچے پھینکی۔ عورت نے جلدی سے ایک بچے کو کمر سے باندھا جس کو مزدوروں نے اوپر کھینچ لیا۔ پانی کی مقدار تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

انھوں نے دوبارہ رسی نیچے پھینکی اس عورت نے جلدی سے دوسرے بچے کو بھی اس طرح باندھ دیا جس کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ پانی کا قد مسلسل اٹھتا جا رہا تھا۔ عورت کمر تک پانی میں ڈوب چکی تھی۔ مزدوروں نے جلدی سے رسی نیچے پھینکی۔ اسی دوران میں پانی کا ایک تیز ریلا آیا اس تیز ریلے میں ایک دفعہ اس عورت کا ہاتھ ابھرا جیسے کوئی بچھڑنے والوں کو الوداع کہتا ہے اُس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ لئی کے اژدھانے سارا شہر نگل لیا لیکن مامتا کو شکست نہ دے سکا۔

(مشمولہ افسانوی مجموعہ گھاؤ ۲۰۰۹ء)

نام	ملک محمد ارشد
قلمی نام	ارشد سیماب ملک
ولدیت	ملک دوست محمد
پیدائش	۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء کیمبل پور (اٹک)
تعلیم	میٹرک کمپیوٹر ڈپلومہ

ارشد سیماب ملک کے آباواجداد کا تعلق وادی سون سکیسر سے کچھ دوری پر آباد گاؤں پیل کے ایک اعوان زمیندار گھرانے سے ہے۔ ماضی میں اس خاندان کا گاؤں کے سیاسی منظر نامے میں بھی حصہ رہا ۔والدہ کا تعلق ڈھیر گاؤں کے اعوان زمیندار خاندان سے ہے۔ والدِ گرامی ملک دوست محمد برطانوی راج کے دوران پیشہ سپاہ گری سے منسلک ہوئے اور دوسری جنگِ عظیم میں برما کے معاز پر جنگ لڑی اس دوران ساڑھے تین سال جاپان کی قید میں گزارے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد محکمہ پولیس میں لاہور سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا تبادلہ کیمبلپور (اٹک) میں ہوا تو یہیں کے ہو کر رہ گئے اور تحصیل اٹک میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں ۱۹۶۹ء کو ارشد سیماب ملک کی ولادت ہوئی۔انہوں نے ۱۹۸۶ء میں میٹرک کی بعد ازاں کمپیوٹر ڈپلومہ کیا۔

فنِ مصوری کا ذوق بھی رکھتے ہیں اٹک کے معروف آرٹسٹ لال جی سے رہنمائی لی۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء میں آل اٹک اوپن بیڈمنٹن ٹورنمنٹ کے سنگل اور ڈبلز کا ٹائٹل حاصل کیا۔

ادبی سفر کا آغاز ۱۹۹۵ء میں اردو نظموں پر طبع آزمائی سے کیا لیکن جلد ہی افسانہ و تحقیق کی جانب مائل ہوئے ان کے افسانے ادبیات، فنون، ماہ نو، روشنائی، تحریرِ نو، قندیل اور مشعل میں شائع ہوئے۔ سن ۲۰۰۰ء میں اٹک کی ادبی تنظیم قندیل ادب سے وابسطہ ہوئے اور اسی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی کتابی سلسلہ ''قندیل'' کے مدیر رہے۔ بعد ازاں اس ادبی تنظیم کے معاون سیکرٹری رہے۔ان کی

زیرِ ادارت شائع ہونے والے پرچہ کی حلقہءِ نگارش میں نذر صابری، ڈاکٹر وزیر آغا، نثار اکبر آبادی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر فتح محمد ملک، محمد اظہار الحق، ڈاکٹر ایوب شاہد، ڈاکٹر رشید امجد، منشا یاد، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، شبنم رومانی، محسن بھوپالی، اکبر حمیدی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، حمید شاہد، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے علاوہ دیگر کئی ممتاز اہل قلم شامل رہے۔ اب اٹک سے سید نصرت بخاری کے ساتھ بہ طور مدیر ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''ذوق'' شائع کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء سے مقامی زبان کیمبل پوری کے چھاچی لہجہ میں کہانیاں لکھ اور مضامین لکھ رہے ہیں۔

مطبوعات:

ا۔ تذکرہ (شعرائے اٹک ۱۷۰۰ تا ۲۰۱۲ء) (جلد اول) سال طباعت ۲۰۱۲ء

۲۔ دستاویز (۲۰۱۸ء)

غیر مطبوعہ

کیمبل پوری ادب (چھاچی و گھیبی لہجہ)

تذکرہ شعرائے اٹک (جلد دوم)

ادب نامہ (کیمبل پور اٹک)

ادب، فنونِ لطیفہ اور کیمبل پور کے غیر مسلم

اٹک کی ادبی تنظیمیں ایک جائزہ

اِنوائرنمنٹ پارک (اردو افسانے)

سانجھ (افسانے چھاچھی بولی)

دھند میں لپٹا آدمی

ارشد سیماب ملک

اُسے یوں لگا، جیسے وہ وجودوں میں گھرا ایک وجود ہے۔

اور اس کے چہار سمت بیٹھے ہوئے لوگ اپنے وجود کو چھوڑ کر دُور کہیں گھنے جنگلوں میں چلے گئے ہیں یا پھر نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سب موجود ہوں اور میں ہی نہ ہوں۔

ہاں شاید وہ سب موجود ہیں اور میں ہی کہیں گم ہو گیا ہوں۔

مگر ایسا ہے تو پھر یہ شور کہاں سے سنائی دے رہا ہے۔

اس نے ہوٹل کی دیوار سے لگے کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے دماغ پر زور دیا اور بہت سوچ بچار کے بعد خود سے پھر گویا ہوا۔

کہیں یہ تو نہیں کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح میرا وجود اوڑھ کر بھٹک رہی ہو۔

یہ خیال آتے ہی اس نے داہیں ہاتھ کی انگلی پر زور سے کاٹا اور بڑبڑا اُٹھا۔

نہیں ابھی میں مرا نہیں ہوں، یقیناً کہیں گم ہو گیا ہوں۔

ہاں مگر میں کب اور کہاں گم ہوا ہوں۔

ہوٹل میں قریب قریب کوئی بھی ٹیبل خالی دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا منیجر ریموٹ ہاتھ میں لیے بہت دیر سے ٹیلی ویژن کے چینل تبدیل کیے جا رہا تھا۔

اس کی قریبی میز پر پڑی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی جب کہ ٹیبل پر موجود شخص جس کے بال بکھرے ہوئے اور بویں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں، سگریٹ کے لمبے کش لیتا، اسے مسلسل تکے جا رہا تھا۔

وہ پھر دماغ پر زور ڈالتے کب اور کہاں گُتھی سلجھانے لگا۔

بہت دیر کے بعد اسے کچھ یاد پڑا کہ جب وہ گھر سے نکلا ہے تو چہار سمت گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور سامنے کا منظر واضح نہیں تھا۔

تب اس کے بال سیاہ گھنگریالے، چہرہ وجیہ، کمر تنی ہوئی اور جسم پر پیوند لگا ٹاٹ کا خرقہ تھا۔

پھر نہ جانے کتنے سال وہ گہری دھند میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرا یہاں تک کہ اس کے پیروں کی ایڑیاں پھٹ گئیں اور سیاہ گھنگریالے بالوں میں سفیدی در آئی تھی۔

اس کی تنی ہوئی کمر خمیدہ ہو گئی اور وہ براق خرقہ پہنے اسی ہی مقام پر خالی دامن کھڑا تھا۔

معاً اسے خیال گزرا کہ وہ، وہ نہیں تھا۔ اس نے اضطراب میں بغلی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور پھر فضا میں تحلیل ہوتے دھویں کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

ہاں اگر وہ میں نہیں تھا تو پھر کون تھا۔

یہی سوچتے ہوئے اس نے بکھرے بالوں والے کی جانب دیکھا اور پھر ہوٹل کا چوبی زینہ اُترتے ہوئے فٹ پاتھ پر آ گیا۔

ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی اور وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا ٹھٹک کر عین اس وقت رُکا جب ایک دھواں چھوڑتی موٹر کار تیزی سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔

جب وہ گھر پہنچا ہے تو کمرے کے وسط میں آف سیزن کے کپڑوں کے ڈھیر میں اس کی بیوی دبکی بیٹھی تھی۔ قریب ہی کاغذ کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے جن میں اس کی ایک یادگار تصویر بھی نمایاں تھی۔

یکا یک اسے یوں محسوس ہوا، جیسے تصویر کی جگہ وہ زمین پر گرا پڑا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر تصویر کو اُچک لینا چاہا۔

''جاؤ پہلے کھانا کھا لو۔'' بیگم نے یہ کہہ کر اس کی توجہ ہٹا دی۔

وہ کچن میں جانے سے پہلے بغلی کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کا نقشہ بدلا بدلا سا لگا۔ بیگم نے کھڑکیوں کے پردے تبدیل کر دیے تھے۔ موسم کی مناسبت سے بیڈ شیٹس اور لحاف بھی پڑے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ کمرے سے پلٹا ہے تو بیگم پرانے کپڑوں کی گٹھڑی بنا کر سٹور میں پڑی پیٹی میں ڈال کر ابھی واپس آئی تھی۔ وہ اس بابت سوچ رہا تھا کہ باہر دروازہ پر اُس کے ایک کولیگ نے دستک دی جو اسے آفس سے متعلقہ ایک ضروری کام کے لیے لے جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا چار و نا چار وہ

اس کے ساتھ ہولیا۔

وہاں سے فراغت کے بعد جب گھر پہنچا تو خنک شام رات کے آنگن میں اُتر آئی تھی۔ بیگم کچن میں رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔

وہ فوراً کمرے کی جانب لپکا، فرش صاف ستھرا تھا۔ کہیں بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا یا تصویر نہیں پڑی تھی۔

اس نے سوچا شاید بیگم کی نظر پڑ گئی ہو اور اس نے اسے کہیں سنبھال کر رکھ دیا ہو، اس غرض سے تمام متوقع جگہ اس نے دیکھ ڈالا مگر مایوسی کا سامنا رہا۔

رات جب وہ لحاف اوڑھ کر سویا ہے تو اسے یوں لگا جیسے بیگم نے پرانے کپڑوں کی ایک گٹھڑی میں باندھ کر اسے پیٹی میں بند کر دیا ہے۔ اندر گھپ اندھیرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور گٹھڑی میں بندھے کپڑوں میں سے سانپ لہریے لے رہے ہیں جن کی خوف ناک پھنکار سے اس پر وحشت طاری ہے اور وہ گھپ اندھیارے میں واویلا کر رہا ہے مگر اس کی آواز، اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتی ہے۔

اچانک وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا، اس کا بدن پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ وہ خیالوں میں گم دبے پاؤں سٹور میں داخل ہوا اور لائٹ آن کر کے دیکھا تو پیٹی کو تالا لگا ہوا تھا، وہ فوراً کمرے میں پلٹ آیا اور اس زنگ آلود تالا کی چابی تلاش کرنے لگا۔ اس دوران اس نے سوچا، ہوسکتا ہے کہ یہ اس کا وہم ہو اور بیگم نے اسے پیٹی میں بند کیا ہی نہ ہو بلکہ فالتو چیز سمجھ کر کچرے کے ڈبہ میں یا پھر کہیں غلاظت اور گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اُٹھا اور کوڑے کے ڈبہ میں دیکھا اور پھر باہر کا دروازہ کھول کر وہاں پہنچ گیا جہاں سارے شہر کا کچرا اکھٹا ہوتا ہے۔

چاند گہرے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں سے جھانک رہا تھا۔ دُور تک کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دے رہا تھا ، تاہم جگہ جگہ شہر کے آوارہ کُتے بھونک رہے تھے۔ کچرے کے ڈھیر میں خود کو تلاش کرتے ہوئے وہیں اس کی آنکھ لگ گئی اور رات بھر آوارہ کتے اس کا منہ چاٹتے رہے۔

دوسرے دن صبح اپنے آپ کو گھر میں پا کر وہ سخت حیرت زدہ ہوا تاہم اس نے جلدی سے ناشتہ کیا، جب وہ دفتر پہنچا تو بہت بے چین تھا۔ تمام عملہ کو خلافِ معمول اس کی بے چینی پر سخت تعجب ہو رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر موجود فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر عجلت میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

ہانپتا ہوا جب وہ گھر پہنچا تو بیگم اس کے چہرہ پر بوکھلاہٹ دیکھ کر تعجب سے بولی۔

''ارے تم اتنی جلدی آفس سے آ گئے۔''

''بیگم وہ کل تم نے پرانے کپڑوں گٹھڑی میں کہیں م۔۔۔۔'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بیگم بولی۔

''ہاں وہ گٹھڑی۔ابھی تھوری دیر پہلے ہی میں نے باہر گلی میں سدا لگانے والے ایک فقیر کو دے دی ہے۔''

''عجب عورت ہو، تمھیں اتنا معلوم نہیں کہ اس گٹھڑی میں۔۔۔۔مَیں تھا'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ تب ہوا جب بیگم نے اس آدمی کا حلیہ بیان کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا، پتہ نہیں اس آدمی کا حلیہ کیسا تھا۔ وہ جوان تھا یا بوڑھا، اس کے چہرہ پر داڑھی تھی یا نہیں، وہ گورا تھا یا کالا۔۔۔۔۔

وہ اسی سوچ بچار میں گھر سے نکلا اور سہ پہر تک شہر میں ہر جگہ مارا مارا پھرا۔ اسے شہر میں چلتا پھرتا ہر شخص ہی بھکاری لگا مگر وہ آدمی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دفعتاً اسے خیال آیا، ہوسکتا ہے کہ وہ گٹھڑی سے کہیں گر گیا اور خود کو تلاش کرنے کے بجائے خواہ مخواہ اس فقیر کو ڈھونڈ رہا ہے جو معلوم نہیں فقیر تھا بھی یا نہیں۔

وہ تھک ہار کر اسی خیال سے ایک مسجد کے باہر بھکاریوں میں جا بیٹھا۔ وہاں سے اٹھا تو اندر نمازیوں میں داخل ہو گیا، اور پھر منبر پر جا بیٹھا۔ شام تک سارے شہر میں مارا مارا پھرا، اور خود کو مسجد، مندر، کلیسا اور نا جانے کہاں کہاں ڈھونڈ ڈالا۔ مگر یہیں کہیں ہونے کے باوجود ۔۔وہ کہیں بھی نہیں تھا۔!

(سہ ماہی ادبیات اسلام آباد مرتبہ احمد ندیم قاسمی، مہمان مدیر اعلا ۲۰۰۶ء)

نام عنایت علی خان

ولدیت حاجی محمد اکبر خان

پیدائش ۱۲ دسمبر ۱۹۷۰ء

جائے پیدائش ناڑہ (اٹک)

تعلیم بی کام

عنایت علی خان نے ابتدائی جماعتیں کراچی اور پشاور میں پڑھیں۔ اس کے بعد پرائمری سکول ناڑہ سے پرائمری پاس کی۔ میٹرک تک ہائی سکول ناڑہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ ایف اے گورنمنٹ انٹر کالج فتح جنگ سے کی۔ ۱۹۹۰ء میں پاکستان نیوی کی کمیونیکشن برانچ میں شمولیت اختیار کی۔ دوران ملازمت کراچی سے بی کام کیا۔ اپنی مدتِ ملازمت میں بحری جہازوں پہ سروس کے دوران مشرق سے مغرب و افریقہ تک ۳۵ سے زائد ممالک کو دیکھنے کا موقع ملا۔ لکھنے کا شوق بچپن سے تھا ابتدائی طور پر ان کی تحریریں ہمدرد نونہال اور تعلیم و تربیت میں چھپتی رہیں۔ بعد ازاں ملٹری میگزین اور کئی دوسرے رسائل میں لکھتے رہے، ان کا پہلا افسانہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں ملازمت سے ریتائر ہوئے۔ ۲۰۱۲ء سے سعودی عرب میں مقیم ہیں اور ٹیلی کام کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ زیرِ ترتب ہے۔

کششِ ثقل

عنایت علی خان

وہ آسمان کے اس آخری کنارے پہ پہنچا۔ اتنا قریب تھا کہ وہ ایک جست میں اس آخری رکاوٹ کو عبور کر کے زمین کی حد سے باہر نکل کر ایک نئی دنیا میں گم ہوجاتا۔ اس نے آخری بار نیچے زمین کی طرف دیکھا لیکن ایک دھند اور کہر میں لپٹی زمین میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔

ہاہاہا کششِ ثقل۔۔۔

اس نے دل ہی دل میں سائنس کا مذاق اڑایا کہاں ہے کششِ ثقل؟؟

اے زمین تیرا اب مجھ پہ کوئی بس نہیں چلے گا۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا اور ایک جست میں آخری حد کو عبور کر کے ایک نئی کہکشاں میں داخل ہوگیا۔۔۔

وہ اس کہکشاں میں شاید پہلا زمینی باشندہ تھا کیونکہ اسے اس کے سوا کوئی اور وہاں پہ نظر نہیں آیا۔ لیکن اسے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ اس جگہ پہ کوئی اور آئے۔

اس نے تقریباً اڑتے ہوئے پوری کہکشاں کا ایک چکر لگایا لیکن اس کی رفتار حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی ابھی صرف پانچ سیکنڈ گزرے تھے گویا صرف پانچ سیکنڈ میں اس نے پوری کہکشاں کا چکر لگایا۔ وہ خوشی و مسرت سے جھوم اٹھا گویا اس نے وقت کو بھی شکست دے دی تھی۔۔۔ کاش اہل زمین کو پتہ چل سکتا کہ میں کہاں ہوں اور میری طاقت کا اندازہ ان کو بھی ہوتا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اگلے لمحے اس کو خیال آیا کہ آئندہ زمین کے بارے سوچے گا بھی نہیں۔ اسے خیال گزرا کہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہیے اور پھر جی بھر کر اس کہکشاں کے کونے کونے کی سیر کرے گا کیونکہ اس کے پاس وقت ہی وقت تھا اس نے وقت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی لیکن نہ تو وہ دن

تھااور نہ ہی رات۔ وہ جب سے وہاں آیا تھا ایک دودھیا سی روشنی تھی جس سے وہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ دن کے کس حصے میں ہے۔ اس نے دوبارہ گھڑی کے ڈائل کی طرف دیکھا اور حیرت سے اس کی چیخ سی نکل گئی ابھی تک پانچ سیکنڈ ہی تھے۔ ایک بار تو اسے خیال آیا کہ شاید گھڑی رک گئی ہے۔ لیکن جب اس نے ڈیجیٹل گھڑی کو دیکھا تو وہاں بھی پانچ سیکنڈ ہی تھے۔ اس کے پاس جو ڈیجیٹل گھڑی تھی وہ مائیکروسیکنڈ ملی سیکنڈ حتیٰ کہ نانوسیکنڈ بھی بتاتی تھی۔

اس نے بٹن دبا کر سب کو آن کر دیا۔ اس نے پہلے سیکنڈ کو دیکھا جو ہنوز پانچ پہ ہی رکا ہوا تھا اس کے بعد بالترتیب اس نے ملی سیکنڈ، مائکروسیکنڈ کو دیکھا لیکن سب کے سب رکے ہوئے تھے۔ اس نے نظریں وقت کی آخری اکائی نانوسیکنڈ پہ گاڑ دیں جہاں اسے بہت ہلکی سی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ سکرین پہ نظریں گاڑھے ادھر ہی بیٹھ گیا۔ اس نے ایک پل بھی ادھر ادھر نہیں دیکھا۔ زمینی وقت کے مطابق تقریباً دو گھنٹے وہ سکرین کو گھورتا رہا آخر نانوسیکنڈ کا ایک پوائنٹ آگے ہوا۔۔ وہ آرام کی غرض سے وہیں لیٹ گیا لیکن باوجود کوشش کے اسے نیند نہیں آئی جبکہ اسے اندازاً زمینی حساب سے پانچ دن ہونے کو تھے۔

وہ زمین سے کچھ کھانے کا سامان بھی لایا تھا لیکن اسے پتا تھا کہ یہاں کسی کو بھوک پیاس کی طلب نہیں ہوتی پھر بھی وقت گزاری کے لئے اس نے ایک سیب نکالا اور کھانے کی کوشش کی لیکن حلق سے نہیں اتر سکا اس کا ذائقہ بھی عجیب سا تھا اس نے فوراً تھوک کر سیب کو پھینک دیا اور ایک بار پھر کہکشاں کی سیر کو نکل پڑا۔ اس سے پہلے اس نے دوبارہ گھڑی کو دیکھا جہاں چند مائیکروسیکنڈ کا فرق پڑا تھا۔ اس نے ایک اڑان بھری اور کہکشاں کے چپے چپے کو کھوجنے لگ گیا۔

اس نے ایک چکر لگایا پھر دوسرا تیسرا اور پھر مسلسل لگاتار کئی چکر اس نے کہکشاں کے لگائے۔ ایک ایک چپہ اس نے دیکھا اور کئی بار دیکھا اور پھر تھک کر ایک جگہ بیٹھ کر اس نے دوبارہ گھڑی نکالی۔ ابھی صرف دو سیکنڈ کا فرق پڑا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا اس نے غصے سے گھڑی کے ڈائل پہ لگی سوئیوں کو بٹن سے گھمانا شروع کر دیا لیکن ڈیجٹیل گھڑی کا وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

اب عجیب طرح کی بے چینی اور بوریت کا وہ شکار ہو چلا تھا اس کہکشاں میں اب کچھ نہ بچا تھا جسے وہ کھوجتا۔ نہ بھوک نہ پیاس نہ نیند نہ غم کچھ بھی تو نہیں تھا حتیٰ کہ نہ دن تھا اور نہ تاروں بھری راتیں اور نہ ہی صبح کا پرنور اجالا اور نہ شام کی اداسی۔ وہ ہنسنا چاہتا تھا اور رونا بھی چاہتا تھا لیکن یہاں پر تمام ایسے احساس ختم

ہو چکے تھے۔اسے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوااور وہ زمین اور اہل زمین کے متعلق سوچنے لگا۔وہ ان رشتوں ناطوں کو سوچنے لگا جن کو وہ چھوڑ کے آ گیا تھا۔وہ رنگ وہ موسم بارشیں ایک ایک کر کے اسے سب یاد آنے لگا۔اسی پہلی بار وقت کا بھی احساس ہوا۔اب وہ ہر حالت میں واپس زمین پر لوٹنا چاہتا تھا جو کہ بہت مشکل تھا اس کوشش میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔

آخر وہ اٹھا اور زمین کی طرف سفر کا آغاز شروع کر دیا۔جوں جوں وہ زمین کے قریب ہوتا گیا کشش ثقل کی وجہ سے اس کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔وہ جو سپیشل سوٹ پہن کر آیا تھا آہستہ آہستہ تیز رفتاری اور ہوا کی رگڑ کی وجہ سے جواب دیتا جا رہا تھا۔اگر وہ زمین پہ پہنچنے سے پہلے خراب ہو جاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔۔۔وہ دعا کرتا رہا کہ ایسا نہ ہو۔آخر کار وہ زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اس نے بٹن دبا کر پیرا شوٹ کھول لیا زمین پہ لینڈنگ سے پہلے اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن زمین سے رابطہ جڑتے ہی کشش ثقل نے اسے اوندھے منہ گرایا۔کافی دیر وہ وہیں پڑا رہا تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو پیرا شوٹ کی رسیوں سے آزاد کرایا اور فوراً گھڑی کو نکال کر ڈائل کو دیکھا جہاں سیکنڈ کی سوئی اپنی مخصوص رفتار سے ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ رہی تھی اسے پہلی بار وقت کی قیمت کا ادراک ہوا۔

وہ پہلی بار ایک لمحہ کی قدر و قیمت کو جان پایا تھا۔یہ لمحہ بھی عجیب چیز ہے وقت کی سب سے چھوٹی اکائی لیکن اسی ایک لمحے میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔اسی ایک لمحے میں محبت کا چراغ جلتا ہے اور نفرت کی چتا بھی روشن ہو جاتی ہے۔اسی ایک لمحے کے بطن سے مسرتوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔غم کے الاؤ جلتے ہیں۔یہ لمحہ ایک حادثہ ہے تغیر ہے۔کائنات کی ہلچل ہے ستاروں کی روشنی ہے کہکشاؤں کا چلن ہے۔محبت کی قندیل اور نفرت کی دلیل ہے۔ایک اچھا لمحہ ایک خوبصورت گھڑی ہی اصل زندگی ہے یہ ہی راز زندگی ہے۔وہ فوراً سجدے میں گر گیا اور گڑگڑا کر دعا کرنے لگا۔اے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔برے دن، بری رات، بری گھڑی اور برے وقت سے اور آپ کے ناگہانی عذاب سے اور ہر طرح کے غصے سے اور نعمتوں کے چھن جانے اور عافیتوں کے پھر جانے سے اس نے سجدے سے سر اٹھایا صبح کا پر نور اجالا اندھیرے کو چیرتا ہوا ہر سو پھیل رہا تھا۔دور کسی مسجد میں اللہ اکبر کی خوبصورت آواز پوری کائنات میں گونج رہی تھی۔

نام	شبنم بخاری
ولدیت	سید ولایت شاہ
پیدائش	۲۴ جولائی ۱۹۷۱ء
مقامِ پیدائش	کراچی
تعلیم	ایم اے

شبنم بخاری کا تعلق کامرہ کلاں اٹک سے ہے۔ تاہم ان کی پیدائش اور تعلیمی مراحل کراچی میں ہی طے ہوئے۔ ان کی ولادت ۲۴ جولائی ۱۹۷۱ء کو کراچی میں ہوئی۔ ڈیفنس کراچی کے ایک سکول دخترانِ عوام سے ۱۹۸۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ایف ایس سی ۱۹۹۲ء میں گریجویشن کی اور ایم اے کیمسٹری انہوں نے ۱۹۹۵ء میں کراچی یونی ورسٹی سے کیا۔ بعد ازاں جب اٹک تشریف لائیں تو یہاں یونی ورسٹی آف ایجوکیشن سے بی ایڈ کیا اور پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت کا آغاز لیز رسکول اینڈ کالج کراچی سے کیا ۱۹۹۶ء ایم آر ایف کالج کامرہ اور ۱۹۹۷ء گورنمنٹ کالج برائے خواتین فتح جنگ میں بہ طور لیکچرر تدریسی خدمات انجام دیں۔

شادی کے بعد وہ کچھ عرصہ اپنے خاندان کے ہمراہ سعودی عرب مدینہ منورہ میں مقیم رہیں، وہاں قیام کے دوران انہوں نے انٹرنیشنل پاکستانی سکول میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ طلعت نورین عروبہ کے ہمراہ دیارِ غیر میں ادبی تنظیم ''سلسلہ'' کے پلیٹ فارم سے اردو ادب کے فروغ میں کردار ادا کیا۔

۲۰۰۳ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''سمندر کھائی اور وہ'' ماورا پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ خالد شریف، طلعت نورین عروبہ اور منشا یاد نے ان کے افسانوں پر اپنی آراء دی۔ محترم منشا یاد ان کے افسانوں پر رقمطراز ہیں:

''شبنم بخاری کی کہانیوں میں کوئی ایک مشترکہ عنصر تلاش کیا جائے تو وہ ایک ایسے گھر کا تصور ہے جسے کسی نہ کسی وجہ سے سلامتی کا مسلہ درپیش ہے اور کہانی کار کی خواہش ہے کہ اسے ٹوٹنے سے بچایا

جائے۔۔۔شبنم نے افغانستان کے بارے میں بھی کچھ کہانیاں لکھ کر ایک ملی فریضہ ہی ادا نہیں کیا بلکہ اپنے موضاعات کا دائرہ بھی وسیع کر لیا ہے۔یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ ایسے موضوع پر بھی کہانی لکھنے پر قادر ہیں جوان کا ذاتی تجربہ ہو نہ انہوں نے دیکھا ہو۔۔۔شبنم بخاری کی زبان صاف سلیس اور اسلوب سادہ مگر دلنشین۔وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں نہایت موزوں اور مناسب ترین لفظوں میں کہہ لیتی ہیں۔ان کی تحریر کے تیور بتا رہے ہیں کہ ان میں ایک اچھی کہانی کار کی ساری خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہیں۔"

(منشایاد، دیباچہ،سمندر کھائی اور وہ ۲۰۰۳ء ص ۱۳)

شبنم بخاری آجکل اسلام آباد میں مقیم ہیں اور ایک پرائیویٹ سکول کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

ماخذ

ٹیلی فونک مکالمہ، راقم، نومبر ۲۰۰۹ء
شبنم بخاری، سمندر کھائی اور وہ، ۲۰۰۳ء
سید نصرت بخاری، شخصیاتِ اٹک

آہ وفغانستان

شبنم بخاری

''سیاہ سنگ'' گاؤں کے مقدر پراس کے نام کی تاریکی چھا گئی تھی۔مٹی کے گھروندے بھی مٹی ہو چلے تھے۔بھوک،افلاس،غربت،فاقہ۔ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر رقص کرتے پھر رہے تھے۔

عبدالسلام پچھلے دو گھنٹے سے ڈھلوان پر پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس کا آخری سہارا اس کی روزی کا واحد ذریعہ اس کا عزیز گدھا بالآخر بھوک کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا۔عبدالسلام میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ گھر جا کر بیوی کو یہ خبر سناتا۔اس کے نحیف وجود پر لرزہ طاری تھا۔خشک ہونٹوں میں بین کرنے کی سکت بھی نہ تھی۔پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے ان میاں بیوی نے رزق کا ایک ذرہ بھی نہ چکھا تھا۔اب تو بچے بھی رات بھر سے بھوک سے بلبلاتے پھر رہے تھے۔سوکھے نان کے باسی ٹکڑے کل دوپہر کو انہوں نے پانی میں بھگو کر کھائے تھے۔پر اب تو باسی نان کا کوئی ٹکڑا بھی باقی نہیں تھا جو ماں انہیں کھانے کو دیتی۔

عبدالسلام امدادی مرکز سے گندم کی بوری حاصل کرنے کا خواب آنکھوں میں سجائے گھر سے نکلا تھا۔یہ امدادی سنٹر پورے چوبیس گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔پر اس کا نحیف و لاغر گدھا چوبیس منٹوں کی مسافت بھی مشکل طے کر پایا تھا۔ڈھلوان پر چڑھتے چڑھتے تو اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی تھی۔عبدالسلام نے پیار سے گدھے کی پیٹھ تھپتھپائی مگر اس نے گردن نیچے جھکا لی۔عبدالسلام نے سامنے جا کر اس کا منہ ہاتھوں کے پیالے میں جب تھاما' گدھے نے حسرت و بے بسی کی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر اس کے قدموں میں ڈھے گیا اور اب پورے دو گھنٹے سے عبدالسلام اسی ڈھلوان کے ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔پہلے تو گدھے کی موت اور گندم کی بوری کے حصول میں ناکامی کا سوچ کر بے آواز ہچکیوں سے روتا رہا۔پھر یکا یک بجلی کے کوندے کی طرح اک خیال اس کے ذہن میں لپکا'اس کی زرد اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں اچانک چمک لہرائی۔

چار سال ہونے کو تھے' سوکھے نان کے ٹکڑے چائے یا پانی میں بھگوئے ہوئے' بس یہی ان کی خوراک تھی ۔ ہاں بہار کے دنوں میں انہوں نے خودرو گھاس بھی ابال کر کھائی تھی اور بس ۔ ۔ ۔ گوشت کھانے کو تو کیا دیکھنے کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ پر آج قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تھا' گوشت کھانے کا موقع ۔ گدھے کا ہی سہی پر گوشت تو ہوگا۔ ابھی کل ہی تو اس کا منجھلا لڑکا گل اپنے بھائی سے کہے رہا تھا۔

''گوشت کا ذائقہ بھی کیا نان جیسا ہوتا ہے؟''

وہ یہ سن کر ہنس پڑا تھا اس کی بیوی کے پچکے ہوئے گالوں پر دو آنسو اسی طرح آ کر ٹھہر گئے تھے جس طرح برسات کے دنوں میں گرد اور مٹی سے اٹے پتوں پر بارش کے قطرے سستانے کو ٹھہر جاتے ہیں۔

طبارخ کے گال پہلے گرد اور مٹی سے اٹے پتوں کی طرح گدلے نہ تھے۔

گلاب کی سرخ پتیوں سے زیادہ چمکیلے اور روشن تھے۔ پر اب کئی ماہ سے اس نے صابن سے منہ نہ دھویا تھا اور پچھلے دو ہفتوں سے تو وہ پانی کے گھونٹ بھی گن گن کر پیتی تھی۔ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ مٹی کا وہ کچا گھڑا تھا جسے وہ میلوں دور لے جاتی تھی تاکہ ان سب کو پینے کے لیے پانی مل سکے۔

عبدالسلام اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑتے ہوئے اٹھا' پہلے اس نے گدھے کی لاش کو کندھے پر لاد کر لے جانے کا ارادہ کیا مگر اس کے وجود کی ناتوانی اس بوجھ کو اٹھانے کی متحمل نہ تھی۔ لہٰذا اس نے گدھے کو گھسیٹ کر ڈھلوان سے اتارنے کا منصوبہ بنایا۔ پر چند قدم کے بعد یہ بھی مشکل ہو گیا ڈھلوان پر جا بجا نوکیلے پتھر اگے ہوئے تھے۔ گدھے کو گھسیٹنے کے لیے عبدالسلام کو الٹے قدموں چلنا پڑتا تھا۔ ہموار رستہ ہوتا تو خیر تھی پر یہاں سے تو گرنے کا خطرہ تھا۔ عبدالسلام کا ذہن جو بھوک اور نا امیدی نے سلا رکھا تھا۔ اچانک بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی قریب ہی ایک بڑا پتھر پہاڑ کی اس ڈھلوان میں کچھ اس طرح پیوست تھا جیسے کہ کوئی سنگ تراش چھریرے بدن کے نقوش تراشتے ہوئے اسے ادھورا چھوڑ گیا ہو۔ عبدالسلام گدھے کی لاش کو گھسیٹ کر پتھر سے کچھ فاصلے پر نیچے کی طرف لے گیا۔ پھر وہ دوبارہ مڑا، نیچے لیٹ کر اس نے اپنے بازو سر سے اوپر اس پتھر کے گرد حمائل کیے، اس کے پاؤں اب گدھے کی لاش کو چھو رہے تھے۔

کچھ دیر اس نے اپنے جسم کو متوازن کرنے اور پتھر کے گرد اپنے بازوؤں کے حلقے کو مضبوط کرنے میں لگائی۔ پھر بسم اللہ پڑھتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگیں اپنے جسم کی طرف موڑیں اور پھر ان کو لمبا کرتے

ہوئے زور سے دونوں پاؤں سے پوری طاقت کے ساتھ گدھے کے جسم کو دھکا دیا۔ گدھے کا مردہ وجود نیچے لڑھکتا چلا گیا، عبدالسلام چند لمحے بے حس وحرکت لیٹا رہا مگر اپنی ہمت دوبارہ جمع کرتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اٹھا، تب تک گدھے کی لاش نیچے پہنچ چکی تھی۔ کامیابی و مسرت کے احساس نے عبدالسلام کے قدموں کو مضبوطی عطا کر دی تھی۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ نیچے اترا تھا۔ گدھے کی لاش گھسٹنے اور نوکیلے پتھروں کے باعث جگہ جگہ سے زخمی اور گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ پھٹی ہوئی کھال سے جھانکتا مٹی زدہ گوشت عبدالسلام کے منہ میں پانی لے آیا۔

طبارخ اور بچوں کی بھوک کا احساس پھن پھیلائے سامنے نہ آ کھڑا ہوتا تو اس نے یہیں اپنے دانت گدھے کے مردہ وجود میں گاڑ دینے تھے۔ پر اس وقت تو اس پر جلد از جلد یہ غیر متوقع نعمت اپنے خاندان تک پہنچانے کی دھن سوار تھی۔ ڈھلوان کا پل صراط عبور کر لینے کے بعد اب چند منٹوں کی مسافت باقی تھی۔ عبدالسلام اب خشک کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا، کبھی یہاں گندم کی بالیاں سر اٹھا اٹھا کر آنے جانے والوں کو خوش آمدید کہا کرتی تھیں۔ پر اب تو کھیتوں کی رنگت بھی بھوری ہو چکی تھی۔ چار سال سے ان کھیتوں پر بوند بھی نہ برسی تھی، رزق کے اس قبرستان کو عبور کر کے بالآخر عبدالسلام اپنے مٹی سے بنے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ عبدالسلام گدھے کے مردہ وجود کو گھر تک لانے کی کامیاب جدوجہد پر اس قدر مسرور تھا کہ اندر سے آتی بین کی آواز سن ہی نہ پایا۔

''طبارخ۔۔لالہ رخ۔۔عبدل۔۔گل جنت۔۔باہر آؤ جلدی سے۔۔''

عبدالسلام کی پکار کے جواب میں بین کی آوازیں جیسے گھٹ کر رہ گئی تھیں، چند لمحے انتظار کے بعد عبدالسلام خود آگے بڑھا مگر دہلیز ہی پر رک گیا۔ باہر شام کے سائے پر پھیلا رہے تھے۔ مٹی سے بنے اس نیم تاریک کمرے کے وسط میں اس کے سات سالہ بیٹے گل کی لاش پڑی تھی، اس کے باقی بچے خوف کی تصویر بنے کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی طبارخ اور دو چار پڑوسنیں بین کر رہی تھیں، بھوک فاقہ غربت ان سب کا مشترکہ پرہن تھا۔ عبدالسلام چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹے کے مردہ وجود کو تکتا رہا پھر وہ لاش کے قریب گیا گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے گل کی لاش کو بوسہ دیا۔ گل کا مردہ بدن سوکھے باسی نان کی طرح اکڑا تھا۔ عبدالسلام کے آنسو بیٹے کے گدلے گالوں پر قہوے کے قطروں کی طرح جذب ہو کر رہ گئے تھے۔

بھوک کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور پھٹے پیراہن جمہوریت کے تاروں سے واقف نہیں ہوتے۔ گل کا مردہ بدن خاک کا کفن اوڑھ کر آنے والے وقت کی ظلمت سے تحفظ پا گیا۔

انسانی حقوق کے علمبرداروں کو خبر نہ ہوئی کہ وہ سات سالہ معصوم نہ سفید لٹھے کا حقدار ٹھہرا اور نہ ہی ماں کے گھڑے کی بوندیں اس کے آخری غسل کا قرض ادا کر سکیں۔ اس کے چاہنے والے باپ نے اسے جلدی جلدی سپردخاک کیا تا کہ وہ زندہ بچ جانے والے بقیہ چار بچوں کو مردہ گدھے کے گوشت کے لقمے کھلا کر اوپر والے سے ان کے لیے چند سانسیں ادھار مانگ سکے۔ گھر میں کھانا پکانے کے لیے کوئی ڈھنگ کا برتن نہ تھا سو آگ پر گوشت کو بھونا گیا معصوم بچے غیر متوقع نعمت پا کر بھائی کا دکھ بھول چکے تھے۔ پر جس کی کوکھ میں الاؤ دہک رہا تھا وہ کیسے بھول پاتی۔

عبدالسلام نے اس کی منت سماجت کی۔ ''دو دن سے بھوکی ہے تو خدا کے لیے چند لقمے لے لے۔''

''موت ہم سب کا مقدر ہے۔'' طبارخ سسکی۔

''ہم سب کو ایک ایک کر کے گل کے پیچھے جانا ہے۔ پھر خود کو دھوکہ کیوں دیں، آج مردار کھا کر بچ گئے تو کل۔۔۔۔کل!۔۔کل کیا ہوگا، عبدالسلام کل کیا ہوگا؟'' طبارخ نے عبدالسلام کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''کل کی بات نہ کر، کل ہمارا مقدر نہیں ہے۔ ہم آج جی لیں یہی بہت ہے طبارخ یہی بہت ہے۔'' عبدالسلام کے آنسو اس کی داڑھی کے گھنے جنگل میں گم ہو گئے۔ لالہ رخ کی پکار پر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

''بابا عبدال کھرپا اور گوشت لے کر قبر پر جا بیٹھا ہے اور۔۔۔۔'' لالہ رخ نے رک کر اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پایا۔

''وہ قبر کھود رہا ہے بابا۔'' لالہ رخ نے روتے، کانپتے اپنی بات مکمل کی۔

طبارخ اور عبدالسلام دونوں قبرستان کی طرف دوڑے جوان کے گھر سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھا، جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا عبدل کھرپے سے مٹی کھود رہا تھا اور جنت اپنے ننھے منے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہی تھی۔

''پاگل ہو گیا ہے تو؟'' عبدالسلام نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔

''چھوڑ دے ابا۔۔چھوڑ دے۔'' عبدل نے التجا کی۔

''یہ کیا کر رہا ہے تو، دماغ چل گیا ہے تیرا، بھائی کی قبر کھود رہا ہے۔'' عبدالسلام نے پھر اسے جھڑکا۔

''بھیا تو۔۔۔ بھائی کو جگانے آیا ہے ابا'' جنت کی معصومیت طبارخ کا دل چیر گئی۔

''تیرا بھائی اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے بیٹا، وہ اب اس گڑھے میں نہیں ہے تو اسے مت کھود۔'' عبدالسلام نے خود پر قابو پاتے ہوئے بیٹے کو سمجھایا۔

''وہ اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے جسے گڑھے میں ڈال کر مٹی سے چھپا دو وہ اللہ میاں کے پاس چلا جاتا ہے۔'' آٹھ سالہ عبدل جیسے ایک دم سے ہی بہت سمجھدار ہو گیا تھا۔ عبدالسلام کی آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی وہ صرف سر ہی ہلا پایا۔

''بابا گل کہتا تھا کیا گوشت کا ذائقہ بھی نان جیسا ہوتا ہے۔'' ننھے عبدل نے بھنے گوشت کا ایک ٹکڑا باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''اسے بھی گڑھے میں ڈال کر مٹی سے چھپا دے پھر یہ بھی اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا۔ گل وہیں ہے نا ابا، وہ اسے کھالے گا اسے پتہ چل جائے گا ابا گوشت کا ذائقہ نان جیسا نہیں ہوتا۔''

(مشمولہ سمندر کہانی اوروہ، ۲۰۰۳ء)
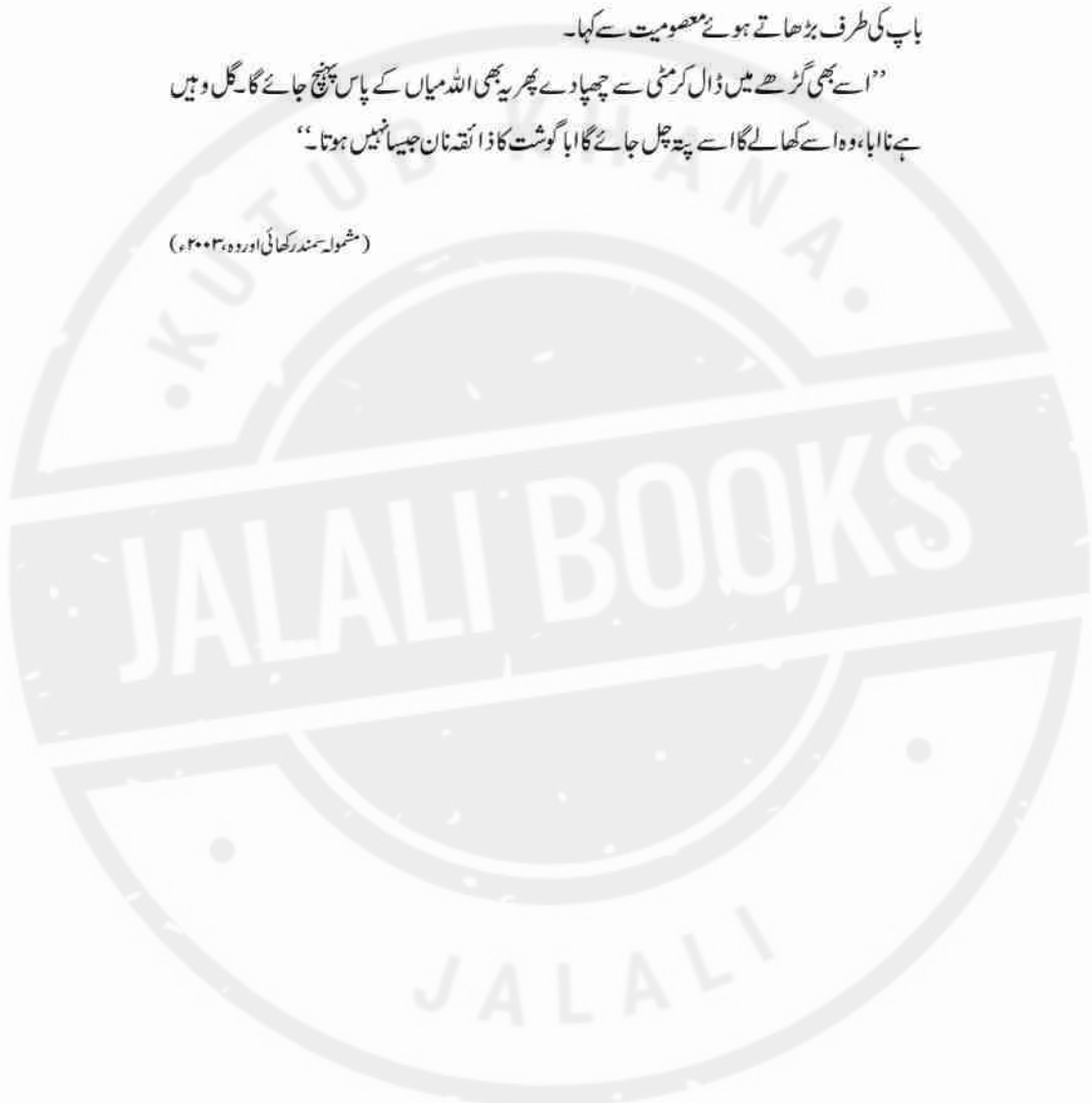
نام	محمد اسلم خان
قلمی نام	اسلم شاہد
ولدیت	فضل خان
تاریخ پیدائش	۲۶ فروری ۱۹۷۱ء
مقام پیدائش	مٹھیال ضلع کیمبل پور (اٹک)

مٹھیال ان کا آبائی قصبہ ہے جہاں ان کا جنم ہوا، انہیں پرائمری اسکول تریڑ میں داخل کروایا گیا جہاں سے انہوں نے پرائمری پاس کی ۔اس کے بعد تعلیمی سلسلہ کو آگے نہ بڑھا سکے ۔ ۱۷ جون ۱۹۹۰ء کو پاک فوج میں بھرتی ہو گئے اور اس دوران مختلف شہروں میں پڑاؤ رہا۔ ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا ۔شروع میں نوجوان شاعر اشرف خان اشرف سے مشورہ سخن فرماتے رہے پھر معروف شاعر محسن بھوپالی سے ایک عرصہ تک رہنمائی لی ۔جب ان کا تبادلہ اٹک ہوا تو نہ صرف قندیل ادب کے اجلاسوں میں شرکت فرمائی بل کہ ''سہ ماہی قندیل'' کی مجلس ادارت کے رکن بھی رہے ۔ بقول اسلم شاہد وقار احمد آس کی ملاقات نے بہتر راستے کا تعین کیا۔ شاعری کا پہلا مجموعہ ''عشق مجھ کو اداس رکھتا ہے'' انہوں ارشد نعیم شیخوپورہ کے تعاون سے شائع کیا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''دریچے سے لپٹی رات'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ شاعری کے ساتھ افسانہ بھی لکھ رہے ہیں ان کے افسانے سیپ، فکر نو، کہکشاں اور تجدید نو اور کئی دوسرے پرچوں میں چھپے ۔ ۲۰۰۸ء میں فوج کی نوکری سے ریٹائر ہوئے ۔ علاوہ ازیں چند سال قبل انہوں نے اپنے علاقہ کے ایک شاعر (مرحوم) حکیم شوق کے نام پر ادبی تنظیم ''بزم شوق'' قائم کی لیکن اس کے صرف چند اجلاس ہی منعقد کروانے میں کامیاب ہو پائے ۔آجکل اپنے گاؤں مٹھیال میں ہی مقیم ہیں۔

مطبوعات:

۱۔عشق مجھ کو اداس رکھتا ہے (۲۰۰۳ء) ۲۔دریچے سے لپٹی رات (۲۰۰۸ء) افسانوی مجموعہ (زیر ترتیب)

شناخت

اسلم شاہد

مجھے رشک آتا ہے اپنے انسان ہونے پر۔ خدا کا مجھ پر احسان عظیم ہے کہ میں انسان ہی پیدا ہوا۔
سلیم میرے بچپن کا دوست ہے، ہم ایک ساتھ روانہ ہیں، وہ خاموشی سے گاڑی چلا رہا ہے مگر میں بولے جا رہا ہوں۔

''مجھ میں ہزاروں خوبیاں رکھ دی گئی ہیں، میں فرشتوں کی صف میں سب سے آگے کھڑا ہوں کیوں کہ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں۔ انسان فرشتوں سے افضل ہے! میں ہر وہ کام کرسکتا ہوں جو فرشتے سے ممکن نہیں۔''

وہ گویا ہوا

''تمہیں خوش فہمی کا عارضہ ہو گیا ہے، فرشتے تم سے برتری لے گئے ہیں! تم پیچھے رہ گئے ہو، تمہاری انسانیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ تم نے اپنے آس پاس وحشتیں بچھا رکھی ہیں۔ تمہارے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں اور تم ان جھاڑیوں میں پھنس گئے ہو۔ وہ جھاڑیاں دھیرے دھیرے تمہاری جانب بڑھ رہی ہیں، خوف اور وحشت نفرت اور منافقت کے کانٹے تمہارے بدن تک پہنچ کے دم لیں گے۔''

میں سلیم کو ڈانٹ دیتا ہوں

''تمہاری عقل ٹھکانے نہیں ہے تم نہیں سمجھو گے، سامنے دیکھ کر دھیان سے گاڑی چلاؤ۔ آگے خطرناک موڑ ہے گاڑی نیچے اس گہری کھائی میں گر سکتی ہے، ہم دونوں مر سکتے ہیں۔''

''کس کھائی کی بات کرتے ہو۔''

سلیم موڑ کاٹتے ہوئے اپنے دائیں طرف گہری کھائی کا جائزہ لیتا ہے۔

''یہ کھائی چند فرلانگ نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔مگر تم اور تمہاری انسانیت جس گہری کھائی میں گرتے جا رہے ہیں اس کا سرا شاہد زمین کی آخری تہہ سے بھی بہت آگے ہے۔''

سلیم ایک بار پھر گاڑی سے دائیں طرف نیچے کو دیکھتا ہے۔

میرا پورا وجود کانپ جاتا ہے۔کیوں کہ میں انسان ہوں، موت سے ڈرنا میری فطرت ہے باوجود اس کے کہ مجھے مرنا ہے۔

سلیم مجھ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔میں پھر اس سے گویا ہوتا ہوں۔

''مجھے فرشتوں سے افضل اس لیے نہیں بنایا گیا کہ مجھ میں علمی بصیرت ان سے زیادہ ہے بل کہ مجھے اس لیے فرشتوں پر فضیلت عطا ہوئی کہ میں اپنا علم دوسروں میں منتقل کرنے کا فن جانتا ہوں۔فرشتے اپنا علم بانٹتے نہیں ہیں۔اس لیے میں کہتا ہوں جو کام فرشتے نہیں کر سکتے وہ کام مجھ سے سرانجام پاتے ہیں۔میں غم بانٹتا ہوں، دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام آنا جانتا ہوں۔خشبوئیں بکھیرتا ہوں، مشقت کرتا ہوں، پہاڑوں کے سینے سے دودھ کی نہریں نکال لیتا ہوں، کارخانوں کی آگ میں رہ کر اپنا رزق ڈھونڈتا ہوں۔فرشتے ایسے کر سکتے ہیں کیا۔؟

میں سلیم سے اپنی بات کی تائید چاہتا ہوں۔مگر وہ میری طرف دیکھ کر سر کو نفی میں ہلا دیتا ہے۔

''تمہیں داخلی خوش فہمی کا عارضہ ہو چکا ہے۔تم خود کو خود ہی سمجھنے لگے ہو، خود ہی تمہاری خوبیاں ایک دن تمہیں مار ڈالیں گی۔تم گاڑی بنانا جانتے ہو مگر اسی گاڑی میں بیٹھ کر تمہاری موت تمہارا پیچھا کرتی ہے اور ایک دن تم تک پہنچ جاتی ہے۔تم بارود بناتے ہو پر تمہارے بچے اسی بارود کے پھٹنے سے ہوا میں اُڑ کے ریزہ ریزہ بکھرنے لگتے ہیں۔ایک دن خود بھی تم اس بارود کے ڈھیر پر ڈھیر ہو جاؤ گے۔

''تم مجھے ڈراتے ہو نا کہ میں اپنی حقیقت بیانی کا گلہ گھونٹ دوں۔''

میں سلیم کو اب آنکھیں دیکھاتا ہوں۔

تم میرے دوست نہیں، میں آئندہ تمہارے ساتھ کبھی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دوستی پر جو ایک پورے انسان کی بامقصد گفت گو کو نظر انداز کر دے۔''

سلیم جواباً مسکراتے ہوئے ایک ٹریلر کو اوور ٹیک کرتا ہے۔

''ہاں میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔میں تمہاری فضول گفت گو کو نظر انداز کرتا ہوں۔۔تمہیں

ڈراتا ہوں۔۔تم میرے ساتھ آئندہ کبھی نہیں بیٹھو گے۔تمہارے سوچنے کا ڈھنگ اور ہے، میرے سوچنے کا سلیقہ الگ۔تم صرف اپنی بات کرتے ہو، میں ہر اس انسان کی بات کرتا ہوں جو ابھی اس رتبے تک پہنچا ہی نہیں۔''

سلیم چپ، میں خاموش۔۔گاڑی آگے دوڑتی رہی۔۔درخت سر زمین پیچھے کو۔۔۔ہم پہاڑوں کی بلند و بالا قدامت کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

اب تو شور شرابے۔دھواں۔۔ٹریفک۔۔لوگوں کی بہتات۔۔سلیم نے اچانک ایک ہجوم کے قریب جا کر گاڑی روک دی۔۔اور خود ہجوم کی طرف چل پڑا۔میں غصے سے باہر نکلا اور اس کے پیچھے چل دیا۔وہ ہجوم میں غائب ہو گیا۔۔میں آگے بڑھا کسی نے مجھے پیچھے سے کھینچ لیا۔۔حضرت انسان آگے سانپ ہے۔

سانپ۔۔۔؟ جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو۔

''کیوں صاحب! سانپ کو مارنے کے لیے فرشتے تو نہیں آئیں گے؟''سلیم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ انسان ہیں تو یہ کام بھی انسان ہی کے ہاتھوں انجام پائے گا۔۔ہمت کیجئے۔''

''مم۔۔میں۔۔میں سانپ کو کیسے ماروں۔۔میرے پاس تو لاٹھی بھی نہیں۔''

''تو کیا لاٹھی فرشتوں کے پاس ہوتی ہے؟''سلیم نے پھر طنز کیا۔

''مجھے تمہاری بکواس نہیں سننی۔''میں غصے سے چیخ اٹھا۔

سلیم نے چہرہ لوگوں کے ہجوم کی طرف پھیر لیا۔

''کیا ہوا ہے، یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟''ایک موٹر سائیکل سوار نے ہجوم کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سانپ ہے، کالا ناگ۔۔لمبا۔۔موٹا۔۔زہریلا۔۔اس چادر کے اندر خوف سے سہا ہوا ہے۔''

''سانپ چادر میں آیا کیسے؟''اس اجنبی نے سوال کیا۔

''اس گندے نالے سے باہر نکلا، ایک راہگیر کے پیچھے بھاگا۔اس نے خوف سے اپنی چادر اوپر پھینک دی۔اس وقت سے اب تک ایک گھنٹہ ہونے کو ہے، کسی کی ہمت نہیں کہ چادر میں سے سانپ کو

نکال کرختم کردے۔'' ہجوم میں کھڑے ایک شخص نے تفصیل بتائی۔

''تم لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہو۔ حیرت ہے تمہاری مردانگی پر''

وہ اجنبی غصے میں آگے بڑھا اور جھکتے ہوئے چادر کو ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ اچانک سانپ نے اس کے سینے پر اپنا ڈنگ مار دیا۔ لوگ خوف سے ادھر اُدھر کھسک گئے اور وہ اجنبی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سانپ تھا یا کوئی چھلاوا، اچانک غائب ہو گیا۔

میں خوف سے بھاگ کر گاڑی کے قریب آ گیا مگر میں نے دیکھا کہ سلیم اس اجنبی کی کلائی اپنے ہاتھ میں لیے سانسوں کی موجودگی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں ان دونوں کی جانب پلٹا، باقی لوگ جو ادھر اُدھر ہو گئے تھے وہ بھی دوبارہ جمع ہونے لگے۔

''مر گیا ہے بیچارہ'' سلیم نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

سلیم نے اس کی قمیض کی تلاشی لی شاید اس کی شناخت ہو سکے، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

''بھائی اس کے موٹر سائیکل کے ساتھ ایک جھولا لٹک رہا ہے شاید اس میں کچھ ہو۔'' ہجوم میں سے کسی شخص نے مشورہ دیا تو میں بھاگ کر اس تھیلے تک پہنچا۔

جونہی اس تھیلے میں، میں نے ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو ہجوم میں سے اکثر کی چیخیں نکل گئیں۔ خون میں لتھڑے مومی لفافہ میں نو بیاہتا دلہن کا بازو تھا۔ انگلیاں اور کلائی زیورات سے بھری تھی، ہتھیلی پر مہندی کے تازہ رنگ کو خون کی رنگت نے چھپا رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے سارے مجمہ پر سکتہ طاری ہو گیا، سلیم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھے، تم اور تمہاری انسانیت جس گہری کھائی میں گرتے جا رہے ہیں اس کا سرا شاید زمین کی آخری تہہ سے بھی بہت آگے ہے۔۔۔۔ مجمے کا سکوت ٹوٹا تو کسی شخص کی آواز بلند ہوئی، کیا اس آدمی کی شناخت ہو گئی ہے۔! اس آدمی کی شناخت تو شاید اس لمحہ ممکن نہ تھی لیکن میری بامعنی گفت گو کی شناخت ہو چکی تھی۔!

نام	غلام رسول
قلمی نام	خاور چودھری
پیدائش	۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء
جائے پیدائش	حضرو (اٹک)
تعلیم	ایم فل (پی ایچ ڈی ۔۔اردو)

شاعر، افسانہ نگار، صحافی اور کالمسٹ خاور چودھری کا آبائی وطن بشام (کے پی کے) ہے، جہاں سے ان کا خاندان ضلع اٹک کی سب تحصیل حضرو میں آباد ہوا اور یہیں ان کی ولادت ہوئی۔

۲۰۰۳ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۲۰۰۷ء میں ایف اے ۲۰۱۰ء میں انہوں نے گریجویشن کی۔ ۲۰۱۲ء میں اردو میں ماسٹر کیا۔

۲۰۱۴ء میں انہوں نے ''اردو دوہے کا ارتقائی سفر'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر نادرن یونی ورسٹی نوشہرہ سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی نیز اسی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ انہوں کم عمری میں لکھنا شروع کیا اور میٹرک سے قبل ہی ان کا نعتیہ کلام ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے شائع ہوا ۔ بعد ازاں ڈاکٹر مبارک بقاپوری سے راہنمائی لی۔ نظم و نثر کے ساتھ انہوں نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز ایک ہفت روزہ اخبار ''راولپنڈی ویوز'' سے کیا، اس ہفت روزہ کے بیورو چیف ہونے کے ساتھ ''کھاریاں ٹائمز'' اور ''قلم قافلہ'' کے بیورو چیف رہے۔ کچھ عرصہ ''ایشین نیوز نیٹ ورک'' اسلام آباد نیوز ایجنسی سے وابستہ رہے۔

۱۹۹۸ء میں حضرو سے ایک ہفت روزہ اخبار ''حضرو'' جاری کیا، ۲۰۰۰ء ایک ہفت روزہ ''تیسرا رخ'' شائع کیا جس میں علاقہ کی خبروں کے ساتھ قد آور علمی و ادبی شخصیات کے انٹرویوز اور نظم و نثر شائع کی جاتیں رہیں۔ اس ہفت روزہ کو بعد میں ''روز نامہ'' اور پھر ''ہفت روزہ'' کی صورت میں شائع کیا جاتا رہا۔ ۲۰۰۵ء میں حضرو ہی سے ایک ادبی جریدہ '' سحر تاب'' اور راولپنڈی سے روز نامہ ''تعلم'' بھی جاری

کیا۔انہوں نے ملک کے سبھی مقبول اخبارات میں سے باقاعدگی سے کالم لکھے بل خصوص روزنامہ ''اسلام'' میں ان کے کالم تواتر سے شائع ہوتے رہے۔گزشتہ چند برس سے درس وتدریس سے وابسطہ ہیں ابتداً حضرو کے ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھایا،۲۰۱۳ء میں بہ طور اردو استاد گورنمنٹ کالج حضرو میں اعزازی طور پر پڑھایا۔اس کے ساتھ ہی وہ پنجاب کالج اٹک میں بھی کلاسز لیتے رہے۔بعدازاں چند ماہ اسوہ کالج راولپنڈی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔۲۰۱۴ء سے دانش سکول چشتیاں میں درس و تدریس سے جڑے ہیں۔ان کے افسانے انڈو پاک کے جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ایک افسانوی مجموعہ ''چیخوں میں دبی آواز'' منظر عام پر آچکا ہے۔دوسراافسانوی مجموعہ'' چاند کی کاشیں'' منظرِ عام پر آنے کو ہے۔

مطبوعات:

۱۔خواب کرچیاں اور مسافر (کالم) ۲۰۰۱ء ۲۔ٹھنڈا سورج (ہائیکو) ۲۰۰۶ء
۳۔چیخوں میں دبی آواز (افسانے) ۲۰۰۷ء ۴۔چراغ بکف (کالم) ۲۰۰۸ء
۵۔مئے خاور (مجموعہ شعر) ۲۰۱۶ء ۶۔اردو دوہے کا ارتقائی سفر (تحقیق) ۲۰۱۶ء

غیر مطبوعہ

۱۔ پریم جل (دوہے) ۲۔ زنگ آلود خواہشیں (ناولٹ)
۳۔ نہ جنوں رہا (غزلیات) ۴۔ امید (واکا)
۵۔ گفتگوئے یار (ادبی شخصیات کے انٹرویوز) ۶۔چاند کی کاشیں (افسانے)

ماخذ

ارشد سیماب ملک، تذکرہ شعرائے اٹک ۲۰۱۲ء
سید نصرت بخاری، شخصیاتِ اٹک، ۲۰۱۷ء
سید نصرت بخاری، حدیثِ دیگراں، ۲۰۰۸ء

بوڑھا درخت

خاور چودھری

ان گنت سالوں سے اپنی بانہیں پسارے، سر نیہوڑے وہ زمین میں گڑھا ہوا تھا، زمانوں کی گریز پا گھڑیوں اور لمحوں نے اس کے وجود پر دراہٹوں کی داستان رقم کر دی تھی۔ ہر نئی ساعت میں اس کے وجود پر ایک لکیر کا اضافہ ہو جاتا اور یہ لکیر کچھ توقف کے بعد گہری شکن میں بدل جاتی۔ پھر یہ شکنیں اس کے وجود کا حصہ بن جاتیں، اس کی شخصیت کی پہچان ہونے لگتی۔ دیکھنے والوں نے خیال کیا کہ شاید اس کی جلد ازل سے ہی ایسی ہے، لکیروں کا لباس اس نے پہلے دن سے پہنا ہوا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں تھا۔ اس کا وجود کبھی بہت نازک، بہت دلکش، بہت خوب صورت تھا اور آج۔۔۔۔۔ آج صدیوں کی تھکاوٹ پہنے وہ زمین میں گویا گڑتا جا رہا تھا، اس کی بانہیں سکڑتی جا رہی تھیں، اس کی خشبو گھٹتی جا رہی تھی اس کی ٹھنڈ مٹتی جا رہی تھی، موسموں کے تغیرات اور لوگوں کی بے اعتنائیوں نے اس سے اس اعتبار، اس کا حسن، اس کا دبدبہ، اس کا قد اور خوشبو تک چھین لیے تھے اور اب وہ گئی رتوں کی راکھ میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے کچھ تھک سا گیا تھا بلکہ اکتاہٹ کے نشانات اس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ کسی اور زمین میں نمو پانے کی خواہش رکھتا تھا، بے رخی اور ستم شعاری پر مائل لوگوں کے پاس اس کے دکھ کو سمجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی انا کا اسیر ہو کر اپنی زندگی میں مگن تھا، وہ بھی جن کی موم سی نازک جلد کو اس نے اپنے میٹھے فرحت بخش سایوں میں پروان چڑھایا تھا اور وہ بھی جو عمر کا ایک طویل حصہ اس کی چھاؤں میں گزار کر زندگی کی بوقلمونیوں سے آشنا ہوئے تھے۔

بیزاری اور بے دلی کے اس عالم میں تو اس پر اس کے سائے بھی گھٹ رہے تھے، یوں وہ اپنی ذات کا اعتبار بھی ختم کر چکا تھا۔ کتنے ہی لوگ اس کے ٹھنڈے سائے میں بیٹھ کر خوشیاں سمیٹ گئے اور کتنوں نے جھلساتی دھوپ سے گھبرا کر اس کی میٹھی ٹھنڈی چھاؤں میں سکھ کا سانس لیا اس کا اندازہ ممکن ہی نہیں۔ اس نے کبھی بھی کسی آنے والے کو اپنے سے دور نہیں رکھا، جو بھی آیا اسے کھلے دل سے اپنی بانہوں میں سمیٹ

کر سینے سے چمٹالیا۔مگر وقت نے دیکھا انہی لوگوں نے اس پر پہلا وار کیا جن کو زمانہ کے گرم سرد سے اس نے محفوظ کیا، اتنا محفوظ کہ موسموں کی شدت ان پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہوگئی۔طوفان بادو باراں کی سختی بجائے خود ان کے لیے لطف کا باعث ہوگئی۔۔۔۔اور خدایا! آج تیشہ انہیں ہاتھوں میں ہے جنہیں پکڑ کر اس نے چلنا سکھایا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اب اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہے،جلد یا بدیر کسی ستم ایجاد کے ہاتھوں اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا یا پھر نئی ہوائیں اس کے وجود خستہ کو خس وخاشاک کی مانند اڑا لے جائیں گی اور یہ نشان چھوڑ کر بھی بے نشان کہلائے گا مگر پھر بھی۔پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ ایک بار سہی ایک لمحہ وہ چلے آئیں جن کی ہریالی میں اس کا کون بہتا تھا۔وہ جنہیں کسی اور ہوا نے آ لیا تھا،بوڑھے درخت کی زبان کہاں سمجھنے والے تھے،انہیں تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ان کی اصل یہی تو ہے جو پکار رہا ہے اور وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کے تناور وجود پر بھی ایک دن کھردرے ملبوس نے اترنا ہے۔ان کے مظبوط بازؤں نے سکڑ کر کمزور ہو جانا ہے،تنی ہوئی گردن نے ڈھلک جانا ہے اور کھلے سینہ نے اپنے آپ میں سمٹ جانا ہے،اور شاید وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھے تھے کہ ان کے چھوڑے ہوئے نشانات وجود میں ہو کر بھی معدوم ہو جائیں گے بالکل اسی طرح جیسے ان کی موجودگی میں بوڑھا درخت بے نشان تھا۔دور شیشم کے گھنے درختوں میں فاختاؤں کی صدائیں بیدار ہوئیں اور ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے آگے نکل گئیں،کبھی کبھی اس گونج میں لٹورے کی آواز بھی مدغم ہونے لگتی۔ان دہری آوازوں کی آمیزش نے احمد علی کا ماضی میں دھکیل دیا تھا۔ایک ایک منظر اس کے دماغ پر رقص کرتا پھرا،اور پھر خود میں محو ہو کر آنسوؤں کی صورت اس کی پتیوں تک نکل جاتا۔اس لمحے وہ بائیں ہونٹ کے کونے کو اپنے بوڑھے دانتوں میں داب لیتا اور ایک کوشش سے اشکوں کو پینے کی دھن میں نکل جاتا مگر پھر بھی چہرے ثبت دو غاروں کے کونے بھیگ جاتے اور وہ اپنی میلی آستین سے غاروں کے دھانوں کو رگڑ کر الجھ بیٹھتا۔مسلسل رگڑنے کے باعث غاروں کے گرد اگرد سرخیوں کے پہاڑ اٹھتے جا رہے تھے۔اس نے سوچا کہ اکہتر سال کے طویل عرصہ میں ایک بار بھی اس نے کانٹوں کی فصل نہیں بوئی تھی پھر اس کے تمام کھیتوں میں ہمیشہ کانٹے کیوں اگتے چلے آئے تھے،کبھی اس نے میلا منظر نہیں دیکھا تھا پھر اس کی آنکھیں پھوڑے کیوں بن گئیں تھیں،کبھی اس نے غیر لمس کو محسوس نہیں کیا پھر اس کی بانہیں شل کیوں ہوگئی تھی۔وہ سوچتا گیا اور روتا گیا مگر کہیں اسے یہ سراغ نہ مل سکا کہ وہ کن بے ضابطگیوں کا صلہ پا رہا ہے۔کس تخم کی فصل کاٹ رہا ہے۔اسے یاد آیا کہ

شاہجہان پور سے چلنے والا قافلہ آٹھ افراد پر مشتمل تھا جو منٹگمری تک پہنچتے پہنچتے سکڑ گیا تھا۔ اب ایک وہ اور اس کی بیوہ پھوپھو تھیں، جنہوں نے زندگی کو نئے سرے سے آغاز کیا۔ بارہ کا سن ہوتا ہی کیا ہے، اس عمر میں تو آدمی کو اپنی شناخت تک نہیں ہوتی زمانوں کی خبر داری کیوں ممکن ہے اسی سن میں احمد علی نے ایک تھڑا ہوٹل پر کام شروع کیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے جو ضروری تھا وہ اسے وہاں سے مل جاتا۔ اس کی شرافت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا تھا کہ چار سال بعد ہوٹل کے مالک نے اسے اپنی فرزندی مئیں لے لیا۔ جوں جوں وقت کینچلی بدلتا گیا احمد علی کے چہرے پر شکنیں بڑھتی گئیں۔ یہ شکنیں اس کے اپنے لیے نہیں تھیں بل کہ ان تینوں کے لیے تھیں جو اس کی تقسیم تھے۔ تینوں کو اس نے بڑی چاہ سے شہر مہنگے ترین پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں پڑھایا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے گوروں کے دیس بھیجا۔ دو وہاں ٹھہر گئے اور ایک پلٹ آیا اس کے لیے نہیں کہ اسے احمد علی کی فکر تھی بل کہ اس لیے کہ وہ جس سے وابستہ ہو گیا تھا وہ وہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ امجد علی سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر مقرر ہو گیا تھا۔ انگریزی ڈگری کے باعث اسے جلد مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، جب اس کا تبادلہ نسبتاً پسماندہ قصبہ میں ہوا تو اس کی چاندی ہو گئی۔ دھن اس پر یوں برسنے لگا جیسے ساون کا بادل۔ چند سالوں میں اس نے شہر میں سب سے بڑا بنگلہ اور تمام سہولیات سے آراستہ پہلا ہسپتال تعمیر کیا۔ سرکاری ہسپتال میں تعیناتی کے دوران اس نے خوب اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ جائز ناجائز مقدمات میں الجھا کر علاقے کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ تعلقات بنائے ان سے مال بٹورا اور پھر خود کو ان جیسا بنانے کے ان کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اب اس کے پاس کالے شیشوں والی انٹر کولر اور درجن بھر اعلیٰ نسل کے کتے اور مسلح محافظ ہر وقت موجود رہنے لگے تھے۔ اکلاپے کا مارا احمد علی جو کبھی اس جانب نکل آتا تو امجد علی کا توہین آمیز رویہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا، ناچار وہ اپنے گھر لوٹ جاتا جو اس نے حلال کا ایک ایک روپیہ جمع کر کے بنایا تھا ایک صبح لوگوں نے دیکھا کہ نامور سرجن ڈاکٹر کا باپ اپنی چارپائی کے نیچے تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکا تھا اور جب اس کے بیٹے کو اطلاع دی گئی تو وہ سینکڑوں میل دور اپنے جاگیردار دوستوں کے پاس بیٹھ کر کتوں کی عادات پر گفتگو کر رہا تھا، مگر کتے کی وفاداری کا وصف اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ کئی بوڑھے درخت آج بھی اپنی بانہیں پھیلائے محبتیں بانٹنے کے لیے مضطرب کھڑے ہیں مگر ان کی چھاؤں میں پلنے والوں کو اپنے غرور سے نجات نہیں۔

(سہ ماہی تجدید نو لاہور، شمارہ ۲، اپریل ۲۰۰۷)

نام	جمیل حیات
ولدیت	نور محمد بھٹی
پیدائش	۲ مئی ۱۹۷۷ء
جائے پیدائش	اکھوڑی
تعلیم	پی ایچ ڈی (اردو)

جمیل حیات نے ابتدائی تعلیم اکھوڑی سے حاصل کی میٹرک ہائی اسکول جبی کسراں سے ۱۹۹۳ء میں کیا۔ایف اے ۱۹۹۶ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اٹک سے کی۔ بی اے یہیں سے ۱۹۹۸ء میں کیا۔ایم اے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے انگلش کا امتحان دیا جس میں ایک پیپر کی SUPPLY رہی۔ایم اے اردو پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ۲۰۰۵ء میں کیا۔ایم فل اردو سلطان محمود بسمل کی شخصیت وفن پر مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے ۲۰۱۱ء میں کیا۔ پی ایچ ڈی علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ۲۰۱۵ء میں کی ''غالب شناسی کی روایت میں سید معین الرحمٰن کا مقام ومرتبہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ملازمت کا آغاز بہ طور پرائمری ٹیچر ۲۰۰۳ء میں پرائمری اسکول ڈھوک فتح سے کیا۔ ۲۰۰۹ء تک اسی اسکول میں رہے۔ ۲۰۰۹ء میں اردو لیکچرر کے لیے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج باہتر میں تعینات ہوئے اور ابھی تک اسی کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا افسانہ نگاری کی ابتدا انہوں نے ۲۰۱۳ء میں کی ۔پینتالیس سے زائد افسانے انڈو پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شایع ہو چکے ہیں۔افسانہ نگاری اور شاعری پر طبع آزمائی کے ساتھ تحقیق وتنقید پر بھی توجہ ہے اور کئی مضامین شایع ہو چکے ہیں۔

زیر ترتیب:

۱۔زہر میں بجھا ہوا لفظ (افسانے) ۲۔دعا (افسانے) ۳۔مجذوب (افسانے)

زہر میں بُجھا ہوا لفظ

جمیل حیات

یہ الفاظ بھی کئی جہتیں، کئی قسمیں اور بہت سے معانی رکھتے ہیں لیکن شاید اہمیت الفاظ کو نہیں، لہجے کو دی جاتی ہے۔ بہر حال کچھ لفظ ایسے ہوتے ہیں جو سنے جائیں تو زندگی میں رنگ بھر جاتے ہیں۔ زندہ رہنے کو، سانس لینے کو دل کرتا ہے ایسے الفاظ سن کر۔ اور کچھ لفظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جب زبان سے ادا ہوتے ہیں تو سانسیں رُک جایا کرتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہوتی ہے جن کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا تھا جب وقت کے بہتے دھارے میں اس کی زبان سے بھی زہر میں بجھا ہوا ایک لفظ، صرف ایک لفظ جانے کیسے پھسل گیا تھا۔ اور اس کی سزا اس نے برسوں پر محیط وقت کی ان گنت گھڑیوں کے بے فیض ہونے کی صورت میں کاٹی تھی۔ اس ایک لفظ کی ادائیگی سے پہلے فضل خان واقعی خوش قسمت انسان تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، اگرچہ پڑھ لکھ نہ سکا لیکن اس کمی نے اس کی زندگی میں کوئی منفی رنگ نہ بھرا اس لیے کہ اس کے والد گاؤں کے متموّل لوگوں میں شامل تھے۔ فضل خان اس لیے بھی ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا کہ وہ ماں باپ کے ہر فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔

جب اس کے ماں باپ نے اپنی مرضی سے اُس کے لیے لڑکی تلاش کی تو اس نے ہمیشہ کی طرح سر جھکا دیا۔ اُس کی جنت جس کے پاؤں کے نیچے تھی اُس نے اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنے لاڈلے بیٹے کے لئے چاند ڈھونڈا لیکن وہ چاند اس کی جنت کی باقی زندگی کو دوزخ بنا گیا۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ حسن ہی اس چاند کی واحد خوبی تھا۔ حقیقت میں وہ دن فضل کی زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ وہ انوری کی عنبریں زلفوں کے جال میں ایسا بندھا کہ گرد و پیش سے بے نیاز ہو گیا۔ قیدی کو صیاد کی قید میں وہ لطف ملا کہ آزادی کو بھول ہی گیا۔

فیضاں نے اپنی بہو کو جیسے سونے میں تول دیا تھا۔ اس نے انوری کو دو کلو سونے کے زیورات بنا کر

دیے تھے۔ جوں جوں وقت گزرا؛ انوری کی خوبیاں اجاگر ہونا شروع ہوئیں۔ جب پہلی بار اس نے صبح پراٹھا بنا کر فضل کو چائے کے ساتھ ناشتا کے لئے نوش کرنے کو دیا تو اس نے سعادت مند شوہر کی طرح کھا تو لیا لیکن جس دل کے ساتھ کھایا یہ وہی جانتا تھا۔ آہستہ آہستہ انوری نے فیضاں کو کمرے تک محدود کر دیا اور گھر کے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب پاکستان بنے تین سال کا عرصہ گزر را تھا۔ صبح فضل جاگا تو محلے میں شور مچا ہوا تھا۔ وہ سن گن لینے گلی میں نکلا تھوڑی دیر بعد گھر آیا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بہت مشکل سے اس نے بتایا کہ وڈی بی بی کے گھر کسی نے سینندھ لگائی ہے۔ سب حیرت زدہ رہ گئے۔ وڈی بی بی گاؤں کے چودھری اللہ دتہ کی بہن تھی۔ اس کا شوہر مر گیا تھا۔ دو بیٹیاں تھیں۔ فضل نے بتایا کہ چوروں نے اسی کمرے میں سینندھ لگائی جس کمرے میں سونا چاندی رکھا تھا دونوں بکسوں کے تالے ٹُوٹے ہوئے تھے اور خالی بکسے وڈی بی بی کا منہ چڑھا رہے تھے۔ فضل نے بتایا کہ چودھری نے اپنے کامے اس کام پر لگا دیے ہیں کہ وہ چور کا پتا چلائیں۔ بابے دِینے کو بھی اس نے بلا لیا ہے کہ کھرا نکالے۔ اگر ناکامی ہوئی تو پھر چودھری پولیس کو بلا لے گا۔ انوری کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پولیس کا مطلب تھا کہ گھر گھر تلاشی ہوگی۔ انوری کو اپنے زیور کی فکر کھانے لگی۔ سورج نے ابھی جی بھر کے آنکھ بھی نہ کھولی تھی کہ انوری نے چاردیواری نئے سرے سے بنوانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر اسی روز عمل درآمد بھی شروع کرا دیا۔

جب چاردیواری کی تعمیر جاری تھی تو اس نے ایک رات جب کے ساری مخلوق سو رہی تھی اور رات بھی اپنا وقت پورا کرنے کے قریب تھی؛ زیورات سے بھرا صندوق چاردیواری کی بنیادوں میں دفنا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بھول گئی تھی کہ آدھی رات کو اُلوؤں کے علاوہ بھی کچھ مخلوق جاگتی ہے۔ سو وہ بھی اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کا ہمسایہ قاضی مرید جو کہ نہ تو تہجد کی نماز چھوڑتا تھا اور نہ ہی کسی کی بہو بیٹی۔ اس وقت بھی تہجد کی نماز کے لیے ہی اٹھا تھا لیکن ندیدے پن سے انوری کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار انوری رات کے کسی پہر رفع حاجت کے لیے اٹھا کرتی تھی اور اس مقصد کے لیے لیٹرین میں جانے کا تکلف نہیں کرتی تھی۔ پابندِ صلوٰۃ درندہ چاندنی راتوں کا بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا اور آج بھی چاند کی چودھویں رات تھی۔ اگرچہ جس مقصد کے لیے وہ اپنی نیند کی قربانی دے رہا تھا اس کے پورا ہونے کا تو کوئی امکان نہیں

تھا کہ انوری فضل کے علاوہ کسی اور طرف دیکھتی نہیں تھی لیکن قاضی مرید کو اس کی اوقات سے زیادہ ملنے والا تھا اس لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کہیں اس کے منہ سے مسرت بھری چیخ ہی نہ نکل جائے۔

انوری پھوہڑ تھی تو فضل سعادت مند۔اس لیے انوری نے آہستہ آہستہ پر پُرزے نکالنے شروع کیے۔وہ حسین تو تھی، بدزبان بھی تھی۔اپنی اسی خوبی کی وجہ سے اس نے فضل کے رشتہ داروں کو ایک ایک کر کے دور کرنا شروع کر دیا۔اسی اثناء میں فضل کے باپ کا اچانک ہیضہ کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔وہ رات کو تربوز کھا کے اوپر سے قہوہ پی بیٹھا تھا۔خیر یہ تو ایک بہانہ تھا ورنہ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔اس کا مرنا تھا کہ انوری کو جیسے پورے گھر میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہو گئی۔

یہی وہ دن تھے جب صحیح معنوں میں فیضاں پر ویرانی نے سائے ڈالنے شروع کیے۔سر کا سائیں رخصت ہو جائے تو اپنی اولاد بھی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے یہی کچھ فیضاں کے ساتھ ہوا۔فضل تو کھیتوں میں کام کرنے کے لیے صبح سویرے گھر سے نکل جاتا۔شوہر کی ابدی جدائی کے دکھ میں ڈوبی اپنی گم گشتہ سلطنت کا نوحہ کرنے والی فیضاں، انوری کے ظلم و ستم سہنے کو اکیلی رہ جاتی۔بچوں سے انوری کو چڑ تھی۔اس لیے جب دو بار ایسا موقع آیا کہ قدرت اسے اپنی نعمت یا رحمت سے نوازتی؛ اس نے کفرانِ نعمت کیا۔

شادی کو دس سال بیت گئے۔گود ہری نہ ہوئی۔ہوتی بھی کیسے؟ جب زمین زرخیز ہونے کے باوجود خود ہی بنجر ہو جانے کا فیصلہ کر لے اور قصہ گو کہتا ہے کہ جب ایسا ہوتا ہے تو پھر وہ زمین روندی جاتی ہے، مردود ہو جاتی ہے؛ اس پر خالق کا قہر نازل ہوتا ہے اور قہر بری بلا ہے؛ دوزخ ہے۔اس لیے جب زمین بنجر ہونے کا فیصلہ کرتی ہے تو پھر کسان جتنا مرضی ہل چلاتا رہے، کھیتی نہیں اُگا کرتی۔فضل بھی اپنی قسمت پر شاکر ہو گیا۔اگرچہ کچھ عرصہ پہلے فیضاں نے فضل کی دوسری شادی کی بات کی تھی لیکن انوری نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ الاماں؛ فیضاں نے بھی کانوں کو ہاتھ لگائے کہ کس بلا کی دم پہ پاؤں رکھ دیا۔جب خاموشی ہوئی تب انوری نے سکھ کا سانس لیا اور اُس کے بعد اس نے فیضاں کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔

وقت گزرتا گیا۔فیضاں چارپائی پر پڑی تو انوری نے ظلم کی انتہا کر دی۔وہ چاہتی تھی کہ بڑھیا مرے تو اس کی جان چھوٹے۔فضل بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ وہ ٹس سے مَس نہ ہوتا حالانکہ فیضاں، انوری کی عدم موجودگی میں اپنا رونا روتی تو فضل اس کی دلجوئی بھی کرتا اور کبھی کبھار اسے سمجھاتا کہ اب وہ چپ رہا کرے۔انوری اس کی موجودگی میں اس کی ماں کو برا بھلا کہتی لیکن وہ چپ رہتا۔

عجب بے چین کر دینے والے دن تھے وہ۔ عجیب بے فیض سے دن؛ اور ایک ایسے ہی بے فیض دن فضل جب گھر میں داخل ہوا تو ساس اور بہو کی روایتی لفظی جنگ عروج پر تھی۔

فضل نے ماں کی آہ وزاری اور بیوی کی سینہ زوری پر دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے کمرے میں جانے لگا تو انوری نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ انوری کہہ رہی تھی: ''اپنی ماں کو سمجھاؤ، ورنہ اب میں اسے ماروں گی۔'' انوری کے لہجے میں زمانے بھر کی وحشت جمع ہوگئی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جو کاتب تقدیر نے اس مظلوم شخص کے نصیب میں لکھ دیا تھا جو سعادت مند تھا۔ وہ جو بیوی اور ماں دونوں کے سامنے سر نہیں جھکاتا تھا جانے کیسے وقت کی بے رحم ساعت کا شکار ہوا اور خود پر جبر کرتے ہوئے اپنی جنت پر دوزخ کا خوفناک دہانہ کھول دیا۔ ''مارو'' بس ایک لفظ کہا فضل نے اور گھر سے باہر نکل گیا۔ ہاں جب کوئی اپنا، بہت قریبی جب نگاہیں پھیر لیتا ہے تو وہی مقام ہوتا ہے جب بندہ دوزخ میں ہوتا ہے۔

فضل کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی جان سے پیاری ماں کے لیے زہر میں بجھا ہوا وہ ایک لفظ زبان سے ادا کر آیا ہے جو اس کی سانسوں کی ڈور کو لیر و لیر کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ فیضاں نے واقعی دیر نہیں لگائی لیکن اجل کو لبیک کہنے سے پہلے اس نے انوری کے خلاف بڑی عدالت میں درخواست ضرور پیش کر دی تھی۔ اسی دن فیضاں چپکے سے مرگئی۔

چہلم کے بعد جانے انوری کے ذہن میں کیا بات آئی کہ اس نے فضل سے کہا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی کیونکہ اسے خوف آتا ہے۔ قاضی مرید نے جو کہ اس کا ہمسایہ بھی تھا اور تہجد گزار بھی۔ اس نے حویلی خریدنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا کہ وہ بھید کا جاننے والا تھا۔

یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ انوری کو کسی کام کے سلسلے میں اپنے پرانے محلے کی طرف جانا پڑ گیا۔ اس کے قدم خود بخود اپنے پرانے گھر کی طرف چل اٹھے۔ اس نے دیکھا کہ قاضی مرید باہر بیٹھا ہوا تھا اور چار دیواری نئے سرے سے بنوائی جا رہی تھی۔ اس نے قاضی مرید کی عقل پہ ماتم کیا کہ جس نے اتنی مضبوط دیوار گرا دی؛ پھر اس نے غور کیا تو اسے حیرت ہوئی کہ چار دیواری صرف ایک طرف سے گرائی گئی تھی اور اب اسے دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔

گھر واپس آ کر اس نے فضل کو یہ بات بتائی اور پھر اچانک جیسے فیوز اڑ جاتا ہے ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے انوری کے ارمانوں پر بھی جیسے کسی نے شب خون مار دیا۔ اس کی رنگت آن کی آن میں ہلدی ہو گئی۔ یہ یک پل کا ہی قصہ تھا پھر وہ اچھلی ہے تو فضل کو بھی لے بیٹھی ہے۔ وہ بے چارہ اپنی عورت کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا تجھے؟'' وہ سینہ پیٹنے لگی؛ ''ہائے! اس دیوار کے نیچے تو میں نے اپنا زیور کا بکسہ دبایا تھا۔ ہائے کلموہے نے نکال لیا ہوگا۔ ہائے میں بھی کہوں اسے حویلی خریدنے میں اتنی جلدی کیوں تھی۔'' فضل ششدر کھڑا تھا۔ پھر وہ دونوں دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ جب انوری نے قاضی مرید سے کہا کہ اس دیوار کی بنیادوں میں اس نے اپنا زیور رکھا تھا تو قاضی نے نہایت معصومیت سے لاعلمی کا اظہار کیا اور اسے کہا کہ دن میں خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ انوری نے شور مچا مچا کر سارا محلّہ اکٹھا کر لیا تھا لیکن بے سود۔ انوری کی بدزبانی سے سارا محلّہ تنگ تھا جب کہ قاضی کی پارسائی کے سب قائل تھے اگرچہ عورتیں اسے زیر لب جی بھر کر کوسنے دیتی تھیں کہ ان سب کو اس کی نظروں کی شدت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فضل نے قاضی سے صرف ایک بات کہی:

''قاضی جی! اگر آپ سچے ہیں تو آپ نے اتنی مضبوط دیوار کیوں گرائی اور وہ بھی صرف ایک طرف سے؟''

اس بات کا جواب قاضی کے پاس نہیں تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہا۔ انوری روتی رہی گڑگڑاتی رہی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بدزبانی اسے لے ڈوبی۔ ٹوٹے دل کے ساتھ وہ گھر پہنچی تو پہلی بار فضل نے اسے جی بھر کر پیٹا۔ وہ اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا جس کے کسی حکم سے اس نے سرتابی نہ کی تھی لیکن اپنی اس پھوہڑ بیوی کے کہنے پر کہے گئے اکلوتے لفظ کی تباہ کاریوں کا اجر وصول کر رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا؛ انوری ایک ایک کر کے فضل کی قیمتی زرعی اراضی بھی بکواتی رہی۔ وہ اچھے کھانے پینے کی شوقین تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے مزاروں پر جانے کا بھی شوق تھا۔ یہ شوق پہلے تو سیر سپاٹے کے حوالے سے تھا لیکن ڈھلتی عمر نے اس شوق کو مجبوری میں تبدیل کر دیا۔ اب اسے بچے کی خواہش نے ستانا شروع کر دیا۔ تنہائی کے سانپ نے اسے ڈسنا شروع کر دیا تھا۔ یونہی ایک دن بیٹھے بٹھائے اسے اس

خوف نے آگھیرا کہ کہیں وہ بڑھاپے میں اکیلی نہ رہ جائے۔ اس کی بدزبانی کی وجہ سے اپنے پرائے اس سے دور ہو چکے تھے۔ صرف فضل اس کے ساتھ تھا۔ لیکن اب جب کہ اس کی شادی کو پچیس سال ہو چکے تھے؛ اب وہ بھی اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

۱۸ سال کی عمر میں جب فضل دولہا بنا تو انوری کی عمر ۱۵ سال تھی۔ اب چالیس سال کی عمر میں انوری کو اولاد کی خواہش نے ستایا تو فضل کی ساری خواہشات دم توڑ چکی تھیں۔ اب وہ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے گھر میں سکونت پذیر تھے جہاں بیتے دنوں کو یاد کر کے فضل ہمیشہ نوحہ کناں رہتا تھا۔

وہ اپنی ماں کی زندگی کے آخری دن کو اور اپنی زبان سے نکلے اس اکلوتے لفظ کو نہیں بھولا۔ اگرچہ وہ کئی بار ماں کی قبر پر جا کر اس سے معافی مانگ چکا تھا لیکن لگتا تھا کہ اس کی زبان سے نکلے اس اکلوتے لفظ کے اثر میں کمی نہیں آئی تھی اس لیے اس کی سزا ابھی باقی تھی۔ چنانچہ جب انوری نے اسے بتایا کہ وہ اولاد کی خواہش رکھتی ہے تو فضل کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آ گئی۔ یہ مسکراہٹ دم توڑتی خواہشات کا نوحہ تھی۔ اس شب انوری نے فضل کو زندگی کی طرف لوٹانے کی پوری کوشش کی لیکن اس کی یہ ساری کوششیں فضل کے چہرے اور اس کی روح پر مزید زخم لگانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکیں۔ انوری کا رجحان مزارات کی طرف اور بڑھ گیا۔

نام نہاد پیروں اور عاملوں نے انوری کو جی بھر کر لُوٹا۔ یہ لوٹ کھسوٹ مالی بھی تھی اور جسمانی بھی لیکن وہ بدنصیب بار آور نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے؟ کھیتی جو سوکھ چکی تھی۔ جب زمین کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت کھاد اور پانی لگے تو پھل لگ جاتا ہے۔ سو جب خیال رکھے جانے کا وقت تھا اس وقت خیال نہ رکھا جا سکا اب باسی ہنڈیا کو پھونکیں مارنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ شاید اس کے مکافات کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

وقت گزرتا رہا انوری کی بدزبانی اور فضل کی عاجزی بڑھتی گئی۔ اب وہ بات بات پر گالیاں دیتی۔ نئی روشنی، انوری کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ بچے اسے دیکھ کر ''گالیاں والی اماں'' کہہ کے چھیڑتے تو وہ انہیں ناقابلِ اشاعت گالیوں سے نوازتی۔ زمینیں تو پہلے ہی بک چکی تھیں۔ جو تھوڑی بہت رہ گئی تھیں وہ بھی بک گئیں۔ آخرکار پانچ مرلے کا وہ گھر بھی بک گیا جس میں وہ رہتے تھے۔ اب وہ مانگے تانگے کے ایک گھر میں منتقل ہوئے۔ کل کا بادشاہ آج لوگوں کے دروازے پر جا کر بھیک مانگنے کے سے انداز میں

جینے کی بھونڈی نقل کرتا ہوا دیکھا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ انوری کو کئی بیماریوں نے آگھیرا۔ ہاتھوں میں رعشہ رہنے لگا۔ فضل کے ہاتھوں میں دم تھا۔ وہ تنور پر جا کر یا کبھی کبھار ہمسائے کے ہاں سے روٹی پکوالاتا۔ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی اب ایک معذور بڑھیا کے روپ میں کرائے کے گھر کے دروازے پر بیٹھی لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی رہتی۔ ہفتے میں کم از کم دو بار اس گھر سے بوڑھے میاں بیوی کے چلانے کی آوازیں آتیں۔ دونوں ایک دوسرے کو جی بھر کر گالیاں دیتے پھر بوڑھے مرد کے ہچکیاں لے کر رونے کی آواز آتی اور وہ بلبلا کر نہایت دلسوزی سے پکارتا:

''اماں او اماں! کب ختم ہوگی سزا؟''

اس آواز میں اتنا درد ہوتا کہ لوگوں کے دل لرز جاتے۔ وہ ہچکیوں میں ماں کو پکارتا رہتا روتا رہتا اور روتے روتے سو جاتا۔ انوری تو جیسے اب گندگی کا ڈھیر بن چکی تھی مہینے دو مہینوں کی بات نہیں اب تو سال ہو چکا تھا اس نے غسل بھی نہیں کیا تھا۔

اس دن بھی وہ دروازے پر بیٹھی تھی جمعے کا دن تھا۔ فضل نہا دھو کر جمعہ پڑھنے گیا ہوا تھا۔ کوئی خاتون ادھر سے گزری تو اس نے اس مفلوک الحال بڑھیا کو دیکھا۔ اسے ترس آیا وہ اس کے قریب آئی تو اس کی حالت دیکھ کر خوف سے کانپنے لگی۔ وہ وہیں سے واپس پلٹی۔ تھوڑی دیر بعد آئی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان خاتون بھی تھی۔ انوری رونے لگی اس نے فریاد کے سے انداز میں آسمان کی طرف دیکھا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے چھلکے: ''اب تو بلا لے۔''

ان عورتوں نے اس کے کپڑے اتارے۔ اسے غسل کرایا۔ وہ روتی رہی، جانے کس سے معافی مانگتی رہی۔ انہوں نے اسے نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے۔ گھر کی صفائی کی اور چلی گئیں۔

جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد حسب معمول فضل کے قدم قبرستان کی سمت اٹھ گئے۔ ماں کی قبر پر پائینتی کی طرف بیٹھ کر وہ روتا رہا، معافی مانگتا رہا اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ وہ مسکرا دیا جیسے برسوں کی کثافت پل بھر میں ڈھل گئی ہو۔ وہ حیران بھی ہوا اور خود کو کوسا بھی۔ ''حیرت ہے یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا۔'' اس کے قدم تیزی کے ساتھ تھوڑا فاصلے پر شہر خموشاں میں سکونت پذیر ایک اور رہائشی کے گھر کی طرف اٹھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسی سے ادائے دلبری سے شکوہ

کناں تھا؛

''ابا جی! ماں جی کو کہونا کہ اب مجھے معاف کردیں۔ زہر میں بجھے ایک لفظ کی بہت بڑی سزا بھگت لی میں نے۔ ابا جی! آپ کی کوئی بات ماں جی نہیں ٹالتی تھیں؛ آپ سفارش کردیں نا۔''

وہ شکوہ کرتے کرتے اپنے بابا سے باتیں کرتے کرتے وہیں قبر کی پائینتی سو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کی پیاری ماں جو اس کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی اس کے بابا کے ساتھ کھڑی ہے اور اس کا ماتھا چوم رہی ہے۔ ''جاؤ بیٹا! خوش رہو۔ تم بہت بڑی سفارش لے آئے؛ میں راضی ہوں تم سے بھی اور اسے بھی معاف کیا۔'' چہرے پہ کوئی پھوار سی پڑی تو اٹھ بیٹھا۔ بارش ہورہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ اس نے خواب دیکھا یا واقعی اس کی ماں اسے ملنے آئی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ بارش میں بھیگتا گھر پہنچا۔

فضل جس وقت گھر پہنچا تو گھر کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ انوری چودھویں کے چاند کی طرح دھلی دھلائی تھی۔ اس دن مدتوں بعد انوری نے فضل سے دھیمے اور میٹھے سُروں میں بات کی۔ دونوں میاں بیوی نے رات کو اکٹھے کھانا کھایا۔ پھر وہ دونوں ماضی کے قصے لے بیٹھے۔ رات کا شاید آخری پہر تھا، فضل نے انوری سے کہا کہ اسے چائے بنا کردے۔ انوری نے بمشکل اٹھ کر چائے بنائی۔ اس نے خود بھی پی اور پھر فضل کو دی لیکن وہ سو گیا تھا۔ انوری اسے اٹھانے کو آگے بڑھی تو اسے یک دم چکر سا آ گیا۔ اسے کمرہ گھومتا ہوا سا محسوس ہورہا تھا۔ اس نے کسی چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن وہاں ایسی کوئی شے تھی ہی نہیں۔ سر کے بل زمین پر گری تو گرنے سے پہلے چارپائی کے پائے کے ساتھ اس کا سر ٹکرایا اور بے چین روح نے اس خستہ عمارت سے نکلنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائی۔۔۔۔۔

نام	قیصر دلاور جدون
ولدیت	دلاور خان جدون
پیدائش	۲۰ دسمبر ۱۹۸۲ء
جائے پیدائش	حسن ابدال (اٹک)
تعلیم	بی اے (ماس کمیونی کیشن)

ان کا تعلق حسن ابدال کے ایک زمیندار خاندان جدون سے ہے۔ابتدائی تعلیم برائٹ ہال پبلک سکول ہاؤسنگ کالونی حسن ابدال سے حاصل کی۔

۱۹۹۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ہاؤسنگ کالونی حسن ابدال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔نیلم گلاس فیکٹری حسن ابدال سے الیکٹریکل اپرینٹس شپ شروع کی۔ایف اے انہوں نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے پاس کی۔بعدازاں اسی یونیورسٹی سے بی اے ماس کمیونی کیشن کا امتحان پاس کیا۔

۲۰۰۰ء میں لکھنے کا آغاز کیا ابتدائی طور پر ان کی نظم ونثر نوائے وقت کے ایڈیشن ''پھول کلیاں'' اور کئی دوسرے اخبارات ورسائل کے ادبی و نیم ادبی ایڈیشن میں شائع ہوتی رہیں جن میں راولپنڈی، ماہنامہ ''پیغام ڈائجسٹ'' راولپنڈی، ماہنامہ ''تنویر الایمان'' حسن ابدال، ہفت روزہ ''نبیل'' حسن ابدال، ''معراج انٹرنیشنل'' راولپنڈی اور ''چراغ راہ'' حسن ابدال اور کتابی سلسلہ ''ثالث'' بھارت میں شائع ہوتی رہیں۔

شاعری کا پہلا مجموعہ ''خلش'' ۲۰۰۷ء میں وصی شاہ کے ادارے دعا پبلی کیشنز نے شائع کی۔دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ان کی کہانیاں مختلف رسائل میں چھپتی رہیں ہیں اب ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے۔

حسن ابدال میں علم وادب کے فروغ کے لیے ۲۰۰۹ء میں حسن ابدال سے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''شناسا'' کا اجراء کیا۔علاوہ ازیں ایک نجی ٹی وی چینل ''سیون سٹار پلس'' کے لیے مختلف پروگرامز کیے اور نجی ٹی وی چینل ''شناسا'' کے تحت تحقیقی نوعیت کا پروگرام ''حسن ابدال کے صاحبِ کتاب لوگ'' کچھ

عرصہ سے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ ہے۔

شاعری اور افسانوی مجموعہ کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''حسن ابدال کے صاحب کتاب'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

مطبوعات:

حسن ابدال کے صاحبِ کتاب (۲۰۱۸ء)

ماں

قیصر دلاور جدون

فقیر محمد حجام کی دکان گلی کے نکڑ پر تھی۔ کون کس وقت آ تا جاتا ہے، اور کدھر آ تا جاتا ہے کیوں آ تا جاتا ہے اس کی مکمل معلومات فقیر محمد کو ہوتی تھی۔ محلے کا کوئی شخص اگر تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر ہو جائے تو فقیر محمد سے دریافت کر لیا جاتا۔ فقیر محمد یار فلاں آدمی کو تو دیکھا ہے؟ پھر جھٹ سے جواب ملتا ہاں جی وہ تھوڑی دیر پہلے اس طرف جا رہا تھا۔ فقیر محمد سادہ طبیعت کا مالک، سچا اور کھرا انسان تھا۔ آج صبح حسب معمول آتے ہی اپنی دکان کو چمکا رہا تھا۔ اتنے میں بڑے صاحب آ گئے۔

''السلام علیکم فقیر محمد کیسے ہو؟''

''وعلیکم السلام صاحب جی! رب سونڑے کا بڑا کرم ہے جی، بیٹھیے خط بناؤں کہ بال بھی کٹاویں گے؟''

بڑے صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے:

''پہلے خط بناؤ، اور یہ بتاؤ کہ پچھلے دنوں تمہاری دکان بند کیوں رہتی تھی؟ تمہیں تو پتا ہے کہ میں تمہارے علاوہ کسی سے حجامت نہیں بنواتا۔''

فقیر محمد بڑے صاحب کے گلے میں کپڑا ڈالتے ہوئے بولا:

''وہ بڑے صاحب جی! میری ماں بہت سخت بیمار تھی جی۔ دو تین مہینے بہت علاج کروایا ہے پھر رب سوہنڑے کو کچھ اور ہی منظور تھا جی، اُن کی وفات کے بعد چالیسویں تک دکان بند رکھی ہے۔ ہمارے ہاں رواج ہے جی۔ چالی (چالیس) دن تک لوگ دعا کرنے آتے رہتے ہیں۔''

''بہت دکھ ہوا تمہاری ماں کی موت کا سن کر۔ مگر مجھے تو اس بات کا علم نہیں ہوا، ورنہ میں آتا تعزیت کے لیے تمہارے پاس۔'' بڑے صاحب نے سامنے شیشے سے فقیر محمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس صاحب جی جس دن سے ماں مری ہے سچ پوچھیں تو نہ ہنسنے کو دل کرتا ہے نہ سجنے سنورنے کو ۔ مجھے تو لگتا ہے جی جیسے مرا دل وی ساتھ ہی مر گیا ہے ۔ پتہ نہیں کیوں جی ۔ پہلے میری دکان میں اونچے اونچے گانے لگے ہوتے تھے ہر ویلے (ہر وقت) پر اب دل نہیں چاہتا کے کوئی گانا سنوں ۔'' فقیر محمد استرے میں بلیڈ لگاتے ہوئے اپنے دکھ سنانے لگا۔

''لگتا ہے تم بہت پیار کرتے تھے اپنی ماں سے ۔'' بڑے صاحب نے شیشے سے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لو جی !! یہ بھی کوئی بات ہے ۔ بھلا ایسا کوئی پتر ہوگا جسے ماں سے پیار نہیں ہوگا ۔ صاحب جی اک بات کہوں آپ سے ۔ سچ پوچھیں تو یہ ماں رب کی بہت وڈی نعمت ہوتی ہے جی اولاد کے لیے ، رب سوہنڑے کا بہت وڈا احسان ہے ۔ میرے ابا کو مرے ہوئے وی (20) سال ہو گئے ہیں جی پر مجھے کدی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں یتیم ہوں ۔ پر پتہ نہیں کیوں جی جدوں سے ماں مری ہے لگتا ہے سب کچھ اجڑ گیا ہے جی ، سارا باغ لٹ گیا۔''

فقیر محمد کی پلکوں کی فصلیوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ استرے سے کام بھی دکھاتا جا رہا تھا۔ بڑے صاحب اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ فقیر محمد کے ہاتھوں کی کارگری بھی کمال ہے جو مشین کی طرح چل رہے ہیں مگر وہ اپنے دکھ بھی سناتا جا رہا ہے۔

''کیا ہوا تھا تمہاری ماں کو؟'' بڑے صاحب نے کرسی پہ تھوڑا اُٹھ کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس جی صاحب جی میری ماں کو کوئی اک بیماری نہیں تھی ۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ناں ، میں نے کدی ماں کو کھُل کے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا نہ کدے ہار سنگھار کیئے ۔ کیوں کے میری ماں کے پیو تو مرے تھے ہی پر سنگ کے بہن ، بھائی وی وقت کے ساتھ ساتھ مر گئے تھے ۔ اور پھر ابا کی موت نے ماں کو اندر ہی اندر سے توڑ دیا تھا جی ۔ وہ ہم بہن بھائیوں کے ساتھ ہنستی تو تھی اور خوش خوش رہنے کی کوشش بھی کرتی تھی پر کوئی اس کی ہنسی کے پیچھے چھپے دکھ کو نہیں دیکھتا تھا جی ۔ وہ جتنے دکھ تھے صاحب جی وہ وقت کے نال نال بیماریاں بن کے سامنے آتے رہے ۔ پہلے بی پی ہائی ہوا پھر شوگر دی شکایت ہوئی اور دل دیاں بیماریاں جاگ اُٹھیا ، تے آخر کار گردوں میں پانی پڑ گیا ۔ پھر ڈائیلاسز کے بعد ہوش آیا اور کچھ دیر بعد فوت ہو گئیں ۔'' فقیر محمد نے ماں کی بیماریوں اور فوت تک کے داستاں سنائی اور آخری فقرہ کہتے ہوتے

اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پایا جانے اس نے اس لمحے اس نے کیا سوچا ہوگا۔

''لو جی صاحب جی آپ کو خط بن گیا ہے۔'' فقیر محمد نے آنکھوں سے آنسوؤں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تھوڑی بالوں کی بھی صفائی کر دو یہ جو بال کانوں کے اوپر آ رہے ہیں انہیں تھوڑا ہلکا کر دو اور ہاں ذرا اوپر سر کے بال بھی تھوڑا چھوٹے چھوٹے کر دو۔'' بڑے صاحب نے فقیر محمد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی صاحب جی! ابھی کر دیتا ہوں۔'' فقیر محمد ہاتھ میں قینچی اور کنگھی لے کے بالوں کی کٹائی میں مصروف ہو گیا۔

''تم صاف اور سیدھے سیدھے انداز میں باتیں کرتے ہو!''۔ بڑے صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تاکہ ماحول میں پھیلی سوگواری ختم کی جا سکے۔

''صاحب جی مجھے آپ جیسے بڑے لوگوں کی طرح موٹے موٹے لفظ تو بولنے نہیں آتے جی، پر میں اک بات بتاؤں جی آپ کو۔ ابا کی مرنے کے بعد کے وی (20) سالوں میں مری ماں نے ہم سب بہن بھائیوں کو اکھٹا کر رکھا تھا۔ سب موتیوں کی طرح اک مٹھی میں تھے پر جب ماں مری تو یہ مٹھی کھل گئی۔ صاحب جی ہم دانہ دانہ بکھر گئے۔ وکھو وکھ (الگ) ہو گئے ہیں صاحب جی۔ وہ بوٹا ہی نہیں رہا کہ جس کی چھاؤں میں ہم سب بیٹھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہم اک دوجے کی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتے تھے۔ پر ہن صاحب جی ہر ہر گل کا حساب ہے جی ہر گل کا۔'' فقیر محمد بات کو پھر ماں کی طرف لے گیا۔ اس کے ہاتھ مسلسل کام میں لگے تھے اور وہ ساتھ ساتھ اپنے دکھڑے بھی سنا رہا تھا۔ ''تم نے یہ دکھ دل پہ لے لیا ہے فقیر محمد یہ تو قدرت کا قانون ہے مائیں سب کی مرا کرتیں ہیں۔ بس رب کی رضا پہ آمین کہنی چاہیے۔'' بڑے صاحب نے فقیر محمد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گئے کے ماں کی جدائی نے فقیر محمد کو بہت دکھی کر دیا ہے۔

''ٹھیک کہتے ہیں صاحب جی۔ پر ماں کا دکھ بھلا اتنی جلدی وی بھلایا جا سکتا ہے۔ ویکھو نہ جی میں چھوٹا سا تھا مری ماں نے مجھے اُٹھا کے سینے سے لگایا ہوگا، میری کنگھی کی ہوگی مجھے کھانا کھلایا ہوگا، میرے ہاتھ پاؤں کی مالش کی ہوگی اور اور اور میرے لیے ساری ساری رات جاگی ہوگی۔'' فقیر محمد نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''یہ تو ہر ماں کرتی ہے فقیر محمد صرف تمہاری ماں نے تو نہیں کیا ناں۔'' بڑے صاحب تھوڑا طنزیہ لہجے میں بولے۔

''پر صاحب جی! مان لیا کہ ایسا ہر ماں کرتی ہے پر جو میں نے کیا ہے ایسا ہر پتر نہیں کرتا صاحب جی۔'' فقیر محمد تھوڑی دیر کے لیے ہاتھ روک کے بڑے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جیسے صاحب جی کے متوقع سوال کا انتظار کرر ہا ہو۔

''کیا ایسا کر دیا ہے تم نے؟'' بڑے صاحب تجسس سے بولے

''صاحب جی! میں دنیا کے چند اُن خوش نصیب پتروں (بیٹوں) میں سے ہوں جی، جنھوں نے بیماری میں اپنے ماں باپ کو سنبھالا ہے۔ میں نے اپنی ماں کو سینے سے لگا کے اُٹھایا ہے جی۔ ہاتھ پکڑ کے چلایا ہے جی، اور اُن کے سر کی کنگھی کی ہے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا ہے اور ہاتھ پاؤں کی مالش کی ہے۔ صاحب جی! اور اور ہسپتال میں ساری ساری رات جاگا ہوں صاحب جی یہ تو میرے مولا کا مجھ پہ کرم تھا ورنہ اور وی بھائی تھے۔ پر رب جی نے یہ مہربانی مجھ پہ ہی کرنی تھی جی۔ جب ماں جی کا انتقال ہوا تھا تو میں اور میری بیوی اور میری اک چھوٹی بہن اور بھائی پاس تھے۔ میں آخری تین دن اک پاؤں پہ کھڑا رہا ہوں جی۔ باقی سب تو آتے جاتے رہے ہیں۔'' فقیر محمد نے کہا۔ ''تو گویا تم اب یہ سمجھتے ہو کہ تم نے ماں کی محبت اور خدمت کا حق ادا کر دیا ہے۔'' بڑے صاحب کی باتوں میں طنزیہ لہجہ صاف صاف چھلکنے لگا تھا۔

''توبہ توبہ صاحب جی میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں......نہ نہ نہ جی اللہ سائیں معاف کرے میں تو ماں کی جاگی ہوئی اک رات کا بھی قرض نہیں اُتار سکتا جی۔ وہ تو باتوں سے بات نکل آئی تو بتا دیا۔''

''لو جی بڑے صاحب جی! آپ کی کٹنگ ہوگئی۔'' فقیر محمد نے گلے سے کپڑا کھولتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا جیسے وہ اپنا دکھ چھپانے کی کوشش کرر ہا ہو۔

''بڑے صاحب تو کسی سوچ بھی ڈوبے ہوئے تھے۔

بڑے صاحب کے اندر سے کئی آوازیں سر اُٹھا رہیں تھیں جنھیں وہ دبانا چاہتے ہوئے بھی نہیں دبا سکتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے بیس برس پرانا منظر آ گیا جس وقت وہ گاؤں سے نوکری کی خاطر شہر

آئے تھے۔ شہر میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تو گاؤں میں آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا لیکن شہر میں ہی شادی کر لینے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوتا چلا گیا اور آخر کار ختم ہو گیا۔ جب کبھی گاؤں سے کوئی خط آتا یا کوئی آنے والا خبر لاتا کے تمہاری ماں بہت سخت بیمار ہے اور تمہیں بلاتی ہے تو اس بات کو محض اس لیے نظر انداز کر دیتا کہ میں اگر اب گاؤں جاؤں گا ایک تو نوکری سے چھٹی نہیں ملے گی اور دوسرا خرچہ بہت ہو جائے گا۔ یوں وہ شہر کی گوناں گوں مصروفیات میں پھنسا رہا۔ وہ اس بات بات کو بھول گیا کہ ایک بوڑھی بیمار ماں گاؤں میں چارپائی پر لیٹی اس کی راہ تک رہی ہے۔ اسے خیال تک نہ گزرا کہ اس کی ماں ہر آہٹ پر اسی کی آمد کا خیال کرتی اور اسی امید سے دروازے کو تکتی تھی کہ اس کا بیٹا آ گیا اور جب سے اس کی بینائی زائل ہوئی وہ دورازے کی ہر آہٹ کے بعد نذیر محمد کی آواز سننے کے لیے بے تاب رہتی۔ اور ہوتا بھی یوں کہ کوئی خاتون شہر سے آتی اور بوڑھی ماں سے ملنے جاتی تو بوڑھی ماں اسے اپنے بیٹے کے بارے میں ضرور پوچھا کرتی لیکن آنے والی خاتون مسکرا کر کہتی کہ شہر تو انسانوں کے سمندر ہیں وہاں کون کسی کو ملتا ہے۔ ماں ایک لمحے سوچ میں پڑ جاتی کہ کیا میرا بیٹا مجھے بھی بھول چکا ہوگا! اور پھر اگلے لمحے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی اور اسے خیال آتا کہ وہ بہت مصروف ہو گیا ہوگا۔ اور پھر ماں کے منہ سے دعائیں نکلتی تھیں۔

یوں ہی وہ اپنی ملازمت کرتا رہا اور پھر! ایک دن آفس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، آفس بوائے نے لپک کر ریسیور اٹھایا:

''ہیلو جی نذیر محمد سے بات ہو سکتی ہے؟'' یہ درد سے رچی ہوئی آواز بڑے صاحب کے بھائی کی تھی۔

''جی آپ ایک منٹ ہولڈ کریں''۔ آفس بوائے نے ریسور کو میز پہ رکھ کر آواز دیتے ہوئے کہا نذیر صاحب آپ کا فون ہے۔

''ہیلو کون؟'' بڑے صاحب بولے۔

''نذیر! میں بشیر محمد تیرا ویر۔ نذیر محمد! ڈاکٹروں نے بے بے کا جواب دے دیا ہے کہتے ہیں کہ اب نہیں بچے گی۔ جب ہوش میں آتی ہے تو کہتی ہے...... نذیرے میرے پتر تو آ گیا ہے...... نذیرے میں تو اندھی ہو گئی ہوں، تیری راہ تک تک کے میرے لال! شکر ہے تو آ گیا ہے۔ نذیر محمد! دیکھ اب بھی وقت ہے چھٹی لے کے آ جا، دیکھ ماں اب دیکھ تو نہیں سکتی پر تیری آواز تو سن لے گی نا! دیکھ تجھے رب کا واسطہ بے بے کا ساہ سکھ سے نکلنے دے۔'' بڑے صاحب کا بھائی مسلسل منتیں کرتے ہوئے روئے جا رہا تھا۔

''نہیں لالا! بہت مشکل ہے ادھر سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔'' نذیر محمد نے جب یہ کہا تو دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ نذیر محمد سمجھ گیا کے بھائی نے غصے سے فون بند کر دیا ہے۔

پھر کچھ دنوں بعد گاؤں سے بندہ آیا ہے کے تیری بے بے فوت ہو گئی ہے۔ نذیر محمد کو ہلکا سا دکھ اور افسوس ہوا لیکن پھر چند دنوں بعد حالات معمول پر آ گئے۔

بڑے صاحب سوچوں میں گم تھے۔ فقیر محمد بولا: ''صاحب جی صاحب جی کدھر گم ہو گئے ہیں؟''

بڑے صاحب ایک دم سے بوکھلائے: ''کک...... کک...... کچھ نہیں بس ویسے ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔ اچھا تو کتنے پیسے بنے ہیں تمہارے؟''

''جو دل ہے جی دے دیں۔ میں نے پہلے کبھی مانگے ہیں جو، اب مانگوں گا!''

بڑے صاحب نے جیب سے سو کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا

''یار فقیر محمد تو بہت خوش قسمت ہے یار بہت خوش قسمت...... تو نے اپنی زندگی میں وہ کچھ کما لیا ہے جو میں نے نہیں کما سکا۔ مجھے آج اس سوال کا جواب مل گیا ہے کہ میرے بیٹے کاشان اور حنان مجھے کیوں تنہا چھوڑ گئے ہیں! اب اس اتنی بڑی حویلی میں میں تن تنہا کیوں رہ گیا ہوں! کیوں کسی کسی وقت نذیر پتر نذیر پتر کی آواز مجھے سوتے ہوئے جگا دیتی ہے۔''

فقیر محمد نے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا:

''صاحب جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جی میرا پتر رشید تو کہتا ہے کہ ابا اب تو دکان پہ نا آیا کر بس اب نماز روزہ کر اور غم خوشی پہ جایا کر۔ میرے پہ تو رب سوہنڑے کا بہت کرم ہے جی۔''

(ثالث، جلد ۳، شمارہ ۱۱، جولائی ۲۰۱۷ء انڈیا)

پنجابی کہانی کار
(ٹکسالی)

جدوں نکے ہوندے ساں

گرمکھ سنگھ مسافر
(تعارف صفحہ ۳۶)

نکے ہوندیاں دیاں کئی گلاں مینوں کل وانگن چیتے ہن۔ڈھائیاں پیساں دا دودھ تے دھیلے دا مٹھا۔ بالٹی بھر جاندی سی۔ایڈے سواد ہوندا سی کہ اج ذکر کر دیاں وی سواد آ رہا اے۔

ایہہ تے گل شہراں دی اے۔پنڈ وچ بتاں مٹھیوں بی دودھ بڑا مٹھا سگدا اسی۔ادھی صدی توں وی پہلاں دیاں ایہہ گلاں نے۔پرانے لوک سچ بھٹ دیاں گلاں بھاویں ہن نالوں ودھیک مندے سن، پر اج وانگن باہروں سچے ستھرے تے اندروں کوجھے جھوٹے نہیں سن۔میں ہوائی گلاں نہیں کر رہیا اپریاں دسن لگاہاں۔

ساڈے پنڈ وچ اک سید احمد شاہ دا ساڈے گھر بڑا آن جان سی۔پتا جی دے اوہ دوستاں وچوں سی۔میرے ہوندیاں جد کدی وی اوہ ساڈے گھر آوندا، اندروڑ دیاں ہی اوہ آکھدا ''نکے بھائی جی! سٹو پنجہ'' میں وی اس نال ہتھ ملا کے بڑا خوش ہوندا۔

اک دن میں اپنے وڈے بھائی دے کھوہ توں پین دے پانی دے گھڑی بھر کے لئی آ رہا ساں، احمد شاہ مینوں اگوں راہ وچ آوندا مل پیا۔اس نے ہمیشاں وانگ پنجہ سٹن دی گل نہ آکھی۔میرے کولوں جد اوہ لگن لگا تاں میں اس دی کھلے گلمے والے چولے دی کنیں پھڑ لئی تے کیہا:

''شاہ جی پنجہ سٹ کے جاؤ''

پنجہ تاں اس نے کی سٹنا سی، پرے ہٹ کے کھلو گیا تے آکھن لگا

''بو کے کر چھوڑیا نے۔؟ ہے تواڈا پانی ہن کون پیسی؟

وڈے بھائی اوراں کولوں وی شرمندگی دواسوں۔'' احمد شاہ دی گل سن کے بھورا چنتا مینوں وی ہوئی۔میں اجے پانی گھڑی لے کے گھر پہنچا ہی ساں کہ پچھے پچھے احمد وی ساڈے گھر پہنچ گیا تے

آوندیاں ہی پتا جی نوں آکھن لگا

"نکے بھائی اوراں اج میرے نال وڈی ودھیک کیتی اے۔"

چوکے دی گھڑونجی تے پئی پانی دی گھڑی ول اشارہ کر کے احمد شاہ آکھن لگا:

"اے پانی ہن تسی نہ پیو۔ نکے بھائی اوراں اج میرے نال جورو ذوریں مینڈے چولے دی کنیاں نپ کے گھڑی بھٹا گھدھی نے۔"

پتا جی نے احمد شاہ نوں نال دی منجی تے بٹھا کے چپا منہ کر کے آکھیا

"چنگا احمدا میں ویکھنا، گھڑی دا پانی بھٹیا اے کہ نہیں۔"

پتا جی نے گھڑی وچوں پانی دا اک کٹورہ بھر کے پی لیا تے آکھن لگے

"یار احمدا! سواد تے بدلیا نہیں۔"

صرف احمد شاہ واسطے ہی نہیں، سارے گرائیں واسطے ایہہ گل بڑی حیرانی والی سی۔ اس دی بڑی چرچہ ہوئی، کوئی کجھ آکھے کوئی کجھ آندھ گوانڈھ دیاں زنانیاں نے میری ماں دے نک وچ دم کر دتا۔ گل چاچی سرب جان تک وی پہنچ گئی۔

اگلی گل اس توں وی پہلاں دی اے۔ نکھو خنچے دی وہوٹی چاچی سرب جان دا اپنا کوئی منڈا اکڑی نہیں سی۔ اوہ بڑی چھنڈی پھوکی رہندی سی۔ اپنے کچے کوٹھے دیاں کندھاں لیپ پوچ کے رکھدی، نکے جنے ویہڑے نوں وی پوچ پاچ کے اپنا سنوار بنا کے رکھدی، چٹے دودھ اپنے ہتھ دے دھوتے ہوئے سوتر دے کپڑیاں اُتے مجال اے کدے اوہ میلا داغ وی لگن دیوے۔ جس رنگلی پیڑھی اُتے بہہ کے، اوہ چرکھا کتدی سی۔ اوہ پیڑھی پکیوں لیائی سی، کتنے ہی سال ہو گئے سن پر اے جاپدا سی کہ ایہہ ہنے ہنے نواں رنگ کروا کے لیائی اے۔

میں نکا جیا ساں، پر مینوں یاد اے کے چاچی سرب جان ساڈے گھر آن کے مینوں نال لے جاندی، چھولیاں دیاں گلیاں نال کتنا کتنا اپنے گھر دی گاں دا مکھن مینوں چٹا دیندی سی، پر اپنے گھر دا پانی مینوں نہیں سی پین دیندی۔ پانی واسطے میں کدے ضد کر داتاں اوہ آکھدی:

"جے اس طرحاں ضد کریں گا تے تیری ماں تے تیرے وڈے بھائی اوریں تینوں مینڈے گھر آن نہیں دینگے۔"

مینوں سمجھ نہیں سی وآوندی کہ دودھ مکھن نہیں بھٹدا تے پانی کس طرحاں بھٹ جاندے۔ چاچی سرب جان میرے نال بڑالاڈ کردی سی، کتناچر گھٹ گھٹ کے مینوں چھاتی نال لائی رکھدی میریاں گلھاں نوں اپنے گلھاں نال ملدی رہندی، پر منہ تے پیار نہیں سی دیندی۔

احمد شاہ پاسوں پانی دی گڑوی بھٹن دی گل چاچی سرب جان نے وی سنی، پر ہن اوہ مینوں بچوگر ھے نالوں کجھ وڈیرا ہو گیا سمجھن لگ پئی سی۔

اول تے پنجاہ سال ہی بندے ہن، پر اٹھتالیاں توں تاں گھٹ نہیں ہونیں۔ ۱۹۱۹ء وچ جلھیا والا باغ دا خونی حادثہ ہو گیا تے ۱۹۲۱ء وچ ننکانہ صاحب دا ساکہ۔ بس اس توں پچھے مسافر دے کتھے پیر ہی نہیں لگے۔ ۱۹۲۳ء دا کوئی دن ہووے گا، ملتان سنٹرل جیل دی گل اے۔ پٹھان قیدی نمبردار پاسوں میں لنگر وچوں دلیہ منگوایا۔ جتھدار اودھم سنگھ ناگوکے، درشن سنگھ پھیرومان تے میں شاید کوئی ہور وی ساڈے نال ہووے، اساں دلیہ کھادا۔ جیلھاں وچ لگر دی مشقت تے مسلمان قیدیاں نوں نہیں سی لگایا جاندا۔ جد مسلمان نمبردار ہتھوں ساڈے دلیہ کھالین دی خبر مسلمان قیدیاں نوں پتہ لگی تاں کجھ قیدیاں نے رتھ پکاون لئی منگ کر دتی۔ لنگر دی مشقت تے پروان نہ ہوئی پر لنگر وکھ وکھ ہو گئے، تے ۱۹۴۷ء وچ ملک وی دو ہو گئے۔ آکھدے نے، ہن زمانہ روشنی دا آ گیا اے، پہلاں لوک انہیرے وچ سن۔ لوڑوں ودھیک روشنی نال اکھاں چندھیا جانا وی انہیرے وچ ترن والی ہی گل اے۔ گل گلاں نال وی بن جاندی اے ۔ سائنس دیاں کاڈھاں نے کئی داکئی کر کے ویکھا دتا، تاں پھر اسیں ہن دیاں لوکاں نوں انجانے کیوں سمجھیئے؟۔ جیل دیاں سزاواں وچ اک ایہہ سزا وی ہوندی سی کہ قیدی نوں بیرک وچوں ساتھیاں نالوں نکھیڑ کے وکھری کوٹھڑی وچ بند کر دتا جاندا سی سیکھاں والے دروازے وچوں ہی اس نوں روٹی پانی دے دتا جاندا سی۔ اکثر قیدی جنہاں نوں وکھری کوٹھڑی وچ بند کر دین، سیکھاں والے دروازے وچوں باہر جھاکدے رہندے ہن۔ تے جیل کرمچاریاں نوں اس توں ایہہ خیال ہوندا اے کہ اس دا باہر آون نوں جی کردا اے۔ درشن سنگھ نوں جد کداں اس طرحاں وکھری کوٹھڑی وچ بن کر دتا جاندا تاں اوہ دروازے والے پاسے پٹھ کر کے پاٹھ شروع کر دیندا۔ اک وار ملتان سینٹرل جیل دا داروغا رائے صاحب جمنا داس مینوں آکھن لگا:

"درشن سنگھ پاس میری اک سفارش تے کرو، اج سپرڈنٹ صاحب نے جیل دا خاص معائنہ کرنا

اے، اسنے درشن سنگھ دی کوٹھڑی ساہمنے وی جانا اے، چنگا نہیں لگدا کہ اس نے دروازے والے پاسے پٹھ کیتی ہووے۔" انج رائے صاحب سدھے منہ قیدیاں نال، خاص کر کے راجسی قیدیاں نال گل نہیں سی کر داسکوں پٹھان نمبرداراں کولوں بڑی کٹ پھرواندا سی۔ کس طرحاں دے بندے سن آزادی دی لڑائی دے سپائی۔ درشن سنگھ پھیرومان دیاں ہور وی کئی گلاں ہن۔ میں اک نکی جئی گل دسی اے۔ پہلی وار جیل جان توں وی پہلاں دی گل اے، پشاور وچ اک خلافت کانفرس سی، اوہناں دناں وچ کانگرس، خلافت تے اکالی۔ ساریاں لہراں اکٹھیاں ہی چلدی سن۔ کانفرس والیاں اک کوی دربار رکھیا، سرکار نے کوی دربار اتے پابندی دا اعلان کر دتا۔ کانفرنس دے پربندھکاں نے فیصلہ کیتا کہ کوی دربار نہ کیتا جاوَے، ویسے ہی جلسے وچ اک تقریر پچھوں دو دو کویتاواں پڑھالئیاں جان تے پھر تقریر ہو جائے تے پھر کویتا۔ لکھا سنگھ کھنڈیوالا اک بڑا مکھولیا سپر چارک سی۔ جد اس دی واری تقریر کرن دی آئی تاں اوہ اٹھدیاں سار ہی آکھن لگا "سرکار نے کوی دربار تے پابندی دا اعلان کر دتا، پر اسیں وی سرکار دے پیو ہاں، اساں اس ڈھنگ نال کوی دربار کرا ای لیا اے"

جس طرحاں اس نے آکھیا میں اسی طرحاں ہی دس رہیا ہاں۔ اے لفظ اس نے مونہوں کڈھے ہی سن کہ پولیس نے جلسے اُتے چھاپا مار کے جلسہ ای اکھاڑ دتا۔ ساریاں کویاں نوں اوہ گرفتار کرن چاہندے سن، پر خلافت دے پربندھکاں نے سانوں اپنے گھراں وچ لکا لیا۔ کوی اسیں سارے تقریباً سکھ ہی ساں پٹھان پربندھکاں نے ساڈے واسطے اچیچا جھٹکے نال گوشت دا انتظام کیتا اسیں روکدے ساں تے اوہ آکھدے سن: "تسیں ساڈے مہمان ہو، اسیں اپنی پٹھانی روایت دے مطابق ہی تہاڈی خاطر کرانگے۔ اتھے تسیں گرفتار ہووہ تاں ساڈی ہتک اے، اسیں تہانوں اٹکوں پار کر کے آساں۔"

سویرے سانوں پردیدار لاریاں وچ بٹھا کے اٹک پار کرایا، بھاویں رستے وچ لاریاں روکیاں نے صحیح، پر لاریاں پردیدار سن، اس واسطے اوہ بہتا دخل دینوں، کجھ جھک جیے گئے۔ کسے نے آکھ وی دتا "لاری وچ پردہ نشین ہن۔" اٹک پار کر کے بھید کھلھیا۔ اسیں پنجاب وچ ساں تے سرحدی پولیس پریشان سی۔ ہاسے دا ہاسہ تے رواداری دی حد، کداں یاد نہ آوے نکے ہوندے دا زمانہ کجھ سوادا اے، تاں ای تے بچپن یاد اے۔

پریم اٹل اے

سردار سنگھ نارنگ

(سردار سنگھ نارنگ کا تعلق کیمبل پور اٹک سے تھا اور ۱۹۴۲ء سے قبل گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) کے سٹوڈنٹ رہے۔ ان کی یہ کہانی نومبر ۱۹۴۲ء میں کالج کے میگزین "فلو اڑی" میں بہ طور اولڈ سٹوڈنٹ شائع کی گئی اسے شامل کتاب کرنے کا مقصد صرف کیمبلپور میں کہانی کی روایت کی جانب اشارہ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی سے قبل پنجابی کہانی کے لیے زمین ہموار تھی۔ اس وقت "فلو اڑی" کے سٹاف ایڈیٹر چوہدری ہرجیت سنگھ اور ٹھاکر راجندر سنگھ سٹوڈنٹ ایڈیٹر تھے۔)

دور۔۔۔ ایدوں وی پرے۔۔۔ ایناں اوچیاں اوچیاں محلاں وچ رہن والیاں دی نگری توں دور جھیل دے کنڈے وسدی پہاڑی دی چوٹی تے اک ککھاں دی کٹیا سی کدے کدے دیوے دی مٹھی مٹھی روشنی نظر آوندی سی تے نال ہی کسے بڈھے دے کھنگن دی آواز وی آوندی سی۔

چودھویں داچن اج وی گھنڑے بدلاں وچوں نکل نکل کے جھیل دیاں شوخ موجاں نال کھیڈ رہیا سی ساں ساں کردا اک تیز پون دا بلُو نڑاں آیا تے دیوا بجھ گیا۔ بجلی چمک رہی سی تکدیاں تکدیاں نکی نکی بوندا باندی وی شروع ہوگئی۔ بابا اپنی ٹُٹی ہوئی چارپائی توں اٹھیا تے اُچی ساری اواز نال کہن لگا "بیٹی تارا دیوا جگا دے۔" تارا نے دیوا جگا دتا تے فرباری وچ جا کھڑی ہوئی۔ بڈھے نے ویکھیا کہ تارا دیاں اکھاں وچ چمکدے موتی نسے۔ کجھ اکھاں وچوں نکل کے گالاں تے آ گئے نے۔ بڈھے دا دل کمن لگ پیا۔ "تارا" بڈھے نے مایوسی بھری اواز نال بلایا۔ تارا نے ہنجوں پونجدیاں ہویاں کہیا۔ "جی بابا جی۔"

تارا پیار دا سرماں سی گول اکھاں، سرخ چہرہ، سڈول جسم، کالے کالے وال، دل کھویں نقش قدرت نے اک رنگینی اس وچ بھری ہوئی سی۔ "بیٹی تیریاں اکھاں وچ ہنجوں کیوں نے"؟ بڈھے نے سر تے پیار نال ہتھ پھیردیاں ہویاں کہیا۔

"جی بابا جی!۔۔۔" تارا دا گلا رک گیا۔ تارا تے بڈھے دیاں اکھاں آپس وچ مل گیاں۔ تارا سوچ

رہی سی۔ ہوکا لیا۔ اکھاں وچ رکے ہوئے ہنجوں گالاں توں کھسد ے کھسد ے فرش تے ڈگ پئے۔ تارا نے بڈھے ول معصوم نظراں نال ویکھیا تے نال والے کمرے وچ جتھے پوجا کردی سی چلی گئی۔

بڈھا کہہ رہیا سی کہ ''اے نادان تارا سمجھدی ہووے گی کہ اس دے پتا نوں ایناں ہنجواں دا کارن پتہ نہیں۔ پر میں جانداہاں کہ میرے گھر وچ اگ لگی ہوئی ہے تے میں نہیں سمجھدا۔۔۔۔ایہہ ہنجوں پریم دیوتا وی بھیٹا چڑھ رہے ہین۔اے دیوتا میرے تے رحم کر۔۔۔

بڈھے دیاں اکھاں وچ ہن ہنجوسن۔بجلی باقائدہ چمکی جارہی سی ہوادی ساں ساں نال دل ڈرجاندا سی۔بڈھے دی اکھاں کھلیاں اواز دتی ''تارا۔۔۔۔'' کوئی جواب نہیں،فر اواز دتی۔۔۔''تارا۔۔'' کوئی جواب نہیں۔باری وچوں وی جھاکیا۔دور پرے درختاں دی گھنڑی چھاں بیٹھاں تارا اک جوان نال گلاں کررہی سی۔بڈھے نے اوہنوں پچھن دی کوشش کیتی پر کامیابی نہ ہوئی۔جوان اس نوں اپنے نال لے جان لئی مجبور کررہیا سی۔اتے تارا کہہ رہی سی ''نہیں چندر میں تیرے نال اپنے پتاں نوں چھڈ کے نہیں جاسکدی۔میں اپنے پتا نوں کس دے سہارے چھڈ کے جاواں''۔

''چنگا تارا ۔۔'' کہہ کے چندر واپس مڑیا۔''میں تیرے بناں کویں جی سکداہاں۔''

تارا دا سر چندر دے پیراں اوپر سی۔چندر نے اوہنوں چک کے گلے نال لالیا۔تارا کہہ رہی سی معاف کردے مینوں چندر! بڈھے دی آس دا تارا نٹھ کے انہیرے وچ غائب ہوگیا۔بڈھے توں رہیا نہ گیا تے کمبدی اواز وچ بولیا۔تارا۔۔۔تارا۔۔۔

تارا واپس مڑی تے بڈھے نال چمڑ گئی۔چندر جنگل وچ غائب ہوگیا۔

''بیٹی تارا کیوں میری پونجی نوں لٹارہی ایں۔'' میری جیون بتی نوں اجے جل لین دے۔میں تیرے سہارے جی رہیا ہاں۔'' بڈھے دا گلا رک گیا۔تارا دیاں اکھاں وچ ہنجو آ گئے۔بھری اواز نال بولی ''مینوں معاف کردیو پتا جی۔۔'' تارا نوں نال لے کے جھگی وچ آیا تے ہتھ جوڑ کے آکاش ول بول اٹھیا۔اے دیوتا آخر میری پونجی نوں کیوں برباد کیتا جارہیا ہے میرے گھر وچ اگ لگ گئی ہے۔جیہڑی میری سب آس نوں ہولی ہولی نراس کردیوے گی۔بڈھے دے لفظاں وچ اک درد سی۔دیوتا چپ سی پر اک اواز بڈھے دے کناں وچ گونج رہی سی۔پریم اٹل ہے۔

تارا مندر وچ پوجا کررہی سی۔ایہو پوجا کردی گئی۔اک ارمان بھریا دل لے کے جھٹ دروازہ

کھولیا۔ چندر جلدی تارا کول آ کھڑا ہویا۔ کہن لگا کہ ''تارا میں تیرے آخری درشن کرن آیا ہاں۔

''ایہہ ناں کر میرے چن میری جان نال پتانوں بڑا دکھ ہووے گا۔''

''چنگا جا''۔ اپنے پتا نوں سکھ دے''۔ ایہہ کہہ کے چندر نے دروازہ کھولیا تے باہر ٹر پیا۔ تارا حیران سی کہ کی کیتا جاوے۔ اک پاسے پتا دا پیار دوجے پاسے۔۔۔ ''کھلو جا چن! میں آئی۔۔۔۔۔'' ایہہ کہہ کے دونویں مندر توں باہر چلے گئے۔

بڈھا باری وچ بیٹھ کے سوچ رہیا سی کہ میری تارا مینوں کدی چھڈ کے نہیں جا سکدی۔ مینوں نراس نہیں کر یگی۔ بڈھے دی نظر اک بیڑی تے پے گئی۔ جھیل وچ اک بڑا بھاری طوفاں آیا ہویا سی۔ جوڑا اپنی زندگی تے موت دا تماشا کھیڈ رہیا سی۔

فر بڑے زور نال اواز ماری ''تارا۔۔۔ پر ٹٹے ہوئے ساز چوں نکلیا ہویا گیت ختم ہو گیا۔ بیڑی تیزی نال اگے اس توں وی اگے جا رہی سی۔ بڈھا فر اُچی جگہ تے کھڑا ہو کے بڑے زور نال اواز مارن لگا۔ پر بے سود۔۔۔۔۔ جلدی نال مندر وچ چلا گیا۔ دیوتا دے چرناں تے ڈگ پیا۔ ادھر لہراں نے دو جوانیاں نوں اپنی جھولی وچ لپیٹ لیا۔ تارا دے منہ چوں آخری وار نکلیا۔۔ پتا جی۔۔۔۔

دور پرے پہاڑی دی چوٹیاں ہنیرے وچ ویکھ رہیاں سن دیوتا ہس رہیا ہے تے پجاری شاید اپنے سواس ختم کر چکیا اے۔

(مطبوعہ نومبر ۱۹۴۲ء ''فلواڑی'' گورنمنٹ کالج کیمبل پور)

کیمبل پوری بولی

(چھاچی لہجہ)
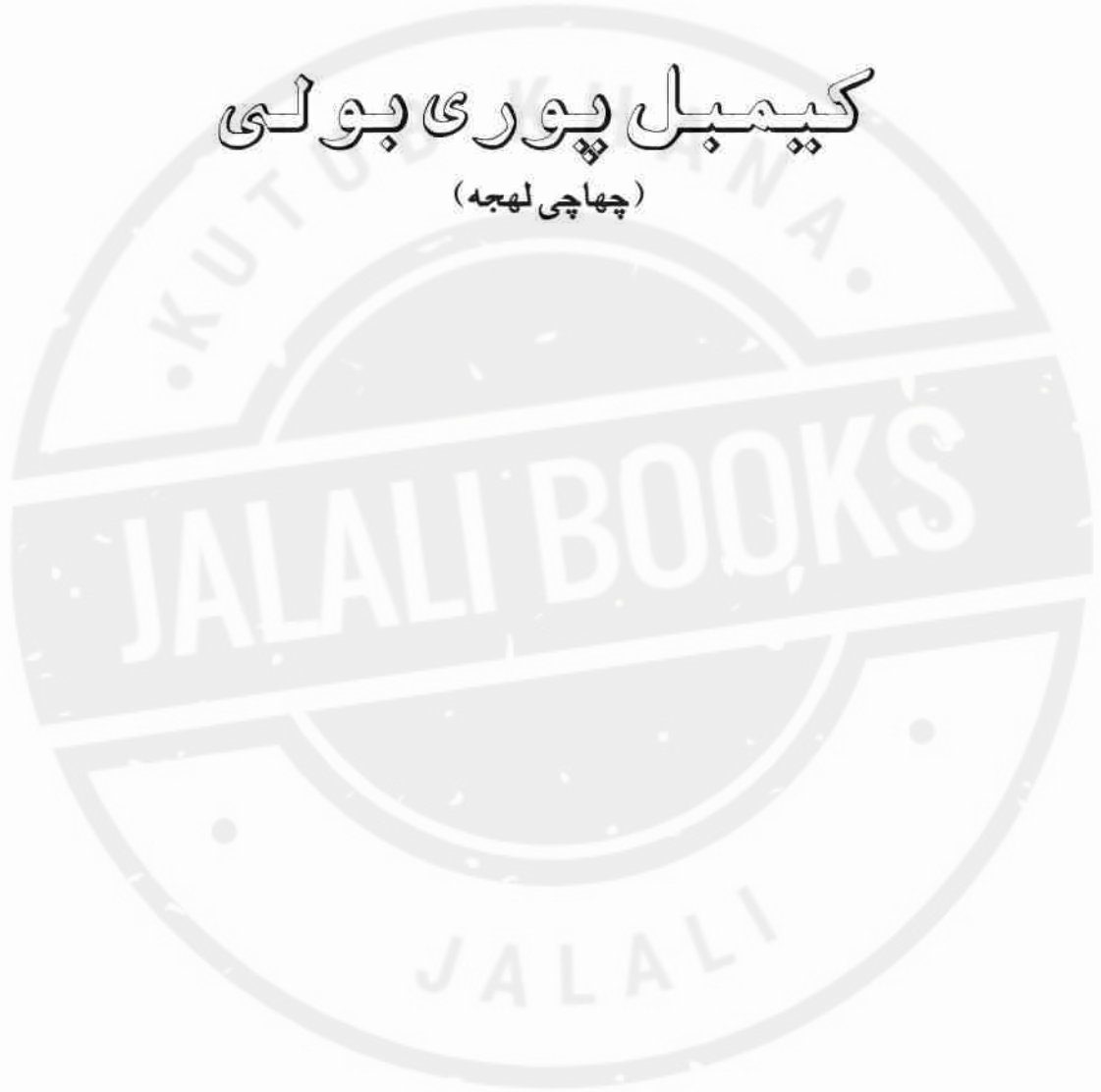
نام	ملک مشتاق احمد
قلمی نام	مشتاق عاجز
ولدیت	ملک احمد خان
پیدائش	یکم اپریل ۱۹۴۴ء
جائے پیدائش	جنڈ (اٹک)
تعلیم	ایم اے اردو

ان کا آبائی گاؤں سیدن ضلع اٹک کی ایک تحصیل حضرو میں واقع ہے لیکن ان کا خاندان کافی عرصہ سے اٹک شہر میں مقیم ہے۔ انہوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز گورنمنٹ ایم سی مڈل سکول کیمبل پور (اٹک) سے کیا۔

میٹرک ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور سے پاس کی اس کے بعد گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ایف اے اور ۱۹۶۴ء میں گریجویشن کی۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے ان کی پہلی تقرری بہ طور ہیڈ ماسٹر مڈل سکول جبی کسراں میں ہوئی۔ دوران ملازمت انہوں نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۶۹ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ۷۴-۱۹۷۳ء میں آئی۔ ای۔ آر پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایڈ کیا۔

۱۹۷۸ء میں انہیں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکولز مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر پنڈی گھیب تعینات ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں اسی عہدہ پر اٹک تشریف لے آئے۔ ۱۹۹۴ء میں بہ طور ہیڈ ماسٹر ہائی سکول نمبر ا فتح جنگ تعینات ہوئے جہاں انہوں نے ۱۹۹۸ء تک اپنی خدمات انجام دینے کے بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔

ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۳ء میں شعر گوئی سے کیا۔ ابتداء میں حکیم تائب رضوی سے رہنمائی لی۔ پنجابی و اردو کے پرگو شاعر ہونے کے ساتھ مقامی بولی چھاچھی کے کہانی کار بھی ہیں۔ ان کے افسانے ''سہ ماہی

قندیل'، اٹک کے خصوصی گوشہ پنجاب رنگ میں اور'' پنچم' لاہور میں شائع ہوتے رہے تاہم ابھی تک ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہ آ سکا۔

فن مصوری میں بھی مہارت رکھتے ہیں ۱۹۷۷ء میں ''جوابِ شکوہ'' کے پندرہ بند پین اینڈ انک میں مصور کرنے کے علاوہ مختلف شعراء کی کتابوں کے سرورق بھی مصور کیے۔ اپنی کتاب ''سمپورن'' کے دس ابواب کے لیے دس تصاویر بنائیں اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے چند اشعار کو بھی مصور کیا جو ڈاکٹر ناشاد کے شعری مجموعہ'' رنگ'' میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بچپن سے موسیقی کے رسیا تھے عمر شباب میں نہ صرف گیت غزلیں گاتے بل کہ بینجو بھی بجاتے تھے۔ مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے انہیں اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

مطبوعات:

آئینے سے باہر (شاعری)

الاپ (شاعری)

سمپورن (دوہے)

پھلائی (پنجابی شاعری)

زندگی گیت ہے (مجموعہ گیت)

خراج

ماخذ

ارشد سیماب ملک، تذکرہ (شعرائے اٹک) ۲۰۱۲ء

سید نصرت بخاری، شخصیاتِ اٹک، جلد اول، ۲۰۱۷ء

سہ ماہی قندیل، ارشد سیماب ملک، مدیر، اٹک ۲۰۰۲ء

انھا کھوہ

مشتاق عاجز

چوکیدارے نی کتاباں چ اس ناناں غلام محمد ولد اللہ داد لکھا ویا ہیا برے حویلی چ پیر پاون لکیاں اوہ آپناں بہوں پاک تے بہوں وڈیاں شاناں والا ادھا ناں درشاہیوں باہرای چھوڑ گیا تے ڈیڈھویں چ وڑنیاں ای نرا مرا غلام رہ گیا۔اس سیانپ کیتی نہیں تاں غلام بی نا نہہ رہنا۔غلام محمد توں گھامڑ بن وینا۔اساں آپنے پیو نا قصہ یاد ہیا جیہڑا پوراناں گھِدی گھِدی حویلی ونج وڑا ہیا تے وت چوہدری اس کولوں ادھاناں کھس کے رہئے ادھے آں کوڑی نال داڈو بنا چھوڑا ہیا۔اس حویلی چ کوئی بی کمی تے کاما سدھے تے ثبوتے نائیں والانہیں ہیا۔کوئی قوبا ہیا تے کوئی شنُو،کوئی لاہیا تے کوئی سلُو،کوئی خاقا تے کوئی دادو۔نوکراں نے ناں تے حلیے وگاڑ ناں چوہدریاں نا جدی پُشتی کم ہیا برے چوہدری مثال اوراں نی عادت بہوں چنگی ہئی۔ایہناں کمیاں جمیاں نیاں دھیاں بھیناں تے زنانیاں نی بہوں عزت کرنے ہئے۔نوکراں کھوہرا اُبراناں تے ویہرویہر پینا برے نوکریانیاں ہس کے بلاناں تے سوہنے سوار کے ناں گھِننے۔پھلاں مصلنی آں پھولاں رانی،چنو بھٹھیاری آں چن بی بی،شادو آں شاہزادی تے حسو آں حسن پری آکھناں۔اوہناں جتنا جتنا ناں سوارنا ایہناں اتنا اتنا اپنا آپ سوارناں تے مچ مچ پیناں۔

حسو غلام نی ماء تے دادو نی زنانی ہئی۔جناں تریمت دو ہیں،سارے نوکراں نوکرانیاں کولوں نکھڑے وئے تے نتھرے وئے رج کے سوہنے تے سُر تھے۔ہک چوہدری اوراں نا خاص نوکر تے دوئی چوہدرانی اوراں نی خاص نوکریانی۔آپے چوں بی دوہاں نارج کے متھاج ہیا تے ہک سیت بی ہکی دوئے تے وساہ نہیں کرنے ہئے۔دادو حسُو آں آپنے نال حویلی کھڑے تہاڑی ساری اُساں نظری چ رکھے تے نماشاں نال گھِن کے آوئے۔بہوں سکھی تے خوش باش پئے وسنے ہئے برے بھیڑی نظر کھا گئی۔دادو چوہدری اوراں نال شکارتے گیا تے رتی دندی توں تلے ونج پیا۔چوہنبڑاں والی ترڑاں تے لگا۔سرے نی سٹ گھِن گئی تے جاہگاں تے مرگیا۔جانو تے اسنی ناناں چنو کجھ ہور گل بی اُڈائی برے ڈاکٹری ملاحظہ

بی ہویا تے پولیس بی آئی۔ساریاں ہکا ہی گل متھی ہئی مارا کیں مُیں ،دندی توں ڈھے کے قضائیوں مویائے۔دادو مناں مٹی تلے دبا گیا تے حسو اجڑ گئی۔دوئی جمعراتی تک روٹی ٹکڑا چوہدریاں نے گھروں آنا رئیا تے وت ہِک دیہاڑے چوہدریانی اوراں حسو آں حویلی سد بھیجا۔چلیپے کولوں پہلوں ہی پھوہڑی چائی گئی تے حسو جا کتے آں نانی کول چھوڑ کے حویلی ونج پوہچی۔چوہدریانی نے بھراؤ ناویاہ تیار ہیا تے اوہناں پیکے ونجناں ہیا۔اُن تاں گھرے نی سام سبھال حسو نے حوالے کر کے پیکے ٹر گئے۔برے حسو آں پے وختا گیا۔دادو نے جینیاں حویلی ویناں تے دیگری نماشاں تک کم کرنا ہور گل ہئی برے ہن دیہوں لتھے تک حویلی چ رہناں بلنی اگی چ چھال مارناں ہیا۔نا نہہ اگے جوگی رہی تے نا نہہ پچھے جوگی۔غلام آں نا نکے چھوڑ کے فزری ونجے تے ڈرنی کمنی دیگری نماشان تک کم کرے۔دیہوں لہوے کے نُیں تے گھرے دئیں نسے۔شکر نا کلمہ پڑھے تے ویلے نال ای غلام آں گھینی اگلے اندروڑ کے پکے جندرے کنجیاں مار گنے۔چار پنج دیہاڑے گئی تاں کجھ ڈر جھا کا بی لہہ گیا تے حوصلہ بی ہو گیا جے چوہدریانی ہوری بی مڑنے ای والے ہوسن۔حسو چنگے ویلے آں پئی اڈیکنی ہئی تے بھیڑی لکھت کجھ ہور ای پئی آکھنی ہئی۔ستواں اٹھواں دیہاڑا ہیا نماشاں نی نماز پڑھی گئی برے حسو نہ مڑی۔کفتاں نی نماز بی پڑھی گئی برے حسو نا کوئی پیا نئیواں مُیں۔ڈھوڈ بھس پے گئی۔ہتھوں پچھ ہُتھوں پچھ ہُس نے گھار و یکھ ہُس نے گھار و یکھ،لبنے ونج چڑنے ونج بتیاں گھن کے سارا گراں نکل پیا تے فزر ہوئی تاں پتا لگا جے حسو تاں انھے کھوہے چ ڈھٹھی پئی اے۔آکھنین غلام نی دادی بی اسی انھے کھوہے چ ڈھے کے موئی ہئی۔اُساں بی حویلی چ کویلا ہو گیا ہیا۔ابجوں ای وڈی چوہدریانی اوری آپنے بمار پیو آں مرنائیں تے جیہڑا کمیاں نے گھار جمائیں اس چوہدریاں نی حویلی وینیائی ویناٸیں۔جمیلاں بی آپنے سرمے سکے تے بہوں راکھویں جند جُسے سمیت حویلی وینا پے گیا۔چوہدری مثال تے بی بی زینت اوری بڈھے ہو گئے ہئے تے ہن حویلی چ انہاں نے پُتر چوہدری جلال تے اوہناں نی نونہہ بی بی زرینہ اوراں ناراج ہیا۔

چوہدری جلال اوری تاں پیو کولوں بی چپہ ودھ ای چنگے نکلے۔جمیلاں جیجی نھاتی دھوتی وئی حویلی ونجے اوجی ہی نھاتی دھوتی وئی گھار آ رہوے۔بس بی بی زرینہ اوراں نے اگے پچھے ہونی رہوے تے چوہدری اوراں نا کوئی مزمان آوے تاں سوہنے پچاں وصفاں نال چاہ پانی تے لسی مکھن باہر بھجوا دیوے چوہدری اوراں تاں اس نے ہتھاں نی چاہ چ اوہ لذت آئی جے ہور کینڈھے ہتھاں نی چاہ واں ہتھ ای نانہہ

لاؤن۔سیانے آکھنین پے ناڈنگاویا سوتری کولوں بی ڈرنا رہنائے۔جمیلاں دیگری تک نانہہ آوے تاں غلام نے دلے آں ہتھ پے ونجے۔برے غلام جتنا ڈرپوک ہیا جمیلاں اتنی نڈر ہئی۔غلام بھاویں خفا ای ہوسی برے اوہ خوش باش ہئی۔

غلام نے ویاہے آں پنج چھیں سال ہوگئے برے جاکت کڑی کوئی نانہہ ہویا۔جمیلاں تاں کھکھ پرواہ نئیں ہئی برے غلام آں جھورا جیا لگ گیا تے اوہ کجھ خفا خفا جیہا رہن لگ پیا۔غلام نا ودھی وئی داڑھی ،پُھنڈے وے والاں تے پیلیاں دنداں نال ہسنا جمیلاں اینویں بی چنگا نئیں لگنا ہیا۔اس شکر کیتا جے اس ہاسے کولوں جان چھٹی۔غلام ہر ویلے مونہہ لڑکائی رکھے تے جمیلاں ہر ویلے ہسنی کھیڈنی تے پُھت پُھت کرنی رہوے۔غلام دیہاڑا دیہاڑا گھٹی گیا تے جمیلاں راتی دیہاڑی کھڑنی گئی۔ہک دیہاڑے جمیلاں غلام آں دس بیٹھی جے بی بی اوراں نے گھار جاکت کڑی ہونے والا ئے۔گل دسنیاں اوہ آپ بی دلگیر جئی ہوئی برے غلام آں تاں ایوں لگا جیوں جمیلاں اساں وڈی ساری گاہل کڈھی ہووے۔اگے وت کدے کدے مشکی صبونیں نال نھا کے دھوتے وئے چیڑے پا گینا ہیا ہن اس گلوں بی رہ گیا۔

بی بی زرینہ اوراں شہرے نی وڈی اسپتالاں چ داخل ہونائیں جتھے دائیاں نا کم ڈاکٹرنیاں کرنیاں۔اوہناں نیاں شہروینے نیاں تیاریاں تے غلام نی جان وڑوڑ کے پئی نکلنی اے۔پتا نئیں کتنے دیہاڑے لگن اسپتالاں چ۔چوہدری جلال اوراں تاں کینڈھے ہتھاں نی پکی وئی شے بی نئیں سکھانی۔چنونی دھی پپنو پچھی خاصی روٹی کٹوی کرگینی اے برے چوہدری اوری تاں۔۔۔ بی بی اوراں داخل کرا کے چوہدری اوری مڑ آئے اُن۔۔۔کیہہ بنسی۔۔۔لگی حویلی ،چوہدری اوراں نی ہانڈی روٹی،کویلا تے انھا کھوہ۔غلام آں دادی نی کہانی تے ماؤنی موت یاد آئی تاں اس نیاں چیکاں نکل گئیاں۔۔۔۔۔اللہ نانہہ کرے۔کدے جمیلاں بی۔۔۔۔؟اوہ تاں جینے جوگا نانہہ رہسی۔اج پہلا دیہاڑا ئے چوہدری اوراں نی چاہ روٹی نا۔جمیلاں نماشاں تک نانہہ آئی تاں وت؟۔۔۔برے اوہ مڑ آئی اے۔جینی جاگنی تے ہسنی کھیڈنی۔چوکاں نال روپے بی بدھے وئیں ہتھے چ بھُجیاں ویاں بوٹیاں نا بھانڈا بی چایا ویاس۔غلام کھلیر اس چ ہوگیا۔دوہاں بھُجیاں ویاں بوٹیاں نال روٹی کھاہدی۔جمیلاں نا دل کیتا ہئی غلام آں چتاوے جے چوہدری جلال اوراں نا ویاہ پکیری عمراں چ تے غلام نے ویاہے کولوں پچھے ہویائے تے اج بی بی زرینہ اوری۔۔۔برے ڈرے نال چپ رہی۔اس دسناں کیتا جے ہن اساں

بی جا کت کڑی کھڈانے نا بہوں وڈا شوق اے برے غلام لپیھ ولھیٹ کے سیں رہیا تے جمیلاں نی رات دلیلاں چ لگھ گئی۔اج دوا دیہاڑا۔کلھوکی دیہاڑ،رات تاں خیر خیرانویں لگھ گئی اے۔ پتہ نہیں اج۔۔۔؟اج وت غلام نے دلے آں دھڑ کا لگا ویا ہیا برے جمیلاں تاں اج وت نماشاں نی بانگاں نال آ گئی۔ کلے آر ہسنی کھیڈ نی تے کلے کولوں بہوں خوش۔اج جمیلاں بجرے بجرے پراٹھے تے کگڑے نا لوت آندا تے دوہاں چسکے لا لا کے تے رج کے کھاہدا۔روٹی کھانیاں ای غلام لپیھ ولھیٹ گدا برے جمیلاں پتائیں کیہڑے ویلے تک بتی نی وٹ اچی کر کے تے شیشے اگے بہہ کے نماں نماں مسکنی تے ہولے ہولے گانی رہی۔ ''میں نار پٹولے ورگی۔وے مینوں اکھ وی پٹاری وچ رکھ دے۔جھلی جائے نا نہہ۔جھلی جائے نا نہہ جوانی والی رکھ دے۔وے میں نار پٹولے ورگی۔۔۔۔۔۔''

غلام اجا ستائی پیا ہیا جے جمیلاں اس واسے چاہ بنا کے رکھ چھوڑی تے آپ سویلے ای سویلے حویلی ٹر گئی۔چوہدری اوراں بی تاں ناشتا کرانا ہیا نا!۔۔۔۔جمیلاں نی منجی اتے لگھی شیشہ تے سرخی پوڈر اتے آپنی منجی تلے ٹھڈی چاہ ویکھ کے اوہ حریان بی ہویا تے پرشان بی۔حویلی گیا تاں زینو کولوں پتا لگ گیا جے جمیلاں اتھے ای اے تے چوہدری اوراں واسے ددھ پئی کاڑھنی اے۔دیگری نماشاں تک غلام آں ٹھاہبہ آ گی۔جمیلاں تریئے دیہاڑے بی ہسنی ہسنی تے خیر خیرانویں مڑ آئی تاں غلام آں بہوں وڈی خوشی ہوئی۔اج بہوں دیہاڑیاں پچھوں ذرا جیا ہسا غلام نے پیلیاں دنداں تے نظر پینیاں ای مشالاں نی لاٹاں آر بلنی جمیلاں بھڑک کر کے بجھ گئی۔کجھ سوچ کے وت ہسی برے کتھے اوہ غلابی ہوٹھاں تے موتیاں جئے چٹے دنداں چوں ڈلہہ ڈلہہ پینا اندرے ناہا سا تے کتھے غلام نا دل خوش کرنے واسے ایہہ پھکا تے بے سوادا بناوٹی ہاسا۔چوتھا پنجواں،چھیواں۔غلام ہک ہک دیہاڑا اگننا رہیا تے ست دیہاڑے خیری مہری لگھ گئے۔جمیلاں اُڈنی اُڈنی دیہوں چڑھے کولوں پہلوں ونجے۔اگے میلا نا نہہ ہووے تے اوجی نا اوجی سبھی سہتی وئی پینو زینو اوراں کولوں ذرا چر کیری مڑ آوے۔اگے کیہہ میلا ہونا ہیا۔بھاری سواری کرنی تاں پینو زینو کرنی۔کھوہے تے پانی بھرن ویناں تا پینو زینو ونیاں،پنڈاں چیڑیاں نیان دھون ونیاں تاں پینو زینو ونیاں۔۔۔۔جمیلاں تاں بس بی بی اوراں نے کے چ رہناں تے لوڑ پوے تاں چوہدری اوراں نی خدمت کرنی۔

اٹھوری ہک لگھی تاں شہروں خوشی نی خبر آ گئی۔چوہدری اوراں نے گھار خدا وارث بھیج دتا ہیا۔اج

تاں ساری حویلی ای جمیلاں آر خوشی نال پئی اڈنی ہئی۔ باہر قوبے، شنو، لاہیے، سلوتے خاقے اوراں نے پتر بھتر یئے پئے نچنے ہئے تے اندر پھلاں، چنو، شادو تے حسو اوراں نیا دھیاں نونہاں ہاں۔ باہر بخشے مراثیے نے مزے بنے پئے تے اندر بنی مراثی نے۔ چوہدری جلال اوری باہر وینین تاں اکھیاں نوٹ کے گڈی نوٹاں نی اڈا آنن تے اندر آنن تاں بکی بکی نی اکھی چ اکھ پا کے سراں توں نوٹ واری وینین۔ جمیلاں نے تاں پکیاں سوہریاں ساری حیاتی چ اتنے نوٹ نا نہہ ویکھے ہوسن جتنے اج چوہدری جلال اوراں جمیلاں نے سرے توں وار کے ویلاں چ دے چھوڑے۔ اس خوشی چ نئیں اے گیا تاں غلام۔ چوہدری نی جھولی چ سجرا پھل کھڑا ہیا، برے غلام نے سینے چ کوئی پرانا پھٹ تازہ ہوگیا۔ اس نی جمیلاں بی تے اپنی جمیلاں واسے اساں بی جا کتے کڑی نا چروکناں چاء ہیا۔ لوک حویلی چ نچنے گانے رہے تے اوہ گھار ہکلا بہہ کے رونا کرلانا رہیا۔ اس نے دلوں دعا نکلی۔ ''نیلی چھتری والیا! جیہجوں چوہدری نی جھولی لال پایا ای ایہجوں ای مینڈی جمیلاں بی ہک کھڈوناں چاہ دے۔۔۔'' ہک ایوں دل خفا دوآ خوف۔۔ کیہڑے ویلے ڈھول ڈھمکا مکسی تے کیہڑے ویلے جمیلاں آسی۔ شکرائے بخشے نا ڈھول وجناں بند ہو یائے۔۔ بنی نی ڈوھلکی بی چپ کر گئی اے۔ ہن تاں پینو تے زینو آں آیاں بی بہوں سارا ویلا لگھ گیائے۔ جمیلاں کیوں نئیں پئی آنی۔ سیتی سیتی آں انھے کھوہے نا خیال آوے تے غلام نا دل ڈب ونجے۔ برے شکرائے پینو آکے دس گئی اے جے لوک سارے چلے گین۔ جمیلاں ہن کوئی کوئی چلھ تندوری تاسی۔ کجھ اَن پانی پکاسی تے چوہدری اوراں رجا کے آسی۔ اس نا دل کیتا جے اٹھے تے ونج کے جمیلاں حویلیوں گھن آوے برے اس نیاں تاں لتاں چ ساہ ای نئیں ہیا۔ اس پیر پٹا برے پیراں نال جیوں منیں منیں نیاں تراڑاں بدھیاں ویاں ہیاں۔ حیلہ کرنا ای پیا ہیا جے بوہے نی کھڑک تے کنجی نی شڑنگ ہوئی تے جمیلاں شپ کر کے ویہڑے آوڑی غلام آں سارے دکھ بھل گئے تے کد کے منجی توں اٹھ کھلوتا۔ چوہدری اوراں نوکراں واسے مٹھے تے سلونے چولاں نیاں دیگاں پکوائیاں ہیاں۔ جمیلاں بہوں سارے چول آندے ہئے دوآں رل کے کھادے جمیلاں اجا حویلی نی رونقاں نیاں گلاں کرنی پئی ہئی جے غلام سیں گیا۔

چوہدریانی اوری گھار آ گئے تے جمیلاں چوہدری اوراں نی خدمت چھوڑ کے اونہاں نی خدمت تے لگ پئی۔ ہن جمیلاں ویلے نال مڑ آنی ہئی تے غلام بہوں سکھے چ ہیا۔ چوہدری اوراں نا دھیان بی آپنے

جمال دئیں ہو گیا تے جمیلاں نا کم لوہکا ہو گیا۔ مہینے ترے چار لگھے تاں جیونی دائی غلام آں خوش خبری سنائی۔ غلام تاں خوشی نال اُڈ پیا۔ نیلی چھتری والے سن گِدی ہئی۔ ہن معاملہ ہور ہو گیا۔ غلام خوش تے جمیلاں دلگیر۔ غلام خوشی نال پھُنڈ گیا تے جمیلاں خفگی نال جھونس گئی۔ غلام اساں منجی توں تلے نا نہہ لوہن دیوے۔ جمیلاں کتنے کتنے دیہاڑے حویلی نہ ونجے تے چوہدری اوراں نا سدا بی نا نہہ آوے۔

چوہدری اوراں نا جمال نواں ہک مہیناں نا ہویا تاں جیونی ماؤ نے ہتھاں چ جمیلاں نی دھی جمی۔ چٹی گوری تے موٹی ڈھوٹی۔ گڈی نی گڈی تے ماؤ کولوں ودھ کے سوہنی۔ چوہدری اوراں غلام نے ہتھ گھر وگی گھیو بی بھیجا، ماکھو شکر بی تے کجھ پیسہ ٹکہ بی۔ نال ای آکھ بھیجا جے کڑی نا ناں اوہ آپ آ کے رکھسن۔ وہویں دیہاڑے چوہدری اوری آ گئے۔ کڑی آں ہتھاں تے چایا تے منجی تے بہہ گئے۔ جمیلاں منجی توں اٹھ کے پیراں چ بہہ گئی برے چوہدری اوراں ہتھوں نپ کے منجی تے بہوا چھوڑی۔ کڑی نیاں اکھیاں ماؤ کولوں بی سوہنیاں تے وڈیاں ہیاں۔ اوہناں کڑی نا ناں غزالہ رکھا تے مبارکی دے کے ٹر گئے نال ای آکھ گئے جے جمیلاں نے حویلی آنے نی کوئی لوڑ نئیں۔ جمیلاں والا کم ہن شنونی دھی شکیلاں کر کرسی۔

شہرے چ وڈے کالج نا پرنسپل چوہدری اوراں نا سنگی ہیا۔ اوہناں نے گھروں بی کیں اسکولے چ پڑھانے ہیے۔ چھڑے چھانڈ ہئے نا نہہ دھیا نا پُترا۔ دوئیں ول نوکری تے چلے ونجن تاں گھرے آں جندرا لگ ونجے۔ اوہناں کے واسے صاف سرتھی زنانی لوڑ ہئی تے چوہدری اوراں ایہناں لارا لایا ویا ہیا۔ جمیلاں چلیہا نہاتی تاں چوہدری جلال اوراں غلام آں حکم سنایا جمیلاں ایہناں نے گھار گھن ونجے۔ ہتھ بدھے غلام ڈھل ای نا نہہ لائی دوے دیہاڑے ای ماؤ دھیو آں چوہدریانی آں ملی تے نا نہہ چوہدریانی غزالہ آں ویکھا۔ جمیلاں کوٹھی چ کمرہ مل گیا تے غلام آپنے کوٹھے آں جندرا مار کے چوہدریاں نی کوٹھڑی چ ونج ڈیرا لایا۔ جمیلاں شہر ونج آبادی لائی تے غلام نا دادکا گھار اجڑ گیا۔ جمیلاں نی تنخواہ بی لگ گئی تے چوہدری اوراں بی مہینہ واری بنھ چھوڑی۔ غلام مہینے نے مہینے جمیلاں تے غزالہ واسے خرچہ پٹھہ تے نکا شکا گھن ونجے تے رات دیہاڑ رہ کے مڑ آوے۔ سکھے نی لکھنیاں ڈھل ای کیہڑی لگنی اے۔ اکھی نے پھنکارے چ اٹھاہراں سال لگھ گئے۔ ویکھنیاں ای ویکھنیاں غزالہ جوان ہو گئی۔ بارھاں جماعتاں بی پاس کر گئی تے پڑھی گڑھی وئی شہری کڑی بن گئی۔

ایہناں اٹھاراں سالاں چ گراں تاں گرائیں نال رہیااس نانکے داد کے گرائیں نا راہ بی نانہہ ویکھا برے ماؤ پیو نا گھار ویکھنے واسے لیڑ پائی رکھا۔جاں پیو نال گراں وینے نی ضد کرے تاں ما آکھ چھوڑے ''جس ویلے بی کوئی غمی خوشی ہوئی دھیو آں ضرور کھڑ ساں۔'' پتا نئیں انہاں اٹھاراں سلاں چ گراں خوشی ہوئی ای نئیں یا ماؤ اس کولوں چھپانی رہی۔پیو جاں بی آوے دھی پچھے ابا! گراں کوئی غمی شادی نئیں ہوئی؟ پیو کولوں پہلوں ما آکھ چھوڑے جھلیئے دھیئے! جس دیہاڑے کجھ ہو یا نالے ویساں،''

اج پرنسپل صاحب تے بیگم صاحبہ کمال کوٹ وینے پیئن۔جمیلاں کھڈی چھری نال کوہی وئی ککڑی آر پئی تڑفنی اے۔کدھر صاحب اوری چھوڑ ای نانہہ ونجن۔غزالہ سہیلیاں نال بزار گئی وئی اے۔اللہ جانے کیہڑے ویلے آسی۔صاحب اوری تاں بہوں ابا بلین۔غزالہ اندر وڑنی گئی تاں ماؤ آکھا'' دھیئے ترکھ کر۔گراں وینا ئیں۔'' کڑی چڑی ہئی خوشی نال سہمن سہاون لگ پئی۔اس مسکینی آں کیہہ سہی ہیا جے گراں ماتم ہویا پیاۓ، چوہدری جلال اوراں دلے نا دورہ پیا تے اوہ فوت ہوگئین۔صاحب اورں جمیلاں آکھا اسی مڑ آواں تسی ماء دھی دیہاں چلے ونجو برے جمیلاں اوہناں نے پیرنپ گدے تے ہتھ جوڑ کے منت کیتی۔''صاحب جی! مینڈھا تے غزالہ ناویناں بہوں ضروری اے۔اسی ما دھی انہاں نے نمک خور آں۔دیدن نانہہ کیئی تاں دیہاڑے قیامت نے چوہدری اوراں کیہہ مونہہ وکھاساں۔''غزالہ بی آکھا'' میڈم چراں پچھو کوئی غمی شادی نی خبر آئی اے۔اللہ جانے وت کتنے سال گرائیں چ کجھ نانہہ ہووے۔ما نہہ پیو نا گھار ویکھنے نا بہوں ں وڈا چاء وے۔اج نانہہ گئیاں تاں وت کون کھڑسی۔بیگم صاحبہ اُساں غزالہ تے بی ترس آگیا چوہدری اوراں نی نمک حلال نانہہ نوکریانی نا رونا بی نانہہ ویکھ سکی۔ایہناں صاحب اوراں منا گدا تے اس ماؤ دھیو آں بی ناں گھن گئے۔

حویلی چ غوغا مچا ویاۓ۔نیڑے تریڑے نیاں ملکیانیاں بی بی اوراں نال پلنگھاں تے بیٹھیاں ویاں تے نوکریانیاں پیراں چ بہہ کے وئین پیاں کرنیاں۔جمیلاں سدھی منجی کول ونج پوہچی۔اس کھلیاں وین پائے۔اس نے وین ہوراں نوکریانیاں کولوں کجھ وکھرے تے اوپرے ای ہیئے۔جمیلاں نہوں وین پائے برے دلے نی بھڑاس نانہہ کڈ سکی۔ذرا چپ ہوئی تاں غزالہ پچھا'' امی! ایہہ مینڈھا نا نکا گھار اے؟ جمیلاں سر ہلا کے دسیا۔نئیں۔جھلی کڑی فٹ پچھا'' ابا اوراں نا ئے؟ جمیلاں نی چیک نکل گئی تے اس غزالہ آں سینے نال چموڑ گدا۔وت روئی تے رونیاں رونیاں پتا نئیں کیہہ کجھ آکھنی رہی۔غزالہ نا کن اس نے

مونہیں نے بہوں نیڑے ہیا برے اس نے پلے کجھ نا نہہ پیا۔جمیلاں رودھو کے منجی کولوں ہٹی تاں ڈرے نال کم گئی۔ چوہدر ہانی اوری بڑبڑ غزالہ دائیں پئے تکنے ہئے۔غزالہ نیانی گھٹ تے چوہدریانی زیادہ پئی لگنی ہئی۔جمیلاں غزالہ آں بانہوں نپ کے باہرے دئیں چھکا تے ویڑے چوں نکلنے والی کیتی۔ماء دھی ڈیڈھویں چ پوہچیاں کے نمیں تاں ٹھاہ پٹھاہ غزالہ ناہان کہان تے غزالہ آرای سوہنا ہک جوان نڈھا آن مجاہم ہویا۔غلام اس ناچڑے نافیشنی بکس چایا ویانال اے۔اس فٹ زنانی تے دھیوآں دسا۔''چوہدری جلال اوراں نے صاحبزادے جمال اورین ہنی پئے آنین۔شکراے جنازے آں آن پوہچین۔''غلام گل کرنیاں کرنیاں ہک قدم اگے ودھ کے چوہدری اوراں نے کھبے کھلور ہیا۔جمیلاں جھوکھا کیتا تے غزالہ سلام۔جمیلاں باہر نکلنے واسے دُھوس دتی برے چوہدری جمال تے غلام راہ ڈکی کھلے ہئے۔نکے چوہدری اوراں پیونی موت بھل گئی۔انہاں غزالہ سرے توں پیراں تک تے وت پیراں توں سرے تک مسکنیاں مسکنیاں ویکھا۔منج ذرا کھبے موڑی تے وت سجے پاسے سرے نا اشارہ کر کے ہولے جیا پچھا''ایہہ کون اے تے کینڈھی دھی وے۔''نڈھے نیاں اکھیاں چ چمک ویکھ کے جمیلاں نی اکھیاں اگے،اگے ای ہنیرا جیہا آیا ویا ہیا اے۔جس ویلے غلام چیڑ ا ہو کے چھاتی تے ہتھ مار کے آکھا''ایہہ۔۔۔مینڈھی دھی وے چوہدری جی۔۔مینڈھی۔۔تاں جمیلاں ایوں لگا جیوں اساں آپنی دھیو سمیت کمال کوٹ نے انھے کھوہے چ ڈھٹھیاں اٹھارواں سال ہوگئے ہوون۔

(سہ ماہی قندیل،اٹک ۲۰۰۴)

نام	پروین ملک
ولدیت	ملک فضل داد
پیدائش	۱۸اگست ۱۹۴۷ء
جائے پیدائش	شیں باغ خورد
تعلیم	ایم اے (صحافت)

پروین ملک کے آباواجداد کا تعلق کیمبل پور (اٹک) کے نواحی گاؤں شیں باغ خورد سے ہے۔ان کی ولادت اسی گاؤں میں ہوئی۔ان کے والد گرامی ڈسٹرکٹ بورڈ اٹک میں ملازم رہے۔ والدہ مقامی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھیں۔ پروین ملک نے ابتدائی تعلیم انہیں کے زیرِ سایہ حاصل کی۔ان کا بچپن اسی دیہی ماحول میں گزرا جب وہ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کیمبل پور کالج میں داخل ہوئیں تو اس وقت مخلوط تعلیم تھی تاہم اُس زمانے میں اس ضلع کے دیہی ماحول میں عورتوں میں تعلیم کا رجحان بہت کم تھا۔انہوں نے بی۔اے تک گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) سے تعلیم حاصل کی۔بعد ازں ۱۹۶۸ء میں لاہور تشریف لے گئیں جہاں سے ایم۔اے صحافت کیا۔کہانی سننے اور سنانے کا شوق انہیں بچپن ہی سے تھا ساتھ ہی انہیں بچوں کے رسائل ''تعلیم و تربیت'' اور ''بچوں کی دنیا'' پڑھنے کا موقع میسر آیا اور انہیں کتابیں اور ادب پڑھنے کا لپکا ہوا۔میٹرک تک ابنِ صفی کے ناول تواتر سے پڑھتی رہیں۔گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں ان کی ادبی تربیت پروان چڑھی۔وہ کالج میگزین ''مشعل'' کی طالب علم اڈیٹر بھی رہیں اور اس میں خود بھی لکھتی رہیں۔

۱۹۷۰ء میں انہوں نے صحافت کا آغاز کیا اور ابتدا میں روزنامہ ''آزاد'' لاہور اور ہفت روزہ ''نصرت'' کی سب ایڈیٹر رہیں۔انہوں نے ریڈیو کے لیے فیچر اور ڈرامے لکھے اس دوران ''دکھ سکھ ساڈے'' اور کئی دوسرے کھیل لکھے۔۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۸ء تک ''پنجاب رُت'' کے عنوان سے کالم لکھے اور ریڈیو پر پڑھے

بھی۔اس کے علاوہ ٹیلی ویژن کے لیے ''لمیاں واٹاں'' ''کہیہ جاناں میں کون'' '' نکے نکے دکھ'' ،جج '' اور کئی دیگر سکرین پلے لکھے اس کے ساتھ ہی لاہور ٹیلی ویژن سے ''لکھاری'' کے عنوان سے ایک پروگرام کی میزبانی بھی کرتی رہیں۔

پروین ملک ۱۹۷۳ء میں پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ وزارتِ اطلاعات راولپنڈی میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر رہیں۔۱۹۸۰ء میں ہفت روزہ ''پاک جمہوریت ڈائریکٹوریٹ فلمز اینڈ پبلیکیشنز وزارتِ اطلاعات لاہور کی سب ایڈیٹر رہیں ، بعد ازاں بہ طور ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔۱۹۹۲ء میں پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ وزارتِ اطلاعات لاہور کی ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئیں۔بہ طور چیف اڈیٹر ماہنامہ ''ماہِ نو'' میں بھی کام کیا۔۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک ایک ماہنامہ میگزین ''پلک'' بھی شائع کرتی رہیں۔۱۹۹۵ء میں سارنگ پبلی کیشنز کے نام سے اپنا ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا جس کے زیرِ اہتمام ڈھائی سو سے زائد کتابیں شائع کیں۔بعد ازاں انہوں نے پنجابی ادبی بورڈ میں اپنی خدمات پیش کیں۔پنجابی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں اپنی علاقائی بولی چھاچھی کی مقبول افسانہ نگار ہیں پنجابی کے علاوہ اردو میں ناول لکھنے کے ساتھ تراجم بھی کیے۔پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے ۱۹۹۸ء میں ڈرامہ '' نکے نکے دکھ'' پر انہیں ریجنل ایوارڈ، پنجابی ادبی سوسائٹی کی جانب سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر لکھنے اور میزبانی پر ایواڈ اور کتاب '' نکے نکے دکھ'' پر مسعود کھدر پوش ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔حال ہی میں ''کسیاں ناں پانی'' کے عنوان سے ان کی آپ بیتی منصۂ شہود پر آئی۔

مطبوعات:

۱۔کیہ جاناں میں کون (چھاچھی و پنجابی کہانیاں) ۱۹۸۴ء

۲۔ نکے نکے دکھ (پنجابی کہانیاں) ۲۰۰۴ء

۳۔آدھی عورت (اردو ناول) ۱۹۹۶ء

۴۔سسکتے لوگ (اردو ناول) ۱۹۹۹ء

ترجمہ گاڈ آف سال تھنگز / ارون دھتی رائے

۵۔مائے نی میں کہنوں آکھاں (ناول)

ترجمہ اگلے جنم موہے بیٹانہ کیجو، قرۃ العین حیدر

۶۔ کسیاں دا پانی (جیون کتھا) ۲۰۱۶

ماخذ

سفیر رامہ (مینجنگ اڈیٹر) تماہی سانجھ، پروین ملک، انٹرویو، شاہدہ دلاور شاہ، ۲۰۰۷ء

مسعود ماہلی، ایس بی ایس، پنجابی ریڈیو، (انٹرویو پروین ملک) دسمبر ۲۰۱۴

پروین ملک، کسیاں دا پانی، جیون کتھا، سارنگ پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۶ء

مٹی ناں بت

پروین ملک

سکینہ ــــ۔نی سکینہ۔ــــ۔اٹھ نی کے ویلا ہو گیا۔'' بے بے ایجوں تر پھلاٹ مچایا جے سکینہ تربھک کے اٹھ بیٹھی۔

''کے ہوئیا۔'' اوہ سمجھی پتہ نئیں کوٹھڑی وچوں سپ نکل آئیایا، وچھی کُھل گئی اے تے گائیں نیاں تھناں پے گئی اے۔ پر کجھ بی نئیں ہوئیا ایہا۔ سارے ڈنگر آپنیاں رکلیاں تے بدھے وئے ایہے۔ چلیہانی چوں گوڑھا گوڑھا دھواں نکل کے ہولے ہولے اِدھر اُدھر کھلرنا وینا ایہا۔ ہلے دیہوں نہیں چڑھا ایہا پر چانناں ویکھ کے بیری اتوں چڑیاں چڑ چڑ کرنیاں اُڈی وینیاں ایہاں۔ سکینہ واں کوڑ جیہی چڑھن لگ پئی۔

''توبہ۔ــــ۔چڑیاں کاں جاگنے نہیں جے بے بے رولا پا دینی اے۔ اٹھ نی سکیناں۔ ایڈا سوہنا خواب پئی ویکھنی ایہی آں سارا بھلا دتا س۔'' اوہ اکڑیساں بھنی چیلسانی دئیں ٹر پئی۔

''تدھاں کتنی وار سمجھایا نڈھیاں آرنہ ٹریا کر۔'' بے بے رڑکا چھوڑ کے واز دتی۔ ''آپنی چاچی دئیں ویکھ کیہجوں جند گالیس۔''

''چاچی'' سکینہ دند پیہہ کے ہولے جیہا اتنا آکھ سکی نہیں تاں دل کرنا ایہاس آکھے۔ ''چاچی نی جند گالنے وچ تینڈھا بی بہوں سارا ہتھ اے بے بے۔'' پر اس نی بے بے بہوں جابر ایہی۔ سکینہ تاں سکینہ اس ناں ابا وی بے بے کولوں کن مارنا ایہا۔ اوہ چپنی دھروکنی چلیہانی دئیں چلی گئی۔ چاچی چلہی کول بیٹھی پھوکاں مار مار کے اگ بالنے نی کوشش کرنی پئی ایہی۔

''ہٹ چاچی! تینڈے کولوں اگ نہیں بل سکنی۔ میں بالنی آں۔'' سکینہ دو ترے پھوکاں ماریاں تے گوہیاں تے لکڑیاں وچوں بھڑک کر کے المبا نکل پیا۔ ''تکا ای چاچی۔ اگ ایجوں بلنی اے۔ کدے ٹھڈیاں ساہواں نال بی اگ بلی اے''۔

''ہاں سچ آکھنی ایں پر۔ــــ۔چاچی وت ہک اساس بھریا۔ ہلا ونج توں منہ ہتھ دھو کے آ۔ میں

تینڈ ھے آستے روٹی پکانی آں''۔سکینہ گھڑے وچوں پانی گھن کے کھرے تے آ بیٹھی۔دوروں کدھروں ڈھول وجنے نی واز آنی پئی ایہی شید کوئی جنج چڑھن لگی اے تے وت سکینہ واں پتہ نہیں کیوں ہک پرانی گل یاد آ گئی۔ایجھوں ای واجیاں گاجیاں نال اس نے چاچے ناں ویاہ ہوئیا ایہا۔اوہ گوٹے آلے کپڑے پا کے جنجاں نال گئی ایہی۔جدوں ووہٹی گھر آ گئی تاں سکینہ نی بے بے بسم اللہ کر کے اس ناں گُنھڈ چائیا تے آسے پاسے بیٹھیاں زنانیاں واں ایجھوں لگا جے بجلی جیہی چمک گئی اے۔ووہٹی بی سوہنی ایہی تے اس ناناں بی ماؤ چُن کے رکھا ایہا۔چاننی۔۔۔تھوڑی ڈِھل تاں ساریاں اُبرا ای نہ سکیاں۔اخیر ہکی زنانی نی واز نکلی۔''اللہ ہسنا وسنا رکھس۔ووہٹی تے چنے ناں ٹوٹا وے''۔

''آمین'' سکینہ نی بے بے جواب دتا۔اس توں بعد ساریاں زنانیاں واری واری سلامیاں دینیاں گیئاں پر سکینہ دور بیٹھی ہک سار چاچی دئیں ویکھی گئی۔''سکینہ روٹی پک گئی آ''۔چاچی نی واز آئی تاں سکینہ ناں تراہ جیہا نکل گیا۔اوہ ترکھی ترکھی مونہیں تے پانی نا چھٹا مار کے چاچی کول ونج بیٹھی، پر چاچی کول اجھنا کوئی سوکھا کم نہیں ایہا۔اس نے چیڑے اتنے میلے ہونے ایہے جے تند نہیں دسنی ایہی تے اس نالوں اتنی اوپری جیہی بو آنی ایہی جس ناں نکھیڑا کرنا اوکھا ہو وینا ایہا بئی ایہہ کیہڑی شئی نی بواے۔سکینہ واں اُبت جیہا آ گیا تے اوہ روٹی گھن کے باہر منجی تے آ بیٹھی۔کوئی دیہاڑے ایہے چاچی جس پاسوں لگھ وینی ایہی خشبوئیاں نیں بُلے آنے ایہے۔کدے اوہ گلاب ناں پھل لگنی ایہی تے کدے چمبے ناں بوٹا۔جدوں اوہ ونگاں چھنکانی کوئی کم کرنی پئی ہونی ایہی تاں سکینہ واں اوہ کم بھی سوہنا لگن لگ پینا ایہا۔اوہناں دیہاڑیاں وچ جدوں بی ونگیاری آنی ایہی سکینہ ضد کر کے ونگاں پانی ایہی تے وت چاچی آر اوہناں واں چھنکانے نی کوشش کرنی ایہی پر کوئی دو سال ای لگھے ہوسن جے اس پینگھاں ناں لڑا ای ترٹ گیا جس تے سکینہ نہ چاچی پئی جھوٹنی ایہی۔

چاچا کہیں کے آستے آپنیاں پیراں تے ٹر کے ہسنا کھیڈنا شہر گیا تے دُوئیاں نے موڈھیاں تے مڑ کے آیا۔منجی ویکھ کے چاچی ہک دم مٹی نی مورت بن گئی نہ اس ونگاں بھنیاں نہ وال کھولے نہ وین کیتے۔بس ہوٹھ گھٹ کے جتھے بیٹھی ایہی بیٹھی رہی۔گرائیں نیاں زنانیاں بہتیرا اس نے گلے لگ کے روئیاں تے وین کیتے پر اس نیاں اکھیاں اوجھوں ای سُکیاں رہیاں۔اخیر تھک ہار کے ساریاں ادھر ادھر بہہ رہیاں۔جس ویلے منجی چائی گئی تاں اوہ ساریاں ہکی دوئے نال گوشیاں وچ گلاں کرن لگ

پیاں۔ سکینہ نے کول نیازو نی ماء بیٹھی ایہی آکھن لگی۔ ''جنا کرو یسی''۔ سکینہ واں پہلی وار کوڑ چڑھی۔ ''ایہہ کیوں نہیں رونی۔ دو چار اتھرو کیر چھوڑے تاں کے دسے کدے تاں چاچا گھر چرکا مڑے آ تاں بی رون لگ پینی ایہی۔ جے ایہہ رو پوے تاں ایہناں ساریاں نیاں زباناں تاں بند ہو ونجن''۔ سکینہ نے ابے آ کے چاچی نیں سرے تے ہتھ رکھاتے اکھیاں پونجھنا باہر چلا گیا۔ وت چاچی ناں وڈا ابھرا اندر آیا۔ چاچی نیں پیکے بس بھراؤ ناں دم ای ایہا ہور نہ ما پیو نہ بھین بھرا۔ کوئی بی نہیں ایہا۔ اس آ کے چاچی آں بلایا۔ ''چاننی'' اوہ ہک دم اٹھی تے اس نے گلے لگ کے ڈھائیں مار مار کے رون لگ پئی اوہ ہکی ساہ آکھنی وینی ہئی۔ ''میں ہن کے کراں۔۔۔ میں ہن کے کراں''۔ بھرا آپ بی رونا پیا ایہا اس نے سرے تے ہتھ پھیر کے آکھن لگا۔ ''دھیے بھینے! کاٹھ نی ہانڈی ہکا وارا گی تے چڑھنی اے۔ جیٹھے تے جٹھانی نی خدمت کریں۔ ہن اوہا تینڈے آپنے نیں''۔ اتنا آکھ کے اوہ بی باہر چلا گیا تے چاچی جتھے کھلتی وئی ایہی اوتھے ای ڈھے پئی۔

سکینہ نیں چاچے آں موئیاں بہوں سارا چر ہو گیا ایہا۔ ہن چاچی کم کار بی کرنی ایہی۔ کھانی پینی بی ایہی۔ پر اس ونگاں لاہ کے رکھ چھوڑیاں ایہاں تے کوئی ہاسے آئی گل سن کے اگلے دئیں ایجوں ویکھنی ایہی جے اوہ آپ ای شرمندہ ہو وینا ایہہاں۔

سکینہ ناں ابا سویلے ناں گھروں گیا کدھرے راتی ویلے مڑ کے آناں ایہا نہیں تاں ساری دیہاڑی باہر ڈھوکاں تے ای رہنا ایہا۔ کیوں جے ہلے نے ڈنگر تے گھوڑیاں باہر ہی ہونے ایہے۔ نالے ترے چار بندے جیہڑے واہی راہی آستے سکینہ اوراں کول نوکر ایہے اوہ بی اوتھے ای ہونے ایہے۔ ساری دیہاڑی کوئی ناں کوئی آناں ویناں ای رہنا ایہا اس واسطے سکینہ ناابا کدے کدے ای دیہاڑی ویلے گھر آناں ایہا۔ پر ہن کجھ دیہاڑیاں توں سکینہ نے ابے ناں ٹورا پھیرا گھرے دئیں ودھ گیا ایہا۔ پہلوں تاں اس نی بے بے شید کوئی خیال ای نہیں کیتا پر ہکی دیہاڑے پتہ نہیں کجوں اس نیاں نظراں سکینہ نے ابے نیاں نظراں نے پچھے پچھے ٹرنیاں جتھے اپڑیاں اوتھے چاننی بیٹھی کروشیے نال کجھ بنانی پئی ایہی۔ سکینہ ناں ابا تاں پھر ٹُر کے باہر نکل گیا۔ پر اس نی بے بے ایجوں اندر باہر پھرن لگ پئی جیجوں اس نی کوئی شے گم گئی ہووے۔ کتنے ای دیہاڑے اوہ ایجوں ای رہی۔ تے وت اندر ای اندر کہیں فیصلے تے پہنچ گئی۔

چاچی جس ویلے آپنیاں چیڑیاں آلا بکسا کھولنی ایہی سکینہ آ کے اس نے کول بہہ رہنی ایہی۔ بکسے وچوں

اڈی سوہنی خشبو آنی ایہی تے رنگ برنگے چیڑے چنگے لگنے ایہے جے سکینہ ناں اوتھوں ہٹنے تے دل نہیں کرنا ایہا۔اس دیہاڑے بی چاچی بکسا کھول کے سارے چیڑے باہر کڈھے تے وت اوہناں واں چھنڈ چھنڈ کے بکسے وچ رکھن لگ پئی۔سکینہ کول ای بیٹھی ایہی۔چاچی سادا مقیش آلا چیڑا کھولیا۔

''چاچی!ایہہ چیڑا تدھ کدے بی نہیں سرے تے کیتا۔''

''ہاں سکینہ!''چاچی اوہ چیڑا ہتھے وچ گھن کے اس دئیں ویکھی وینی ایہی وت ہولے ہولے اس نے ہتھ سرے دئیں گئے تے چنے نے آس پاس تاریاں گھیرا پا گھدا۔باہروں پیراں نی واز آئی تے چاچی ہک دم چوراں آر ادھر ادھر تکن لگ پئی۔سکینہ نی بے بُجھ ڈھل بوہے وچ کھلتی رہئی۔وت آکھن لگی ۔''سکینہ توں باہر ونج اساں کوئی گل کرنی ایں۔''چاچی ناں رنگ ہک دم پیلا ہردل ہو گیا تے اوہ چیڑے ناں ہک پلا مروڑن لگ پئی۔سکینہ باہر نکل آئی پر اوہ حیران اہی اج بے بے کیہڑی ایجی گل کرنی ایں جیہڑی اس نے سامنے نہیں ہو سکنی۔اوہ بوہے نال کھلو رہی۔

''چاننی !توں میںنڈی نکی بھینوں بجاویں توں سمجھیں نہ سمجھیں پر میں تینڈے نالوں وڈی آں۔ماہنہ پتہ وے وختے آلیاں کچھوں مٹی نال مٹی ہونا پیناوے۔۔سائیاں خصماں آلیاں دنیا نہیں بخشنی توں تاں ہوئی بے نصیب۔جے ہک واری ماڑا ناں نکل ونجے تاں بندہ نہ دین جوگا نہ دنیا جوگا۔مرداں ناں کے وے اوہناں واں تاں بہتیریاں۔۔۔''

''آپا۔۔۔ہک دم چاچی۔جیجوں چیک ماری۔''ماہنہ معاف کردے ماہنہ معاف کردے۔۔۔۔۔پتہ نہیں اوہ کیڑی گلاں نی معافی پئی منگنی ایہی سکینہ بوہے نی وِتھاں چوں جھاتی ماری۔اس نی بے بے نیاں اکھیاں وچ بی اتھروا یہے اوہ اپنیاں پیراں تے ڈھٹھی وئی چاچی آں پئی اٹھانی ایہی۔

''شودھیے ! تینڈی کوئی وختے جوگی عمر تاں نہیں اہی۔پر اس رب سوہنے نی مرضی۔''

اس دیہاڑے توں بعد چاچی بکسے دئیں نہیں گئی۔ہولے ہولے سکینہ نے ابے نیں گھرے دئیں پھیرے گھٹن گئے پر ہن اوہ گلاں گلاں تے چاچی آں جھڑک چھوڑنا ایہا۔کوئی کم نہ ہوئیا ہووے اوہ جھٹ آکھنا ایہا۔''چاننی جے ایہہ وئے اس کولوں کم کرایا کر ناں ساری دیہاڑی کے کرنی رہنی اے۔''ہک دو واری سکینہ سنیا اوہ اس نی بے بے آں آکھنا پیا ایہا۔

''اس آں زرا دبا کے رکھا کر،جے کوئی وادھا گھاٹا ہو گیا تاں قیامت آلے دیہاڑے میں بھراؤ آں

کے جواب دیساں۔''

تے وت کرنیاں کرنیاں ہوئیا کے جے ودھ 'چونے' رڑ کنے توں گھن کے گوھے تھپسنے تک سارے کم چاچی نے حوالے ہو گئے۔ایجوں اوہ آپے ای ہرویلے کیں نہ کیں کے وچ رجھی ای رہنی ایہی پروت بی سکینہ نے اپے نے متھے توں مچھ نہیں لہنا ایہا۔سکینہ سوچنی ایہی پتہ نہیں چاچی کولوں کے قصور ہو گیا وے ابا اس نال اتنا خفا رہن لگ پیا۔پہلوں تاں اوہ اس تے بہوں خوش ایہا آنیاں وینیاں اس نے سرے تے ہتھ پھیر کے اساس بھرنا ہونا ایہا پر ہن۔۔۔اپے نے غصے جیجوں چاچی ناں رہیا کھیا ساہ بی پی گھدا ایہا۔بولنی تاں اوہ پہلوں بی گھٹ ای ایہی پر ہن اُ کی چپ لگ گئی ایہس۔پر سکینہ واں لگنا ایہا اس نے اندر کوئی دھواں جیہا دھکھنا رہنا وے جیہڑا اس آں سرے توں گھن کے پیراں تک جھلوسی وینا ایہا۔کدے کدے سکینہ واں بہوں کوڑ چڑھنی ایہی۔ایہہ چاچی زندگی ایجوں کیوں پئی کٹنی اے جیجوں عمر قید نی سزا بھگتانی پئی اے۔اس ناں کدے دل نئیں کیتا کدے آپنے چیڑیاں گہنیاں واں ہک نظر ویکھ ای گھنے۔ بوئی ناں بھبکا جیہا آئیا تے سکینہ آپنیاں خیالاں وچوں باہر نکل آئی، چاچی اس نیں کول کھلتی وئی ایہی۔

''سکینہ تر کھ کر۔اندروں کے بہہ رہو۔کدھرے اوہ لوک آ نہ ونجن۔''

''آگئے تاں کیہہ ہوسی۔'' سکینہ انج بے فکری نال بیٹھی وہی ایہی جیجوں اوہ لوک اس آں ویکھنے آستے نئیں پئے آنے۔

''بھیڑی گل اے نا۔اوہ آکھسن کُڑی ایڈی بے شرم ایں جے ساہمنے ای آن بیٹھی اے۔''

''چاچی ہک گل آکھاں؟'' سکینہ ناں دھیان کیں ہوری پاسے ای ایہا۔چاچی پرشان جیہی ہو گئی۔یا اللہ اس کُڑی نیاں کناں وچ تاں ہن تک شرنائیاں وجن لگ پئیاں چاہی نیاں ایہان۔پر ایہہ ایجوں چپ چپیتی بیٹھی اے جیجوں اس سارے معاملے نال اس ناں کوئی واسطہ ای نئیں۔کدھرے کوئی ہور گل تاں نئیں؟ایہہ سوچ کے اس آں کنبنی جیہی آگئی تے اوہ سکینہ نے کول ای منجی تے بہہ گئی۔

''کے گل اے سکینہ توں ہرویلے کے سوچنی رہنی ایں۔''

''چاچی توں نہ منیں مانہہ تینڈھا خیال آنا رہناں وے۔''

''مینڈھا خیال؟'' چاچی حیران رہ گئی۔مینڈھے بارے کے خیال تدھاں آ سکنا وے۔''

''چاچی توں سچ مچ اتنی بھولی ایں یا بھولی بنی ایں۔''

”کے مطلب؟“

”تدھاں کجھ پتہ نئیں دنیا تینڈھے نال کے کیتا۔ ایہناں تینڈے بتے وچوں روح کڈ گدی تے توں ذرا بی نہ بولی۔“

”اللہ نی مرضی ایجوں ای ایہی سکینہ۔ اس وچ بندے شودھے ناں کیہہ دوش۔“

”ایہہ اللہ نی مرضی نہیں۔ اس نیاں بندیاں نی مرضی ایہی۔ مینڈی بے بے تے ابا تینڈ ھا ویاہ نئیں کر سکنے ایہے؟ جے ایہہ نئیں بی کر سکنے ایہے تاں تدھاں جینیاں بندیاں آرتاں رہن دیون آ۔“

”چپ کر سکینہ۔ تدھاں خداناں واسطہ۔“ چاچی نے اتھرواج ڈُلھ ڈُلھ پے پینے ایہے۔ سکینہ نی اواز سن کے اس نی بے بے بی کول آن کھلوتی۔

”کیہہ ہویا ای نی۔ کیوں رولا پایا ویا ای۔“ سکینہ سر اُچا کر کے بے بے دئیں ویکھا کجھ ڈھل اس نیاں اکھیاں وچ اکھیاں پا کے ویکھنی رہی تے وت بولی۔ ”بے بے مانہہ ویکھنے آ ستے کوئی بی نہ آوے۔ منع کر چھوڑ او ہناں واں۔ ایہہ نہ ہووے اتھے مینڈ ھے بی کوئی جیٹھ تے جٹھانی ہون جیہڑے مانہہ جینیاں جی مار چھوڑن۔“

”کے پئی آکھنی ایں نی۔ اللہ نہ کرے تینڈ ھے تے کوئی وادھا گھاٹا بنے۔“ اس نی بے بے ذرا کم جیہی گئی۔

”کیوں میں تینڈی دھی آں تاں واسطے۔ ایہہ کینڈی دھی نہیں ایہی۔۔؟ تساں اس نال کے کیتی اے۔“

سکینہ زندگی وچ پہلی واری بے بے نیاں اکھیاں وچ اکھیاں پا کے گل کرنی پئی ایہی تے چاچی آں ایجوں لگنا پیا ایہا، ایہہ اواز اس نے تتنے نی، منے نی ساری زنگالی لاھی کھڑنی اے۔ اس نی روح قطرہ قطرہ کر کے مڑنی آنی اے تے اوہ ہن نرا مٹی نان بت نہیں۔ جینی جاگنی زنانی بنی وینی اے۔

قصہ کہانی

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
(تعارف صفحہ ۱۵۳)

مکنی گل ای اے کہ میں کدے بی اُدھار گھن کے واپس نہیں کیتا۔ میرا خیال ہیا اُدھار گھِدا ای اس واسے وینا کہ واپس نہ کیتا جلے۔ میں پچھلے پنجاں سالاں نی بیکاری نے دِناں وچ اتنا اک اُدھار گھن چکا واں کہ واپس کرنے تے آواں تاں اگلے پنج سال بھُکھا بیٹھا رہواں۔ برے اج میں ستاہراں روپیاں نا منی آڈر بھیج کے دو سال پہلوں کھاہدے ہوئے اُدھار کھانے نا بل ادا کرنا چاہناں، صرف ہِک بل جس نا کدے کسی نہیں پُچھا۔ برے جس مانہہ ہر ویلے اپُٹھا لٹکائی رکھا ہیا۔

ہن اُس ہوٹلے ناں پتہ مانہہ پوری طرح یاد نہیں رہیا، برے میں ای جاننا کہ ایہہ پیسے اُساں پوہنچ ویسن۔ میرے جیہا بندہ اس نے پیسے نہیں مار سکا تاں ہور کوئی نہیں مار سکنا۔ گُجھ عرصہ پہلوں اس شہر چوں آنیاں آخری دیہاڑے، کاونٹر تے پئے ہوئے رجسٹر تے دستخط کرنیاں، میں اُس نال جھوٹھا وعدہ کیتا ہیا کہ گھار پوہنچیاں ای سارے پیسے بھجوا دیساں، تے اُس جواب دتا ہیا۔ اوہ یرا میرے پیسے کدھر نہیں وینے۔ بے غم رہو۔ میرے ہوئے تے آپے پوہنچ ویسن۔ تے میں اس ویلے سوچیا ہیا۔ ''توں بی بے غم رہو۔ میں کدے اُدھار واپس کرنے واسے نہیں گھِدا۔'' برے اج پہلی تنخواہ لبھی اے تاں اوہ یاد آیا اے۔ میں اپُٹھا لٹکیا ہویا اُس ناں پتہ یاد کرناں۔

میں اپنے آپ اَں اج پہلی واری اتنا کمزور پیا ویکھناں میں اس تنخواہ چوں ہِک پیسہ بی اُدھار لاہنے چ ضائع نہیں کرنا چاہناں۔ برے کیہ کراں میں بے بس آں تے اوہ پیا آکھنا اے ''یرا میرے پیسے کدھر نہیں وینے۔''

اج تنخواہ گھِننے ویلے دستخط کرنیاں مانہہ اُس نے کاوَنٹر تے پئے ہوئے رجسٹر نے دستخطاں، وت ہِک واری سرے نے بھار کر دیتا اے، میں اُس نے ہوٹلے وچ اپنا پہلا دیہاڑا یاد کرناں واں۔ اس دیہاڑے

کسی پاسوں روٹی نی درک نہیں ہئی تے میں اس شہر ناں ماتر پُتر ہِکی نکی جیہی بند ہٹی نی مُہاٹھاں تے بیٹھا ہویاں اس ہوٹلے نے اندر باہر ہونیاں لوکاں واں پیا ویکھنا ہیاں۔ پتہ نہیں کِجھوں تے رکیہ سوچ کے میں بی اندر وڑ گیا ہیاں تے رج کے روٹی کھادی ہئی۔ بعد وچ چاء پی کے آرام نال کاؤنٹر نے کولوں ہو کے باہر نکل آیاں۔ اس بی پچھوں واز نہیں دتی۔ میں پورے ست دیہاڑے روٹی کھانا رہیاں تے اس جنے نے پُتر ے پرتایا نہیں۔

آخری دیہاڑے میں آپ ای کاؤنٹر تے کھلو گیاں۔ اوہ مانہہ کھلوتا ویکھ کے دوئے پاسے ویکھنے آں لگ پیا۔۔۔''میں گھار پونہچنیاں ای سارے پیسے بھجوا دیساں۔''

''اوہ یرا میرے پیسے کدے آپے پونہچ ویسن۔''

میں اُتھے ہِکی سنگھیے نال گل کیتی تاں ہس پیا، آکھن لگا:

''میں تاں ئدا اں پہلوں دسا ای نہیں ہیا کہ غریب نا بال مارا ویسی۔ سچ پُچھیں تاں ویلے بے ویلے میں بی اُتھوں ای پیا کھاناں۔ برے یار لوک اُکھنائے۔ اوہ اپنا کھادا پیتا جدوں چاہوے رکھا گھنے۔

وت اُس مانہہ ہِک کہانی سنائی کہ ہوٹلے والے ناہِکا پُتر ہیا۔ عُمر ہوسیں کوئی ستاہراں سال۔ بڑا سوہنا۔۔۔۔اوہ گم گیا۔ پورے پندھراں دیہاڑیاں بعد شہر نے ہِکی بند مکانے چوں ہِک لاش لبھی، بالکل ننگی۔ شناخت کرنے تے پتہ لگا کہ اسی ناپُتر اے۔ لوکاں نا ٹھاٹھاں مارنا سمندر، جس وچ اوہ ہِکلا، ہر بندے نے موہیں دائیں پیا ویکھنا ہیا۔ کسی بندے اس نی اکھی چوں اتھرو کرنیاں نہیں دیکھا ہِکا چُپ۔ رولا پیا۔ پُلس والیاں پُچھ گُچھ کیتی۔ اس تُوں پُچھا گیا کہ کسی تے شک اُ گیا تاں دس۔ اوہ آکھن لگا۔''میری کسی نال دشمنی نہیں، میں کس تے شک کراں؟''

کُجھ لوکاں واں اسی نے ہوٹلے تے کم کرنے والے ہِکی بڈھے نوکرے تے شک ہیا۔ برے اس نا ہِکا جواب ہیا:''میں کس تے شک کراں۔ اس بندے تاں میرے پُترے آں اپنے ہتھاں وچ کھڈایا اے۔ ای اس نے پیونی جاگھاں اے۔ تسی آپ دسو میں اس تے کِجھوں شک کراں؟''

گل پرانی ہوگئی تے لوک بُھل بُھلا گئے۔

اوہ نوکر چپ چپ ہون لگا۔ ویکھنیاں ویکھنیاں اس نے سرے نے سارے وال چٹے ہو گئے تے

لوکاں چاء دینیاں اس نے ہتھ کمن لگے۔

ہکی دیہاڑے اوہ صبح ہوٹلے تے آیا۔شامیں محلے نیاں بندیاں واں اس نی کوٹھڑی چوں اُس نی لاش لبھی۔اس ہوٹلے نی ای چھری نال اپنی گچی لاٹی ہئی۔اس موتاں نے گواہ محلے نے نِکے نِکے دو بچے ہئے جینہاں نے سامنے دیہاڑی ویلے اس مرنیاں اقرار کیتا کہ ہوٹلے والے نے پُترے نا قاتل میں ای آں۔

اس گلاں بڑے دیہاڑے ہوگئے نیں۔ویکھ کے دسو میرے سرے نے وال چٹے تے نہیں ہئے ہونے۔میں کمنیاں ہتھاں نال منی آڈر لکھناں۔

نام	لیاقت خان
قلمی نام	لیاقت سیماب
ولدیت	سکندر خان
پیدائش	۱۴ اپریل ۱۹۵۵ء
تعلیم	ایم اے پنجابی

اصل نام لیاقت خان ہے۔۱۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو اٹک شہر کی نواحی بستی شکر درہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام سکندر خان ہے۔پنجابی میں ایم اے کیا۔پنجابی شعر و ادب میں خصوصی دلچسپی رہی اور اسی زبان میں لکھنے کو ترجیح دی۔

ادبی سفر کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کیا ابتدائی طور پر بہ طور پنجابی شاعر مقامی ادبی حلقوں کی شعری و تنقیدی اجلاسوں میں شمولیت اختیار کی بعد ازاں مقامی بولی میں افسانے لکھے۔ان کے افسانے سہ ماہی ''قندیل'' میں پنجاب رنگ کے گوشہ میں شائع ہوئے۔ملازمتی زندگی میں بہ طور مدرس خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اٹک سے لیکچرار اسسٹنٹ ریٹائر ہوئے۔

پنجابی زبان میں افسانوی مجموعہ ''کچیاں تنداں'' اور جل بن مچھلی مجموعہ شعر زیرِ ترتیب ہے۔کئی بار ان کے داماد کی معرفت ان کے مکمل کوائف حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن مایوسی کا سامنا رہا۔ان سے متعلق یہ مختصر سی معلومات ''تذکرہ شعرائے اٹک'' سے اخذ کی گئی ہیں۔

مطبوعات: قفس اُداس ہے (مرتب مجموعہ شعر، شیر بہادر پنچھی)

کچیاں تنداں

لیاقت سیماب

دوروں ڈھولکی نی اواز تے پئی آنی ہئی پر جس ویلے ڈھول گجا تاں اس نی دھمک مینڈے دلے وچ لگی پتہ نئی جے میں مکھن بابے نے پترے نے ویاہ تے وینے واسے کیوں اتنا اُبا ہلاتھی پیا۔

ویہڑے وچ نڑیاں تے ساوے پتراں اوتے گرائیں نے سارے لوک سب سیت کے چوکیاں بنا کے اپٹھے وئے ایہے۔ میں بی ہک چوکی نال اج ریا تے روٹی ورتانے والیاں مینڈھے ساہمنے لوتے ناں طباق تے ٹکرے نی نوکری آرکھی۔ میں مضمان ای سہی پر وت بی روٹی کھا کے مہراجے آں سلامی دینا بی تاں ضروری ایہا۔ میں پُچھا بئی مہراج کتھے وے۔ تاں ہک بندے مکھن بابے دئیں اشارہ کیتا جیہڑا ڈھولے نے ڈنے تے بر بَلا کھیڈنا پیا ایہا۔ مانہہ اوپرا جیہا وکھ کے اوہ مینڈھے کول آیا تے مانہہ لاڈے نال جالاہ گِدا۔ ہک نِکا جیہا جاکت جیہڑا مَسے پنجاں اک سالاں ناں ہوسی، رتہ چیڑا ولیہٹا وئیا، بانہواں وچ گائیاں ناں چھج، سرے تے پھُمڑیاں والا سہرا تے ہتھے وچ لوہے نی کھونڈی نپی وئی ایہی جس وچ لوہے نے چھلے پئے چھنکنے ایہے تے ہک ہور بندے نے موہڈیاں تے اپٹھاویا ایہا۔ مانہہ دسا گیا بئی اے مکھن بابے ناں پُتر باز خان اے تے اسے ناں ای ویاہ اے۔ اتنی نکی جیہی عمراں چ ویاہ، میں حیران تاں ہویاں پر اس ویلے مینڈھی حیرتِ چَک گئی جدوں ایہہ گل میں سنی بئی بوہٹی نی عمر تریہہ سال اے۔ مینڈھا منہ کھلا ناں کھلا رہ گیا تے ہور کجھ پُچھن جوگا نہ رئیا۔

گل کھلی بئی بوہٹی پہلوں بی مکھن بابے نی نونہہ ایہی۔ جس ناں ویاہ یاہراں سال پہلوں مکھن بابے نے پُترے سلیم نال ہوئیا ایہا تے ویاہے نے چھ مہینے پچھوں سلیم تے اس نی ماء دووئیں ہک حادثے چ مر گئے۔ جوان پُترے نی منجی گھروں نکلی تاں مکھن بابا گوڈیاں بھار ڈھٹھا۔ اس دنیا تے سوائے ہک پُترے نے ہور کورا ایہا۔ سلیم ای تاں اس نے بڈھپے نی ٹیک تے اکھیاں نی لو ایہا۔

سٹھ سالاں نی عمراں وچ اوہ ایہجا سوڑ کیہجوں سہہ سکنا ایہا۔ جوان پُتر ے نی موتاں ماپیو ناں لک تروڑ دینی اے تے ایہجا دکھ تاں خدا کالے کافراں بی نہ دیوے۔ مکھن بابے آں سرت آئی اس نی نونہہ حمیداں پواندی اجھ کے اس نیاں تلیاں پئی ملنی ایہی۔ ''سر تاں چا ابا'' حمیدہ اساں تسلی دتی ''میں جدوں تائیں جینی آں تینڈ ھے موہڈ ھے نال موہڈ ھا لا کے کھلساں تینڈ ھا پُتر بن کے تینڈ ھے نال رہساں۔'' حیمداں اُساں ڈاہڈی دل بھری بھنائی۔

ہک ویلا آیا جے حمیداں نے ماپیو سوچن لگ پئے بئی دھیاں نی ذات اے جوان جہان کوئی رنڈ یپا کیہجوں کٹسی جوانی وچ رنڈ یپا تاں جیوں پہاڑے آں دھکا دینا اے۔ برادری نے چار جی اکٹھے تھی کے مکھن بابے کول گئے بئی اوہ حمیداں اس نے ماپیو نال ٹور دیوے۔ اس شوہدھے ناں کیہڑا وس چلنا ایہا۔ بس سر سٹ کے رون لگ پیا۔ حمیداں چپ چپیتی سر جنوآں تے رکھ کے سنی پئی ایہی۔ دھیاں تاں موئی وئی مجھی ہونیاں نیں، اگی وچ سٹو یا پانیے وچ ایہناں کیہڑا رعذر اے۔ دھیاں ماپیو نے گھار ہوون تاں ایہناں نیاں خدمت گار سوہر یجے گیاں تاں اوہناں نیاں تابعدار، وفا کرنا تاں ایہناں وچ کُٹ کُٹ کے بھرا ہویا اے جرگے ناں فیصلہ سن کے حمیداں موئی وئی مجھی توں مچھری وئی شیرنی بن گئی اس جنوآں توں سر چایا تے جرگے نے سواں کھل گئی۔

''بھانویں اُتا تھلے تے تھلا اُتے تھی ونجے میں مکھن بابے آں لگا سٹ کے کیں پاسے نہ ویساں۔'' ایہجوں لگنا پیا ایہا جیہجوں اس نے اندر ڈھاڈی بلنی پئی ہووے اس نیاں اکھیاں وچوں جیوں اوانڈے پئے نکلنے ہوون۔ اپنے پیو نے موہڈیاں تے سر رکھ رورو کے اس ندیاں نیل چاڑھ دتے رورو کے جدوں دلے نی ہواڑ کسی تھی تے پیونی جھولی وچ سر سٹ دتا تے اپنے پیو آں یاد دیوایا اس ای آکھیا ایہا بئی جتھے اس نی ڈولی پئی وینی اے منجی وی اسے ای گھروں نکلسی تے ہن اوہ اتھے ای جیسی تے اتھے ہی مرسی۔ بھانویں دنیا دوتھی ونجے میں مکھن بابے آں سٹ کے کیں پاسے نہ ویسی۔ جرگے والیاں ناں تراہ نکل گیا ایڈی شرماکل تے چُپ چپیتی کڑی وچ اتنی جرآت کتھوں آ گئی اے۔ تے چھیکڑ حمیداں سوہرے نے کول ای رہ گئی۔

ویلا حمیداں تے مکھن نے پھٹاں تے پھاہے رکھنا رئیا تے سلیم ناں پہلا ورہا آ گیا۔ اس راتی حمیداں ڈاہڈی کُس چڑھی جس نال اس ناں حُبشہ بلن لگ پیا۔ مکھن بابے آں ہتھ پیر پے گئے۔ اوہ حمیداں

ناں سراپنی جھولی وچ رکھ کے دبانا ریا مکھن جدوں وی پُتر ے ناں ورھا آوے تاں حمیداں آپنے کول ہجا کے اپنا سوڑ گلاں نال کڈھ چھوڑے پر پانی نی تریہہ دودھے نال تاں نئیں لاہنی، وت بی اوہ سب کجھ وسار کے حمیداں نے کھاہڑے لگا رہیا تے پترے نے رولے گھٹ تھینے گئے۔۔۔۔۔سیانے آکھنے نیں ہئ زمین نا منہ بہوں ٹھنڈا ہوناوے۔

حمیداں کجھ سُرت آئی اوہ اوکھاں نال اٹھ کے اجھ رئی ''بابا میں تداں کتنی کو چنگی لگنی آں۔'' مکھن دھاڑا دھاڑا کر کے رون لگ پیا 'دھیے اے وی کوئی پچھن والی گل اے۔'' اوہ ذرا سنبھلا ''مینڈ ھے بُتے وچ تاں تینڈ ھے نال ای ساہ اے۔تداں کجھ تھی گیا تاں میں اُکا ہی مک ویساں پر گل کی اے ٹد مینڈ ھے کولوں اے کیوں پچھاوے'' حمیداں نی اکھیاں تاڑے لگ گیاں تے ہک واری وت اوہ بے سرت تھی گئی مکھن دوڑ کے پانی نا بٹھل بھر آندا تے حمیداں نے سرے تلے ٹیک دے کے اُساں کھلا کیتا حمیداں اکھیاں پٹیاں تے ہکا چھیک لا کے بٹھل بھرا ویا پی گئی ''بابا میں تینڈ ھے کول ہک شرط تے رہ سکنی آں'' حمیداں نے منہ تے نکی جئ ویسی آ گئی۔سلیم نے مرن توں پچھوں اج پہلی واری اوہ ذرا جئ ہسی ایہی۔مکھن آں کوئی ات گت نئیں پئی آنی ایہی ہئ حمیداں کی واویلیاں پئی مارنی اے۔'' بابا پتہ ای ہئ میں کیوں تینڈ ھے کول رہ پئی آں۔'' حمیداں ناجھک تھی مکھن نے ساہمنے اجھ رئی تے اس نے جواب دینے کولوں پہلوں ای اُبر پئی ''باباتوں ویاہ کر گن'' ایہہ سن کے مکھن نے پیراں تھلوں زمی نکل گئی تے اس ناں اُتا ساہ اُتے، تے تھلا ساہ تھلے رہ گیا'' حمیداں جھلی تاں نئیں تھی گئی ایں میں کوئی ویائے جوگا آں۔'' اس نی گل گلے وچ پھس گئی ''پُتر میں تداں کوئی اوکھ سوڑ تاں نئیں دتا تے وت۔۔۔۔''

''وت کجھ بی نئیں بس میں جیہڑی گل متھی وئی اے اوہائی ہوسی۔'' حمیداں ہک نویں عزم نال گل کیتی۔'' بابا گل ایہہ وے ہئ ایجھوں حیاتی کدوں تائیں گذرسی۔اللہ نے دیونہہ پھیروین نئیں۔جے اللہ تداں کوئی پُتر چا دیوے تاں اساں دوہاں نی حیاتی سکھلی کٹ وینجے۔

مکھن ناتراہ نکل گیا ہئ حمیداں جئ بھولی تے شرماکل کڑی چ اتنی جرأت کیجھوں پئے گئی تے دوئی گل ایہہ وے ہئ میں تاں اپھل بوٹا واں جساں ہن کوئی بور وی نئیں لگ سکنا تریٹھ سالاں ناں بڈھا تاں ہن کھاہڈا ایٹھا تے نالے اس بڈھیپے وچ مانہہ کور پچھسی الٹا لوکاں نیاں گلاں بن ویسن۔زمانہ تاں کھوتے نی مثال اے اگوں لنگوتاں چک پانا تے پچھوں لنگوتاں لت مارسی۔پر حمیداں آپنی این منوا کے

رہئی۔

چھپے کنے مکھن ناں ویاہ تھی گیا۔اللہ کول کوئی تھوہڑ تاں نئیں نالے نیت صاف تے بیڑے پار۔ہئی بھئی تے ہکا گل پئی تھینی ائی، رہنے سیانے آکھنے نیں ہئ دکھ دکھیئے تے سکھ سکھیئے۔چھیکڑوں مکھن آں حمیداں نی ضداں اگے سر سٹنا پیا تے اپھل بوٹے آں ہک واری وت بور لگ گیا۔۔۔باز خان نے جمن توں پچھوں حمیداں نی جوانی ناں دریا چھلاں مارن لگ پیا۔اوہ باز خان آں کُھڑ چا کے کھڈانی رئی۔۔۔پنج سال لنگھ گئے۔۔۔حمیداں نے جبے وچ نویں جئ تڑ آئی۔اس جھلی کچی تنداں نال ونج جھوٹا کھادا تے پریت نی ایہہ کچی تند پہلے اُلارے نال ای ترٹ گئی۔باز خان نے ویاہے توں کوئی ست سال پچھوں مکھن بابے نیاں اکھیاں نوٹیاں گئیاں۔حمیداں ہک اولی جئ ہاڑ لا کے جینی پئی ائی۔باز خان جدوں اٹھاراں سالاں ناں ہویا تاں حمیداں پنجتالیاں نے گیڑے وچ ونج رئی۔

تقدیر کیں پھر ول کے ویکھی، ایہہ تاں انھاں کھوہ اے، اس نے گیڑے وچ لکھاں گئے مُڑ نظر نئیں آئے۔حمیداں وی اسی گیڑے وچ پھس گئی۔

باز خان پر کڈھے تاں اُساں اُڈنے نیں چج بی آگئے، اس سوچیا ہئ بڈھی حمیداں نال اس ناں گزارہ کیجوں ہوسی۔اخیر اوہ حمیداں تقدیر نے انھے کھوہے وچ دھکا دے کے آپ بجری چھانواں تلے ونج ایٹھا تے پچھے مُڑ کے نئیں ویکھا ہئ جس اپنی پہاڑ جئ جوانی اس واسے لکھ کر چھوڑی اوہ کیہڑے پاسے ویسی تے کیہڑے کڈھے لگسی۔حمیداں بہوں ترلے منتاں کیتیاں ہئ اس تے ایہہ ظلم نہ کر، پر اس ہک نئیں سنی۔

جس راتی باز خان دُعا بھنائی اس راتی حمیداں منجی نی دون کڈھ کے پھاہ پا کے مر گئی۔اپنیاں ساریاں سدھراں تے چاء، جہاں واسے اپنی ساری جوانی گال سٹی اُیہس اپنے نال ای گھن گئی۔دوئے دیہاڑے سویلاں باز خان نی نویں ووہٹی نی ڈولی پئی آنی ایہی تے اوسے راہے تے حمیداں نی منجی پئی وینی ایہی۔

(سہ ماہی قندیل اٹک، ۲۰۰۲ء)

نام	محمد مشتاق چغتائی
قلمی نام	توقیر چغتائی
ولدیت	مولانا حافظ عبدالقیوم
پیدائش	۱۳مئی ۱۹۶۱ء
جائے پیدائش	بوٹا گاؤں (اٹک)
تعلیم	ایم۔اے

ان کے اباؤ اجداد کا تعلق اٹک کی نوائی بستی بوٹا سے ہے یہیں ان کا بچپن گزرا اور پرائمری تک اسی گاؤں کے ایک سکول میں پڑھا آٹھویں گورنمنٹ مڈل اسکول اکھوڑی سے پاس کی اور پھر گورنمنٹ پائلٹ سکینڈری سکول اٹک میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے دسویں جماعت کی سند حاصل کی۔ایف۔اے کے بعد پرائیویٹ طور پر کراچی یونی ورسٹی سے بی۔اے کیا۔ایم۔اے کی ڈگری ماس کمیونیکیشن میں وفاقی اردو یونی ورسٹی کراچی سے حاصل کی۔کچھ عرصہ پرائیویٹ طور پر کراچی میں کام کیا بعد میں نیوی میں ملازمت کی۔پنجابی زبان کے مقبول شاعر اور کہانی کار ہیں پنجابی کے علاوہ اردو میں بھی لکھا لیکن ان کی پہچان پنجابی ادب ہے۔ان کا پہلا پنجابی افسانہ ۱۹۸۰ء کو پنجابی رسالہ ''لہراں'' میں شائع ہوا۔نوے کی دہائی میں امرتا پریتم نے ان کے افسانوں کو اپنے رسالہ ''ناگ منی'' میں شائع کرنا شروع کیا تو بہ طور کہانی کار ان کی پہچان انڈو پاک میں بنی۔بعد ازاں امرتا پریتم نے ہی ان کی کتاب چھاپی جس کا دوسرا ایڈیشن بھی حال ہی میں انڈیا میں شائع ہوا۔ان کی پنجابی نظم و نثر ''تماہی پنجابی ادب'' ''سانجھ'' ''پنجابی'' ''لہراں'' پاکستان اور ''ناگ منی'' ''اجیت'' ''نواں زمانہ'' ''آرسی'' اور ''پریت لاری'' انڈیا کے رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔اس کے علاوہ ان کی اردو تخلیقات ادب لطیف، فنون، اوراق، الفاظ، سیپ وغیرہ میں بھی چھپیں۔انہوں نے کراچی تھیٹر کے لیے لکھا بھی اور ان میں اداکاری بھی کی۔۱۹۹۰ء میں علی رضی کے ساتھ کراچی ٹیلی ویژن میں ''سچی کہانیوں'' کے عنوان سے

ڈراموں میں کام کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دیں ۱۹۸۹ء میں حضرو ضلع اٹک سے شائع ہونے والے علمی وادبی رسالہ ''سماج'' میں کراچی سے معاون مدیر کے طور پر کام کیا۔کراچی سے ''وَنجھلی رُت'' اور ''وارث شاہ'' کے نام سے پنجابی رسالہ نکالا۔۱۹۹۰ء سے بارہ سال تک کراچی سے شائع ہونے والے سیاسی ،ادبی وسماجی رسالہ ''جفاکش'' کے اڈیٹر رہے۔تین سال تک روز نامہ ایکسپریس کراچی کے اڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ایک سال ''المشرق'' میگزین اسلام آباد کے اڈیٹر، جون ایلیا اور زاہدہ حنا کے ساتھ ''روشن خیال'' میں کام کے علاوہ ماہنامہ ''باغ'' کراچی ،قومی اخبار کراچی اور کچھ دیگر اخبارات ورسائل کے ساتھ بھی منسلک رہے۔سماء ٹی وی کے علاوہ گزشتہ چند سال سے ایف ایم ریڈیو کراچی سے اپنے علاقائی لہجے میں ''اپنی دھرتی اپنے لوگ'' کے عنوان سے ایک پروگرام کر رہے ہیں۔ان کے پنجابی افسانوں کی کتاب اخیرلا ہنجو پر انڈیا کی ایک یونی ورسٹی میں ایم اے کا مقالہ لکھا گیا اور ایک افسانے کو یونی ورسٹی کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

مطبوعات:

۱۔تمارا خط نہیں آیا (اردو شاعری)

۲۔وچھوڑا (پنجابی شاعری)

۳۔ولوہنا (پنجابی شاعری)

۴۔اخیرلا ہنجو (افسانے)

۵۔نور جہاں (گلوکارہ نور جہاں کی حالاتِ زندگی پر مبنی

۶۔نور جہاں (انڈیا میں ہندی اور پنجابی زبان میں دو ایڈیشن)

۷۔روشن خیال لوگ (معروف شخصیات کے انٹرویو)

ڈولی

توقیر چغتائی

ایجوں لگنا وے جیوں بس آ گئی وے۔۔۔۔۔

نئیں اوے جَنیا ایویں دھوڑ جئی اے۔ مانہہ لگنا وے جیجوں ولو ہنا آیا وے

نئیں نئیں بس ای لگنی وے۔

باہر ونج کے کھیڈو! ہٹوا وے ونج کے جا کتاں منجی توں لاو۔ کیہ ید پائی وئی نے؟

چٹیاں چادراں گندیاں کر چھوڑیاں نے۔ جو جمعے جمعراتی ناحرامی اے اتھے آن وڑا وے۔ ایہناں سرہاندیاں نے اچھاڑاں تُساں نی ماں دھوسی؟

یرا ماما چھوڑ نا سبھ ٹھیک ہو ونجسی۔ توں کیوں گھبرا نا ویں۔ اندر ونج کے کڑیاں آکھ جنج آ گئی اے۔ تیاری کر کے رکھن، نالے ہاں بچ روٹی ورتا نے واسے کسے وڈیری آں ہجا ویں۔ ای جا کتیاں حرانبڑاں بیرے آپ کھاونجسن تے پانی مزماناں پادیسن۔

مانہہ تاں سمجھ نئیں آنی پئی۔ ایڈی وڈی جنج کیجوں سانبھساں؟ یرا تکیا ونجسی۔ میں ایہناں پہلوای آکھیا ایا بندے اج تھوڑے ای آنیو، میرے کول کیہ وے؟ کڑی وے یا زمی ویچ کے تھوڑا ابہوں جو کجھ بنایا وے۔"

اسلام لیکم!

والیکم سلام

ایہہ کڑی ناپیو وے شیر عالم۔ خان جی!

ایہنا نیاں دو بساں، چار ٹرک تے دو ویگناں، پنڈی توں اٹک چلنیاں نے۔ نالے وڈا جا کت ولایت ہونا وے۔ اساں اج جنج اِنھاں نی گڈی تے آندی اے۔

"لکھو منجیاں تے بہو، جو جوح جوارائے میں حاضر کرناں۔ بسم اللہ جی

گل سنواوے جاکتو !

ہاں لالہ دس

آپنی بھیئوں نی ڈولی تسی آپ جا کے بستاں کول کھڑیو۔ مانہہ چنگا نہیں لگنا جے مینڈی دھیئو نی ڈولی کوئی ہور جاوے۔

ہلا لالہ اسی آپ کھڑساں۔

سناؤ بھائی کسی شئی نی کمی تاں نہیں نا؟

نہیں جاچا ہن اساں رخصت کر۔ اساں بنوں دور ونجناوے۔

توں پلنگھ جااوے۔

توں بسترے۔

توں ٹی وی تے وی سی آر۔

تے تسی پکھے نالے واشنگ مشین۔۔۔

بس پتر ہتھے ڈولی رکھ چھوڑو تے پہلوں سمان بساں چے سٹاؤ۔ آپنے جاکت حرامی آکھا ای نہیں سننے، نالے ہنیر ابی ودھنا پیاوے۔

سبھ کجھ رکھ چھوڑا نیں؟

ہاں رکھ چھوڑاوے۔

چنگا پتر اسی ونجنے آں۔

چنگا ونجو رب سوہنے نے حوالے۔

اللہ خیر کرے لالہ، بس بنھوں تیز پئے چلانے نوں۔

اللہ تساں نی بھینوآں سُکھ دیوے پُتر۔ چلوایہہ ڈولی چاؤ جے گھار ونجاں۔

ڈولی بھاری کیوں اے؟

اندر میں بیٹھی آں۔

برے کیوں فضیلت؟

تسیں بہوں خُش او جے مانہہ چوکھا سامان دتا نیں تے میںڈے ویرو ! اوہ بہوں خُش نوں جے اُنہاں بنھوں سمان لبھ گیا وے۔ پر ونجیاں ونجیاں اوہ مانہہ کھڑنا بھُل گئے نوں۔ جے میں بی کوئی بھانڈا شانڈا ہوونی تاں مانہہ بی گھن ونجن آ۔

(چھماہی ونگاں، اٹک جنوری توں جون ۲۰۱۷ء)
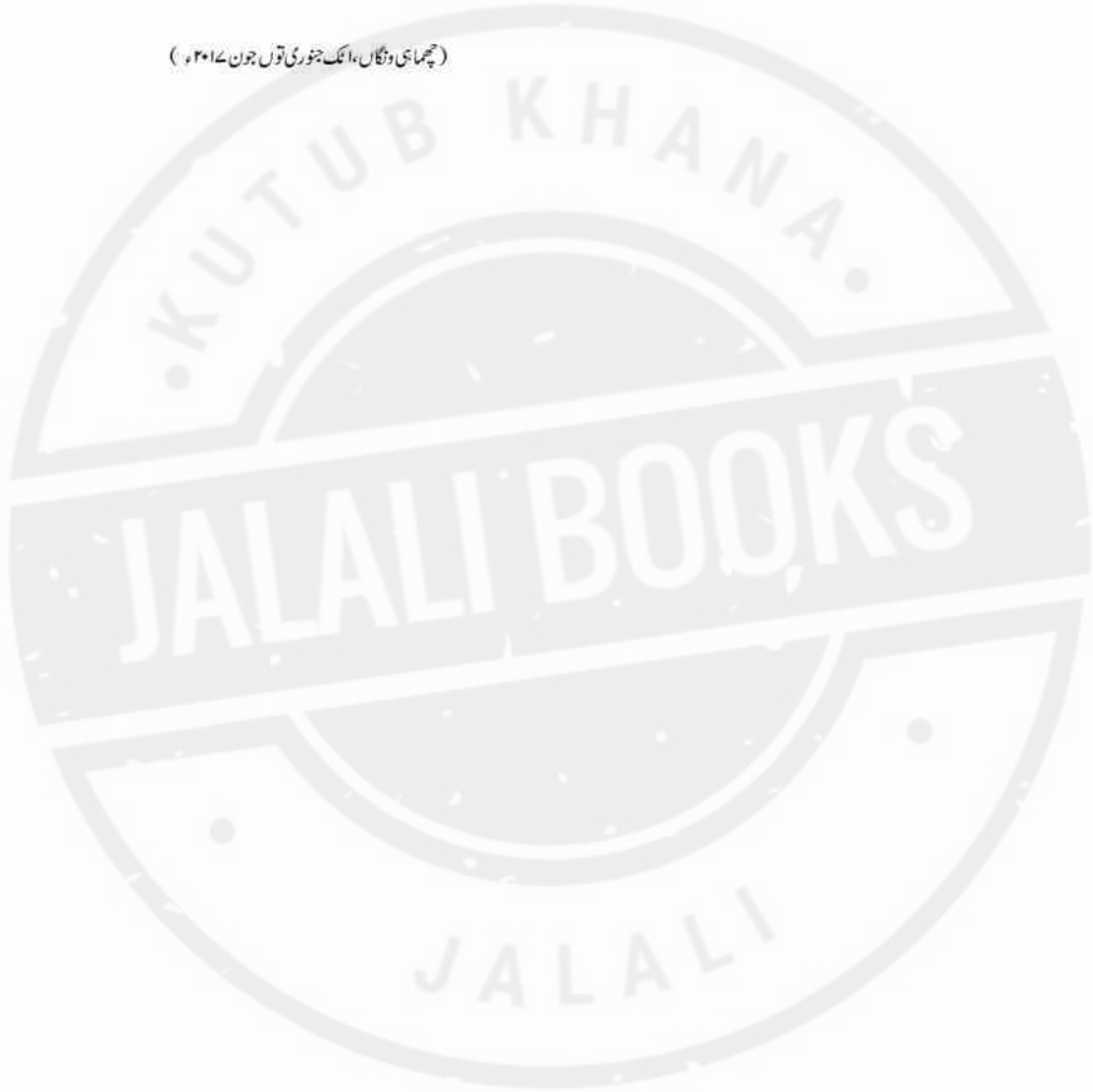
رات جدائی آلی

ارشادعلی
(تعارف صفحہ ۴۴۳)

روشنیاں آلا سوہناہسنا کھیڈ نا شہر ہن موتاں نی چُپ وچ ولھیٹا پیا۔

باہر گلی وچ کوئی اٹھی وئی اواز چے ہوکا پیا دینا ''چن ! میں آناں پیا واں ، میںڈا تارا سانبھ کے رکھیں!''

کہانی سنانے آلا آکھنا کہ اوہ بی مگھرے نی ایجی ای ہک لمی ٹھڈی یخ تے ڈرونی رات ہئی۔

اوہ جاننا ہیا جے اُس نی موتاں نا ورنٹ نکلا پیا وئے ، روز دیہاڑے کرفیوائے تے بھارے بوٹاں آلے بی اُساں نہ بچا سکسن۔

ہک پاسے اُس وقت نا حاکم اس کولوں بہوں عاجز ہیا تے دوہا اس ظلمیے بادشاہ نے حق چے لکھن توں بی نانہہ کر چھوڑی ہئی تے دوئے پاسے سارے شہر آں مٹھی چے رکھنے آلے بدماشاں نی مرضی نال اخباراں چے لکھن توں بی انکاری ہیا۔

کدے اوہ ایہناں نی مرضی تے لکھے آ تے لکھ پتی بن ونجے آ بر ے اوہ بہوں سوہنیاں لکھتاں نا معمولی جیہا پیسہ گھن کے بس واہ واہ چے گزارا کر گھتا ہیا۔ اوہ کنگلا ایہناں نا آکھا من گھنے آ تے پیسیاں چے پیا کھیڈ نا ہووے آ تے جان بی بچا گھنے آ۔

پر ہن مہلت ناں پانی ویلے نے پلے تلوں لگھ کے بہوں دور ہند شے نے دریائے وچ رُل گیا ہیا۔

ہن اوہ ایہناں نے مزام چڑھ گیا ہیا جیہڑے خنامی ہزاراں لوکاں نا خون کر کے بی نئیں رجے اٹے۔

کجھ ڈِھل زندگی ہکی چنگے بھلے دُھرے نے اُتے چلن لگ پئی ہئی پر اس شہر آں کینڈی نظر لگ گئی اے تے ویکھدیاں ای ویکھدیاں چار چھپیرے زبان، نسل تے صوبے نی خندک جاگ پئی۔

ہکی پاسے حاکم تے دوئے وڈیاں بدماشاں اس نال بھیڑ بدگدا تے اوہ ننگی پسلی تے ساریاں نال

پڑبن کے کھل رہیا۔ برے کتھوں؟

اس زمی اُتے اس نے کھلونے نی بی جا گھ کوئی نہیں رئی۔

اُساں کدے کوئی غم ہیا تے ایہا ہیا جے جیہڑی آپنا سبھ کچھ سٹ سٹا کے اس نے پچھے آ رئی ہئی، اُس ناں تے اس نے ترے سالاں نے جا کتے ناں ہن بنسی۔

برے ہن غمے نال کیہ تھینا ہیا، ویلا تے سرے اُتے آ ڈھکا ہیا۔ مگھرے نے لمی ٹھڈی تے ڈرونی راتی اس شوہدے نے ہسنے وسنے گھرے وچ قیامت آ گئی اے۔

آ کھنے آلا آ کھنا ہئی سارا شہر ہنیرے وچ ڈُبا پیا ہیا تے راتی ناں انج انج تروڑنے آلی چُپ چڑنگ رتی ہنیری ناں سنیہا پئی دینی اے۔

نکے جئے گھرے نی کوٹھنی نی دھواکھی وئی کداں تے دیوے نے چاننے چے پرچھاویں پئے ہلنے ہئے۔

اوہ بہوں تر کھا تر کھا گوشیاں چے آپنی سنگھیلی زنانی آں اخیرلیاں گلاں پیا آ کھنا ہیا۔

''تک چن اوہ۔ ہمتاں تے حوصلے نال کم گھنے۔ اوہ ختامی مانہہ کیں ویلے بی نپ گھنسن۔ میںڈے باج اتھوں نکل کے میںڈے پیو دادے نی وٹیاں نی بنی وئی اس حویلی چے چلی ونجیں جتھے اسی سکھے نی ہک رات بی نہ گزار سکے ہئے۔ اوہ گھار تیںڈے انتظارے چے راہ پیا تکنا ہوسی۔''

اس نی حریان تے پرشان زنانی کجھ آ کھنا کیتا پر اوہ اس نے ہتھ نپ کے منت کرن لگ پیا۔

''وقت بہوں گھٹ اے شاید کہ میں اج توں باج ان گلاں نہ کرا کاں تے غور نال سن اپنے ضلعے ناں ڈپٹی کمشنر بی لکھن لکھان آلا بندا تے مانہہ چنگی طرحاں نال جاننا۔ توں میںڈا ایہہ خط اس کول گھن ونجیں۔ تیںڈی نوکری ناں بندوبست ہوویسی۔''

تھر تھر کنبی زنانی نے اس اتھرو پونجن تے آ کھن لگا۔

''میںڈے پُترے آں پڑھاویں ضرور جے ای پڑھ لکھ کے آپے آں سیان سکسی۔ تعلیم نے نال نال اِساں بہوں اچھا بندا بناویں۔''

اوہ زور لا لا کے آ کھن لگ پیا ''چیتا رکھیں دوئیاں تے بھار نہ بنے، کدے نوکری نہ ملی تے کینڈے گھار بھانڈے ٹنڈر تے چیڑے دھو گھنے۔ بدلے چے تداں تے تیںڈ ھے جا کتے آں دو وقتاں نا ٹکر ملنا

رہسی۔''اے گل آکھنیاں آکھنیاں اس نی ہمت جواب دے گئی ہئی تے اس نیاں اکھیاں چوں اتھروآں نے نیل وگ پئین۔اس بہوں اوکھا جیہا آکھا:

''پُتر ے آں جوان ہونیاں نال ای ویاہ ویویں تاں جے مینڈے پیودادے نی قبراں تے دیوے بلنے رہون۔''

پتہ نئیں اوہ روے کھولے چے ہور کیہ آکھن لگا ہیا کہ گلی وچ بہوں ساریاں بندیاں نے نسنے بھجنے نال ڈھپ ڈھپ ہون لگ پئی اے۔

اوہ تڑف کے اٹھا، زمی تے پئے نہالچے اُتے ساریاں مصیتاں بلاواں توں انجان ستے اوئے مشومے نے متھے تے اخیرلا پیار دتا تے اس نیاں اکھیاں چوں ڈولھنے اتھروآں جاکتے نے مونہیں تے کجھ سمجھاں ہے ناں آنے آلیاں گلاں لکھ چھوڑیاں۔

جیوں بوہا کھڑکا اُس اُباہل سہاہلے چولے نی لداں نال اتھرو پوجین تے تھرتھرکنی زنانی نال گوشہ کیتا۔

''میں ادھروں پچھالی آلے پاسوں نساں واں اوہ مینڈا اپچھا کرسن تے اسی ویلے توں جاکتے آں گھن کے نکل ونجیں۔''

ہجا ایہہ گل مکی نئیں اے دروازے آں کوئی لتاں تے بندوقاں نال بھنن لگ پیا تے اس زنانی نے موڈھے تے جلدی نال ہتھ رکھ کے آکھا''وت ملساں''اس ناں گچ بھرا گیا تے ایہا کجھ آکھ سکا۔

''مینڈا اتارا سانبھ کے رکھیں چن!''

اس توں باج اوہ پچھالی آلی کچی مٹی نی کداں توں چھال مار کے باہر ونج پیا۔

آکھنے آلے آکھنین ہئی اس بھاری تے کالی شاہ راتی شہرے نی سڑکاں اُتے موتاں نی پچھ پیری آپنے لے تے کالے شاہ وال کھول کے بہوں ساری ڈھل دھمالاں پائی رئی اے۔

نام شیخ محمد عثمان صدیقی

ولدیت شیخ رحمت الٰہی

پیدائش یکم اپریل ۱۹۶۶ء

جائے پیدائش اٹک شہر

تعلیم ایم اے

آبائی گاؤں یاسین تحصیل حضرو ضلع اٹک ہے۔انہوں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ پائلٹ سکینڈری سکول اٹک سے ۱۹۸۱ء میں پاس کیا۔انٹر گورنمنٹ کالج اٹک سے ۱۹۸۳ء میں۔گریجویشن ۱۹۸۵ء میں کی۔ایم اے پنجابی ۱۹۸۷، بی ایڈ ۱۹۸۷ء ایم اے معاشیات ۱۹۸۹ء ایم اے تاریخ ۱۹۹۴ء ایم ایڈ ۱۹۹۵ء ایم اے اردو ایم فل پاکستانی زبانیں جاری ملازمت کا آغاز جونیئر انگلش ٹیچر سے ۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء میں کیا۔ایس ایس ٹی پنجابی ایڈ ہاک مئی ۱۹۸۹ء ضلع اٹک۔فروری ۱۹۹۶ء ایس ایس اکنامکس۔۱۹۹۸ء میں گورنمنٹ کالج حضرو میں بہ طور پنجابی لیکچرر تعینات ہوئے۔۱۹۹۹ء میں ایس ایس اکنامکس شادی خان۔۲۰۰۰ء بہ طور پنجابی لیکچرر حضرو کالج میں دوبارہ تقرر ہوا۔۲۰۱۱ء میں گورنمنٹ کالج اٹک تشریف لے آئے۔۲۰۱۵ء میں بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دیں۔علاوہ ازیں پارٹ ٹائم استاد علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اٹک سینٹر۔

۲۰۱۱ء سے بہ طور ریجنل کوآڈینیٹر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اٹک سینٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔۲۰۱۶ء میں ڈپٹی دائریکٹر کالجز اٹک تعینات ہوئے اور تا حال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ادبی سفر کا آغاز زمانہ طالب علمی میں کیا۔قابل ذکر اساتذہ میں پروفیسر انور جلال، پروفیسر ضیاء الرحمٰن، پروفیسر سلطان علی، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد شامل ہیں۔ان کے مضامین نظم ونثر ماہنامہ ''لہراں'' تماہی ''پنجابی ادب'' ''سانجھ'' اور ''رویل'' میں شائع ہوتا رہا۔

مطبوعات:

۱۔سدھراں ناگھار (افسانے، چھاچھی بولی) ۲۰۰۵ء

۲۔پٹیالہ پگڑی پراندہ (۲۰۰۶ء)

۳۔دعائیاں تے دوائیاں (۲۰۰۷ء) ۴۔تیرا جیوے کیمبل پور کڑیے (۲۰۰۶ء)

پیرزو

محمد عثمان صدیقی

ناں تے اس ناجان محمد ہیا برے سارے نکیاں ہونیاں توں ای اساں جانی جانی آ کھنے ہئے۔ ہیا بھی اوہ جانی کیوں جے؟ اوہ ہر کسی تے جان دینا ہیا ویلا لنگناں رہیا جانی بھی جوان ہوگیا۔ چار جماعتاں پڑھیاں تے تعلیم نال اس نی جوانی وچ ہور بھی نکھار آ گیا۔ سکول تے کالج وچ اوہ ہر اک ناں جانی ہی رہیا۔ اس نے علاقے وچ اس ویلے بی اے تک نی تعلیم ہئی۔ اس بی اے کیتا تاں اس نی برادری وچ واہ واہ ہوئی کیوں جے اس ویلے بی اے بہوں گھٹ لوک پاس کرنے ہئے۔ بی اے توں بعد اوہ وی ہور جماتیاں وانگن ادھر اودھر نوکری لبھن لگ پیا۔

اساں ناں نویں گریڈ وچ سکول ماسٹرنی نوکری لبھ گئی اوہ بہوں خُش ہیا برے اوہ ہور پڑھنا چاہنا ہیا۔۔۔ ایس واسطے اوہ نال نال پڑھائی وی کرنا رہیا تے نوکری وی۔ دو سالاں بعد بی ایڈ کیتا تاں گریڈ بھی ودھ گیا۔ اس سارے عرصے وچ وی اوہ جھتے جھتے جس جس علاقے تے سکول وچ رہیا لوکاں ناں جانی ای رہیا۔ سوہنی جوانی تے نوکری ہووے تے ویاہ نی دیر نہیں لگنی۔ اس نے ماؤ پیو اس نے ویاہ نے بارے سوچیا تے برادری نی ہک کڑی نال اس ناں ویاہ ہوگیا۔ اس توں بعد اوہ اپنی تریمتی ناں وی جانی بن گیا۔ کئی واری تاں اس نی تریمت اساں ساریاں نے ساہمنے جانی آ کھے تاں ساریاں ہور تریمتاں اس نال ہس پیئیاں ہیاں۔

اس نی تریمت ایہناں واں ہکا بکا ویکھے۔۔۔ کئی واری پُچھے ''کیوں ۔۔۔۔۔۔ ہسنیاں کیوں او۔'' اوہ پرت کے جواب دیون۔۔۔۔ ''کجھ نہیں ایویں۔''

''ایویں کیوں۔۔۔۔۔۔''

''میں کجھ غلط آ کھ گئی آں۔۔۔

''نہیں کجھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ بس جانی۔۔۔۔۔ جانی۔۔۔۔ جانی۔۔۔۔''

اوہ شرما کل جئی ہو کے چپ کرو نجے۔۔۔۔تاں ہور کڑیاں ہسنے آں لگ پیون۔ویلے نال نال ایس جنے تریمتی ناں پیار ہور ودھنار ہیا، پوری برادری تے علاقے وچ مشہور ہو گیا جے جنا تریمت تاں جانی تے اس نی تریمتی وانگن ہوون۔ جوڑا بہوں پیار محبت نال رہناوے۔کدی کوئی گلا شکوہ نئیں سوشل ہن، ہر کسی نی غمی خشی تے ویندے ہن، ہک جانی نئیں اس نی تریمت بھی اس نال ہکا جئی مل گئی ہئی ہن ہک نی جائی۔ دو جانی بن گئے ہن۔آپسی میل جول نال تاں تسیں آکھ سکنے او۔۔۔۔ایہہ دو جاناں۔۔۔۔۔ تے ہک جانی ہن۔۔۔

فیر خدا ناں کرناں کیہ ہویا جے پتہ نئیں دنیا نی ہاہ پے گئی یا اللہ واں ایجوں منظور ہیا، یا کجھ ہور۔۔۔۔۔جانی نی تریمیت اچانک اُساں ہمیشاں واسے چھوڑ گئی تے اس جہانے چ چلی گئی جھتوں اج تیکن کوئی نہ مڑیا اے تے نہ ای مڑسی۔ جانی نی حالت اس ویلے دیکھنے والی ہئی جیوں دنیا وچ اس ناں ہور تاں کوئی نئیں۔۔۔۔وکھرا وکھرا رہوے کوئی گل نئیں، گپ شپ نئیں، زندہ لاش وانگن ویلا لنگھاناں رہیا۔ ہر کوئی چاہنا ہیا جانی ناں ویاہ ہو ونجے۔ہک سال، دو آسال بھی لنگھ گیا ہر کسی بہوں وس لائے برے جانی ویاہ واستے فیر بھی تیار نہ ہویا۔نہ نہ کرنیاں بھی اُساں ماؤ پیو تے بھیناں بھراواں نی منی پے گئی تے اس نے ویاہ نیاں گلاں ہوون لگ پیاں۔ جانی نی سس کسی بھی طرحاں تیار نہ ہوئی اس ویاہ نی مخالفت کیتی۔اوہ چاہنی ہئی جے جانی ویاہ نہ کرے! جانی آں ہور کیہ چائی ناہیا۔۔۔اس آکھیا میری سس منسی تاں ویاہ کرساں۔۔۔۔برے اس نی کسی نہ سنی اُساں وڈیاں اگے نمتی ڈھالنی پئی تے اس ناں ویاہ ہو گیا۔

نویں لوک، نواں شہر، تے نواں خاندان، جانی ناں جانن والا کوئی نئیں ہیا برے کجھ ای دیہاڑیاں توں بعد اوہ اوہناں ناں وی جانی بن گیا۔کیوں جے جانی نی پہلی سس خش نئیں ہئی اس واستے اس خفگی پا گدھی ہئی اس جانی نال بول چال بند کر چھوڑی اس گل ناں جانی آں بہوں دکھ ہیا۔اوہ چاہنا ہیا کہ مرنے دم تکین اس کولوں کوئی بھی ناراض نہ ہووے برے اس معاملے وچ اوہ کجھ نئیں کر سکنا ہیا۔اوساں جدوں بھی تے جھتے بھی پہلی سس ملے اوہ اُساں اوجوں ای دعا سلام کرنا ہیا۔جیجوں پہلے کرنا ہیا۔کجھ ویلے پچھوں اوس نی پہلی سس بی ایہہ جہان چھوڑ گئی سس نے مرنے توں کجھ چر بعد جانی گراں گیا تاں گرائیں نی ہک بڈھی اس کولوں پچھنی اے۔۔۔۔۔"پترا توں جانی ایں ناں"

"جی خالہ میں جانی آں۔۔۔"

''ہلا ہلا ٹھیک ایں۔۔۔پترا۔۔۔۔''

''جی خالہ۔۔۔۔۔اس نی ذات ناں کرم اے۔۔۔۔۔''

''ذرا میرے کول آویں۔۔۔۔پترا۔۔''

''جی خالہ۔۔۔۔پترا ذرا ہور نیڑے ہو۔۔۔''

اوہ ہور نیڑے ہویا۔۔۔۔بہوں گھور گھور کے ویکھن لگ پئی۔۔۔۔'' کیوں خالہ کیہ گل اے۔۔۔اتنا غور نال کیوں پئی ویکھنی ایں''

''کوئی گل نہیں پترا۔۔۔۔بس تدھاں ویکھنی ہیاں''

''نہیں کوئی گل ہے خالہ۔۔۔۔اج دس کیہ گل اے۔۔۔۔جانی جے مجبور کیتا تاں خالہ آکھیا''

''پترا گل ای وے جے۔۔۔۔تیری سسو کولوں اس نے مرنے توں کجھ عرصہ پہلاں میں پچھیا''

''نی سن! توں جانی آں ویاہ کیوں نہیں کرن دینی ہئی ایں۔۔۔اس جواب دتا۔۔۔۔چھوڑ اس گلاں واں میں آکھیا! اوس نی جوانی کیوں برباد کرنے نے پچھے پئی وئی ہئی ایں۔اوہ تیری دھیو نال کتنا پیار کرناں ہیا۔۔۔۔ اس آکھیا۔۔۔بہوں چنگا ہیا۔۔۔۔بنہوں پیار کرنا ہیا۔۔ فیر۔۔۔۔اوہ رک گئی میں آکھیا۔۔۔۔ بول بولنی کیوں نہیں ایں۔ اوہ بولی۔۔۔

جانی جیہا جواترہ تاں قسمت والیاں واں لبھناوے۔

فیر۔۔۔۔کیہ کراں اس میری دھیو آں پھلاں وانگن رکھیا ہیا۔۔فیر۔۔۔

اوہجا جواترہ تاں خدا کسی کسی آں نصیب کرناوے۔اس تے تاں مانہہ کوئی گلہ نہیں۔۔۔۔میری دھیو نی ای زندگی اتنی کجھ ہئی۔۔۔۔جانی جیہا جواترہ تاں خداواندے ویلے بنایا اے۔۔

ہلا فیر ویاہ کیوں نہیں کرن دینی ہئی ایں اوساں۔جدوں اوہ اتنا چنگا ہیا۔۔۔۔۔تے توں اس نی حیاتی کیوں برباد کرن تے پئی ہئی ایں۔بولی۔۔۔کیہ کراں اپنے آپ کولوں مجبور ہیاں۔۔۔۔اپنے دلے کولوں مجبور ہیاں۔۔۔ہلا کہیڑی مجبوری۔۔۔؟

میں جانی آں۔۔۔۔

بول بول۔۔۔۔کیہ گل اے

کسی آں بھی۔۔۔۔کسی بھی قیمت تے۔۔۔۔"پیرزو" نہیں کرسکتی ہیاں۔۔۔۔''

چوپڑیاں تے دودو

سید نصرت بخاری
(تعارف صفحہ ۴۴۲)

ہک گل ہے، اس پوڈرے وچ ضرور کجھ نہ کجھ ایجی چیز ہے جیہڑی انسان آں بہوں ذہین بھڑا چھوڑنی۔ تانہوں ایجیاں اوپریاں گلاں ایہناں پوڈریاں نیاں سننے چ آنیان جے چنگا بھلا سمجھدار آدمی بھی حریان ہو وینا نالے ایجے ایجے کم کروینین جیہڑا انواں نرویا بھی نئیں کر سکنا۔ ہن ای مینڈے سنگی ایہناں پوڈریاں نے لطیفے سنا سنا کے گین۔۔۔۔اک پیا سنا نا ہیا جے ویکنا وچ اک پوڈری بیٹھا ہویا ہیا۔ اک کالجی جاکت پچھنس توں جہاز کیجوں بن گیاں۔ پوڈر یئے جواب دتا کہ میں بننا تے پائیلٹ ہیا ،برے کجھ زیادہ ہی پڑھ گیاں، اس واسے جہاز بن گیاں واں۔ اک ہور سنگی سنانا پیا ہیا کہ شیدے پوڈری اس دیہاڑے ایجوں کیتا کباڑیے کول گیا۔ اُساں آکھنا: جلدی کر پچھے مینڈا ابا پیا آنا، دوسو روپیا دے تے ایہہ پانی نی موٹر چھپا کے رکھ گن۔ گھروں لاہ کے آندی اے۔ وادھا گھاٹا وت کر گھنسا۔ کباڑیے اس ویلے تے فٹوفٹ دوسو روپیا دے کے اساں چھپا گدا، بعد وچ ویکھا اس تے اُودواِٹاں ہیاں جہناں اُتے وان ولیھٹا پیا ہیا۔ ہس ہس کے ڈھڈے چے کڑول کھل گئین۔ اوویکھو! کتنی وڈی عمر اے اس نی او پیا آنا نے۔ اس دیہاڑے حرامیے مینڈھے نال کی کیتا۔ کالا شاہ رنگ اکھیاں پیاں نوٹیدیاں ہوٹھاں اتے پپڑی جمی پئیس۔ کھلیاں کھلیاں دھکے پیا کھانا وے، برے لکڑ اوہ چائی وائیس جس آں کوئی پہلوان بھی نئی چا سکنا۔ پتہ نئیں کا نہہ ہتھ لائیاس، مینڈے کول آکھلا۔ آکھنا:

''لکڑ وکاؤ آ۔ بالن واسے چاہ گن''۔

اساں ناں بالن مکا پیا ہیا۔ بے بے کئی وار آکھ رائی ہئی جے بالن کوئی نئیں۔ میں سوچا چلو اس نال سودا مارنے آں۔

''ای لکڑ کس پیونی چا آندی آ۔ گندیاں کماں توں ہتھ نہ کنڈیں۔'' میں اس آں اگوں ہو کے پیاں

جے لکڑ سستی مل ونجے۔

''تداں کی وے۔ جس نی بھی اے۔۔ تدھ گھننی تے مکا، پیسے کڈ تے چاہ گھن۔ نئیں تے میں اگے وینا پیا واں۔ اساں نے گاہک بہوں نی۔''

لگنا شیدے آں مینڈا انداز چنگا نئیں لگا۔ ایس واسطے بہوں اوکھا ہو کے جواب دتاس۔

''کتنے نی ویچ سیں؟''

''ہزار روپے نی'' ''ایویں پٹھاناں والا ریٹ نہ لا۔ وکنے نی گل کر''

''ہلا، پٹھاناں والا ریٹ اے تے نہ گھن، ویکھساں کوئی مویاں ناں مال ملا تے تینڈے واسطے گھن آن ساں۔'' اساں نی ایہہ گل سن کے لوک ہس پئین تے مانہہ غصہ آ گیا۔

''تھوڑیاں گلاں کراوئے۔ چوری نا مال بی ایجوں پیا ویچنا جیوں جاپان توں منگوایا ای۔''

''تدھ بھی تاں ایجا ریٹ لایا جیوں لکڑ نئیں چھائی پیا ویچنا واں''

''ہلا چھوڑ پھکیاں، دس کتنے نی دیسیں؟''

''توں بھراویں تینڈے نال سودے بازی نئیں ایں۔ پنج سو چاہ دے''

''دوسو بہوں نی؟''

''وت اوہا گل کرنا نا۔ چل ترے سو تے لکڑ چا''

''ہالا ونج نا۔ اساں نے گھار لکڑ سٹ آ، تے وت آ کے پیسے چاہ گھن''

''یارا! تداں مینڈے تے اعتبار نئیں، اسی کوئی ٹھگ آں''

''نئیں نئیں، پہلوں اساں نے گھار چھوڑ آ۔ تے وت آ۔ تینڈا کوئی پتا نئیں''

''چلو ایجوں سئی۔ جیجوں تینڈی مرضی''

شیدے آں ٹور کے میں اپنی دکان تے آ بیٹھا واں۔ مانہہ پتا اس ڈھل کوئی نئیں لانی۔ چلو آ گیا تے بے بے آں فون کر کے پچھ گھن ساں۔ اس توں بعد پیسے دیسانس۔ اوہا گل ہوئی۔ پنج منٹ بھی نئیں لائیس۔ گولی وانگن آیا۔

''دے یارا پیسے۔ تینڈے گھار لکڑ سٹ آیاں واں'' آنیاں نال شیدے پیسے منگن۔۔۔

''ٹھڈا کھا اوئے۔ پہلو مانہہ گھروں پچھن تے دے ناں''

''اپنی تسلی کر گھن یار۔اسی پوڈری ضرور آں برے ٹھگ نئیں آں''

میں گھار فون کیتا۔بے بے او کے نی رپورٹ دتی تے میں ترے سو روپے اس نے ہتھے تے رکھ دتین ''گھن اوئے پیسے تے ایتھوں نس۔اتوں کوئی آ گیا تے مانہہ بھی منڈا سیں''

''چوپڑیاں ویاں تے دو دو منگنے او''۔شیدا ویندیاں بڑ بڑ کرنا چلا گیا۔

''اوہناں کولوں چوری نی شے کیوں گھننے او۔ایہہ نپا گیا تے تسی بھی پھس ویسو۔تسی لوک اوہناں کولوں ای مال نہ گھنوں تے کی پتا ایہہ باز آونجن۔جتنے مجرم ان ہن اتنے مجرم اسی تسی بھی آں۔''ملا چاچا دکاناں چ وڑنیاں سار وس پیا۔بک تاں اس چاچے آں دانش ور بننے ناں بہوں شوق اے۔میں سوچیا ایس تک تاں گھدا،ہن شامی تک جان چھٹی۔آنیاں ویندیاں نصیتاں لانا رہسی۔اساں کون سمجھاوے ایہہ میں نہ گھنا سا تے کوئی ہور چاہ گھنے آ۔چلو بک بک کرن دیوس۔اساں تاں آپنا رانجھا راضی کرگدا ناں۔

خیر میں اپنے کے آں لگ پیاں،شامی ناں ٹائم گاہکاں ناں ٹائم ہونا وے۔رولے رپے چ بے بے نی کال کئی واری آئی برے مانہہ پتا نئیں لگا۔ذرا رش گھٹ ہویا تے میں ایویں موبیل چا گدا۔ویکھا تے بے بے نیاں کئی کالاں آئی پئی ہیاں۔

''بے بے کی اے۔اتنیاں کالا آیاں پیان،خیر تے ہے وے ناں''میں گھار فون کر کے پچھا۔

''پتر!بالن ناں کجھ کریں آں ناں۔تداں کل بھی آکھا تے گھُسا گیا ویں''

''بے بے!شیدا جے ہیڈی وڈی لکڑ سٹ گیا وے۔اج گزارا کرو۔کل کائیں آں سدھ کے چرا گھنساں۔''

''پتر شیدا تاں اسے ویلے مڑ کے آیا تے اپنی لکڑ چا کھڑ لیس۔آکھنا ہیا جے ویرے نال سودا نئیں بنا تے لکڑ موڑ دیوو۔''

بے بے تے گل کر کے فون بند کر دتا،برے مینڈا دل آکھنا ہیا جے مل ونجے تے ایجوں کراں س جیجوں ہیڑ پئے کھوتے نال ہونی۔

(چھماہی ونگاں،اٹک جنوری توں جون ۲۰۱۷ء)

اُوہ

ارشد سیماب ملک
(تعارف صفحہ ۴۴۸)

شہرے نے اس نکے جئے علاقے آں ہن لوک نویں ابادی آکھن لگ پئے ہن کیوں جے لوکاں کول اللہ جانے کِتھوں پیسا آیا جے اس نے آچھپیرے رنگ رنگ نیاں کوٹھیاں بن گئیاں ون، تے اُتوں لش پش کرنیاں موٹراں، پر اوہ لوک تاں چنگی طرحاں جاننے ون جنہاں نی جم پل اِتھے نی ہئی، ہنیر اپیپیاں ہی گِدڑ تے کُتے بھونکنے ہئے، تے لوک اِدھروں لنگھنے ناناں بی نئیں چانے ہئے۔

ویلے نی گل اے ادھے توں ودھ گھار ہندواں نے وقتاں نے ہئے۔ جنہاں ناوالی وارث کوئی نئیں بچا اُوہ تاں ایجوں ہی ڈھے گُرو گئے تے لوکاں نی موج بن گئی۔ کُجھ اجے بی مندی حالتاں چ کھلوتے ہئے جیہڑے مالکاں مجبور لوکاں اگے کرائے تے چاھڑے وئے ہئے، ایہناں چ ہک اُو بی ہئے۔ اس توں پہلوں اس گھرے چ کوئی بی اتنا چر نئیں رہیا ہیا۔ کوئی تاں اس نی مندی حالتاں نے ہتھوں نس وینے ہیا تے کوئی جناں بھُوتاں نے خوفے چ چار دیہاڑے بی نئیں ٹکنا ہیا۔ اُس نیاں چنے تے سونے جہیاں دو نِکیاں نِکیاں جاکتیاں تے ہِک جاکت بھی ہیا۔ زنانیاں گلاں کرنیان ہئی اس نی زنانی جِتھے بہہ ونجے اوہ جاہ بی سوہنی لگن لگ پینی ہئی تے اس ناں مونہہ اگی وانگن بھکھنا ہیا، اوہ جدوں گل کرنی ہئی تے ایجوں لگنا جیوں اس نے مونہیں چوں پھُل پے ڈھینیں ہون۔

مینڈی اس نال کوئی میل مُلقات تے نئیں ہئی پر ہک دیہاڑے میں اُساں ڈاکٹر نی دُکاناں تے ویکھا ہیا۔ اس نی کُڑی نی اَنگلی چ کچ کُھب گیا ہیا تے لہور کنے ناناں نئیں گھنا ہیا۔ اوہ دردے نال چیکنی ہئی تے اس کولوں اپنی جاکتی آں ایجوں ویکھا نئیں ونجنا ہیا۔ اوہ کُڑی آں دلے نال لائیاں بے سُرت ڈاکٹر پچھے کدے ہدر نسے تے کدے ہدر۔۔۔ ایجوں لگنا ہیا جیوں اس ناساہ جاکتی پچھے نکل ویسی۔۔۔۔

اس دیہاڑے توں پچھے میں اس نیں مونہہ مہاندرے توں کُجھ واقف جیہا ہویا ہیاں۔ اس توں پچھے اوہ کئی واری نظری چ آیا پر اس نال کدے سلاماں لیکم نئیں ہوئی ہئی۔ اس نی جاکتیاں مینڈی مُنی نال

کھیڈ نے آسے گھار آوڑن تے مینڈھی اماں اوہناں نال بہوں لاڈ کرے مینڈھی جاکتی نے لتھے وے چیڑے تے جیہڑی ودھی گھٹی شے ہووے ایہناں چاہ دیوے، کیں ویلے مینڈھی گھرے آلی ہُسڑ کے اوہناں جھڑک چھوڑے۔" کی ہر ویلے کھپ پائی وئی ہونی نیں"۔ اماں ای گل سن کے اُساں ٹوک دیوے۔۔

"گڑیے ایہجوں ناں کیتا کر۔ تینڈا کی گمایانے۔ غریب ون تے کی وے۔۔۔ ای تے پھُلاں وانگن ہُن کیہڑی جاہ ایہناں نی کوجی اے اوہناں کوٹھیاں آلے نے جاکتاں گڑیاں کولوں۔۔۔ جے توں۔ ایہناں۔۔"

اماں جاکتیاں ہور لاڈے نال کول بہا گھنیں تے آپ بی ایہناں نال کھیڈن لگ پیوے۔۔۔ پر ہِک دیہاڑے مینڈھی گھرے آلی ایہناں بہوں ڈاڈھا جھڑکا تے وت مُڑ کے ایہناں پیر نیئں پایا۔ ہِک دو وار اس نے گھرے چ رولا پیا پر لوکاں کوئی ایڈے گَن نئیں دھرے نہ اس نے گھرے تے کینڈی نظر سڑنی ہئی اوہ تے دیہاڑی دار مزدور ہیا۔

اس نے گھرے توں دوترے گھار چھوڑ کے حافظ اوراں ناں گھار ہیا۔ او پنج وقت نیں نمازی تے خداترس جئے لوک ہئے کِسے نی چنگی مندی چ نئیں ہئے نالے ایہجوں بی اوہ گجھ ڈرپوک جئے ہئے، بھیڑ لڑائیاں کولوں ایہجوں چھاہڑ کے لنگھ وینے ہئے جیہجوں کوئی اکھوں انھاہ تے کنوں ڈورا ہووے۔

جمیلو ماسی ناں اگ پچھ کوئی بی نئیں ہیا۔ غریبی چ لوکاں نے کم کر کر کے جان گال چھوڑی ہئیس۔ مڑ دڈی بی نے ہتھوں خون تُھک تُھک کے مویاس، اتوں جوان دھیاں ویائے نی ہاڈاں چ لکھ چٹے کر چھوڑے ہئے تے اوہ غماں نی ماری شوہدی ہن بس وقتے آں پئی دِھکا دینی ہئی۔

اے ڈی خان ناں سِدھاناں تے اللہ دتہ ہیا پر او آپے آں اے ڈی خاں اکھوانا ہیا۔ اس ساری عمر ولایت چ کٹی ہئی تے اُتھوں بہوں گُج جوڑ آندا ہیاس۔ اس نی کوٹھی چ پیر رکھو تے بندے ناں مونہہ کھلا ناں کھلا رہ وینا ہیا۔۔۔ ہر ہِک شے باہرے نی جائی جائی بجی وئی جیہڑا کوئی اُسنے گھار ونجے اوہ ہر کیں آں وڈیائی نال دسناہیا، ای شے میں فلانے مُلکھ چوں آندی تے ای فلانے مُلکھے چوں۔۔ شکارے نی رج کے ٹھرک ہئیس۔۔۔ اس نیں اگے بس کوئی چڑھے سہی اپنے شکارے نیاں لمیاں لمیاں چھوڑن لگ پیوے تے جدوں تک کوئی کَن ناں پرتا گھِنے اس نیاں گلاں کِتھے مُکن۔۔۔ پر ہِک گل ہئی جے اس نے

گھار کئی قسماں نیاں بندوقاں نے ڈھیر لگے وئیے ہئے تے چنگی چنگی نسلاں نے شکاری کتے بی پالے وئے ہئیس ۔۔۔۔اس نیں پُتر بی اس کولوں کوئی گھٹ نہیں ہئے۔۔۔۔۔کوئی بی نویں ماڈل نی گڈی ابھجی نہیں ہئی جیہڑی اے ڈی خان نی دھیاں پُتراں نے پیراں تلے نہ ہووے۔۔۔

ابادی چ ہور بی امیراں نے گھار ہئے پر سیکٹری اے ڈی خان نی ٹکّر ناں بنداہیا۔اس بی آپنے وقتاں چ چنگاں حلال حرام اکٹھا کیتا ہیاس ، تے ہُن پچھلی عمراں چ اس تاں مسیت نپ گھِدی ہئی پر ایہناں دوہاں نی اولاداں نی آپے چوں لُٹ بازی رہنی ہئی ۔کوئی نویں شے اے ڈی خان نے گھار آونجے تے اگلے دیہاڑے سیکٹری نے گھار بی آئی وئی ہووے۔ دویں گھار اس گلوں ہکی دوئی نی ٹوہ چ لگے رہنے ہئے کِدھرے کوئی ایہناں کولوں ودھ کے کُجھ نہ چاہ گھِنے۔

اللہ بخشے دینے گھارے آں اُساں کون نہیں جاننا ہیا۔شوہدے اپنی ساری عمر مٹی چ رول دتی ہئی جدوں تک جینا رہیا لوکاں اُساں پیراں چ ہِکا کھلا دھروکنیاں تکا۔۔۔اس نے جُتے کدے کیں نواں چیڑا نہیں تکا ہیا۔۔۔مویاں مرگیا بر بھوں اوکھی نھی ڈِس۔۔۔ہن تکو اس نیں پُتر ے آں تحصیلدارے تلے نوکری ہویا، دیہاڑی لکھاں پیا اُڈاناتے پچھن آلا کوئی نہیں ۔۔۔۔جائی جائی زمی وکھری دبائی وئیس تے گھرے آں ایجوں رکھا وہیاس جیوں وزیرتاں ایہائی ہووے۔۔۔زنانی تے دھیاں پُتر روز سوٹ بوٹ لا کے گڈیاں چ پئے پھرنے ہوون ۔ آپ اوڈھول واجیاں تے سانگاں نا بھوں شوقی ہیا۔لوک اوساں دوروں دوروں اپنے ویائے نی دعوتاں دینے آں پونہچے وئے ہونے ہئے۔ کیوں جے۔ اوہ۔۔۔توں میں نے ویائے تے بی نوٹاں ناں مینہہ وسادیناہیا۔پچّھ آلی جائی تے اوہ نوٹاں نیاں دتھیاں کھول دیناہیا تے پڑے چے اس نی ٹکّر ناں کوئی رہنا نہیں ہیا۔

وڈی عید نیڑے پئی آنی ہئی تے مینڈھی گھرے آلی روز مینڈھے کنے چ پھوک چھوڑے:

''کڑیاں جا کتاں نے چیڑیاں واسے کُجھ پیسے تنخواہ چوں بچاکے رکھیو۔اُدھروں اماں کن کھاونجے ''قربانی آسے جیہڑی کمیٹی پائی وئی اے اس نا کوئی پتہ نیواں ۔۔۔۔ پُترتوں بقریدی نی فکر کریں۔۔۔''

دفتر چے بی ہر کسے ناں ایہا رولا ہیا۔تنخواہ دار بندے آسے عام دیہاڑے اوکھے ہووینے ون اُتوں عید ورھیناں آونجے تے کِتھے گزر ہونی۔ بقریدی توں دود دیہاڑے پہلوں اوکھا سوکھا میں ہِک ماڑا جیہا لیلہ

گھن آندا تے اماں سکھے ناں ساگھِدا جے قربانی نا حق ادا ہووںجے، اوہ سوہنا رب تے بس نیتاں ویکھنا۔!

باہرا ے ڈی خان نے نوکر دودھاں ملھناں چ پلّے تے ہاراں نال سجے وئے ہک تکڑے جۓ داندے آں قابو کیتیاں اں ابادی نی گلیاں چ پۓ پھرانے ہیۓ جیہڑا کل ای اے ڈی خان پنج لکھ وچ آندا ہیا۔ اگے اگے داند تے پچھے جا کتاں نا رولا رَپا تے کھیڈ تماشا۔۔۔۔۔

دوۓ پاسے سیکٹری اوراں تے نالے دینے گُھارے نے پُترے اے ڈی خان کولوں بی ودھ کے تکڑا ڈنگر منڈیوں مُل آندا ہیا۔ سیکٹری نے ڈنگرے نے مالکے اس ناں مُل پندہراں لکھ لائیا ہیا، تے دینے گُھارے نے جا کتے بی اوہناں کولوں کوئی گھٹ مُل نا نئیں گھدا ہیا۔ ہر پاسے بقریدی نی تیاری تے لوکاں نی ٹُر پھر لگی وئی ہئی، نماشاں پیاں پینیاں ہیاں اس نے گھرے چوں رولے نی واز آئی۔ اَساں بھی کوئی اپڈے کَن نئیں دھرے کیوں جے ایہہ کوئی نویں گل نہیں ہئی، اماں دسنی ہئی جے ایہناں جنا تریمتی نا تنگی پچھوں آنے دیہاڑے رولا ہیا۔

میں جدوں جا کتاں نا چیڑا کپڑا تے ہور شئیاں گھن کے چِر کا جیہا گھرے آں مُڑاں تے تاں اُس نے گھار چپ چڑ نگ ہئی۔ میں روٹی ٹکر کھا کے سونے آلی کیتی جے فزری مونہہ ہنیرے اٹھنا ہیا۔

فزر ہوئی تے نھا دھو کے نماز پڑھی تے اجی نی قبراں تے پھیرا پا کے جا کتے آں گھروں نال لایا تے عیدگاہے آں ٹرگیاں۔ اَساں پیو پُترے عیدی نی نماز پڑھی تے ہک دوہاں بندیاں عید مل کے تر کھے نال قدم گھرے دئیں پۓ ون جے بقرید کرنی ہئی۔ ابادی چ اے ڈی خان، سیکٹری تے دینے گُھارے نے تکڑے ڈنگر ہاراں سنگاراں نال سجے کو سینۓ آسے تیار کھلوتے وۓ ہیۓ۔ اسی مسے گلی نے کونے تک پوہنچے ہی ہوساں جے گلی وچ مڑداں تریمتیاں نا رولا تے اکٹھ ویکھا۔ میں ترِکھے نال جا کتے آں بوہے واڑ کے اس نے گھرے دائیں نس پیا، بندیاں نے اکٹھ آں چیر کے میں اگے پیا لگنا ہیاں جے کنے واز پئی:

"جا کتاں کنڈا بی چُھبے تے اوہناں تے دکھنا ہیا، سمجھ نئیں آنی ظالمے کیجوں مشوماں کوہ کے آپ پھائی لا گدِیس۔۔۔"

مینڈھی اکھیاں اگے سیت ہک ہنیرا جیہا آ گیا تے مانہہ ایجوں لگا جیوں اے ڈی خان، سیکٹری تے دینے گُھارے ناں پُتر ٹو کے، مُڈھیاں تے چھُریاں چاء کے کیں نے جا کتاں پۓ ٹُکنین۔

نام	عظمت عاصی
ولدیت	صوبہ خان
پیدائش	۶ جون ۱۹۷۱ء
جائے پیدائش	شین باغ خورد (اٹک)
تعلیم	ایم اے (اردو)

عظمت عاصی اٹک کی نواحی بستی شین باغ کے رہنے والے ہیں۔ابتدائی تعلیم پرائمری سکول سروالہ سے، مڈل گورنمنٹ ہائی سکول سروالہ، میٹرک ۱۹۸۹ء میں بہ طور پرائیویٹ سٹوڈنٹ راول پنڈی بورڈ سے پاس کی۔میٹرک کے بعد انہوں نے دیگر تعلیم دوران ملازمت حاصل کی۔ایف اے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے ۲۰۰۰ء میں اور بی اے اسی یونی ورسٹی سے ۲۰۰۳ء میں کیا۔ایم اے اردو انہوں نے پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ۲۰۱۲ء میں کیا۔ملازمت کا آغاز ۱۹۹۵ء درجہ چہارم میں گورنمنٹ کمیونٹی ماڈل سکول پوڑ میانہ حسن ابدال سے کیا ۱۹۹۷ء میں بوائز پرائمری سکول میں بھیج دیا گیا۔۲۰۰۰ء میں بوائز پرائمری سکول ڈھیر اٹک میں ٹرانسفر ہوئی ۲۰۰۳ء سے گرلز ہائی سکول منہاس بیس کامرہ (اٹک) میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ادبی سفر کا آغاز ۱۹۹۱ء میں شعر گوئی سے کیا ۱۹۹۳ء میں افسانہ نگاری کی جانب راغب ہوئے۔اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں کہانی لکھتے ہیں زیادہ توجہ پنجابی کہانی پر مرکوز ہے۔ان کے کئی افسانے پنجابی کے نامی رسائل ''مٹی'' لاہور ''ورولے'' گجرات اور کئی دیگر رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اٹک کی فعال ادبی تنظیم ''قندیل ادب'' اٹک کے ۱۹۹۵ء میں سیکریٹری اور ۱۹۹۶ء سے ۱۹۹۷ء تک نائب صدر رہے۔۲۰۰۶ء میں ''بزم سخن'' کے نام سے اپنی ادبی تنظیم کا آغاز کیا لیکن اسے فعال بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے اور چند اجلاس کے بعد یہ تنظیم دم توڑ گئی۔اس سے قبل انہوں نے ۲۰۰۵ء میں ایک رسالہ ''حرف ونِدا'' کا بھی اجراء کیا جس کے صرف دو ہی شمارے شائع کرنے میں کامیاب ہوسکے۔علاوہ ازیں ایک مقامی رسالہ ''ہرو ٹائم'' کے ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۷ء تک ادبی صفحہ کے انچارج رہے۔چند ایک ادبی نوعیت کے مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔چند سال قبل انہیں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔''سفر نامہ حج'' اردو ماہیے کا مجموعہ ''دھوم بہاروں کی'' پنجابی و اردو کلام کے علاوہ پنجابی کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔

سچ پرَچّی

عظمت عاصی

گرائیں وچ ہک نویں ڈاکیے نی بدلی ہوئی، اس ناناں اللہ دتا ہیا۔ اس نا اپنا گراں چنگا سارا دور ہیا اس آسے اسی گرائیں چ ہک مکان کرائے تے گھن کے رہن لگ پیا۔ شہر روز آنے جانے آلا بندہ ہیا کیوں جے اِساں روز نی ڈاک آنی پینی ہئی۔ دتا مزاجے ناں چلاک تے ترکھا جیہا بندہ ہیا۔ گُجھ گرائیں جیہڑے فوج وچ ہئے اوہ ہر مہینے گھار منی آڈر بھیجنے ہئے۔ دتا ای پچانے نے پیسے گھننا ہیا اسی طرحاں بے رنگ خطاں نے جرمانے بی وصول کرنا ہیا۔

گُجھ مُد الگھا تے گرائیں نے لوکاں نال اس نا واہ بیار بہوں ہوگیا۔ پر اوہ آپنی کھوٹی کوڈی بی کیں کول نئیں چھوڑنا ائیا۔ بھلی گل اے۔۔۔۔اوہ لوکاں نے پیسے کھا پی وینا ائیا تے اتوں لوکا نیاں تریفاں اتنیاں کرنا ہیا جے گرائیں نا کوئی بندہ بی اساں مندا نئیں آکھنا ہیا۔ لوک کماں وچ اس نی مدد کرنے ہئے تے ایجوں ای اوہ بی ایہناں نے کماں کا جاں چ ہتھ ونڈانا ہیا۔

گرائیں چ ہک ہور بی پردیسی شیر خان گجر بی رہنا ہیا جیہڑا شیر و مشور رہو گیا ہیا۔ ای ٹیوب ویل تے ملازم ہیا، اساں گرائیں نا پانی مافق نئیں آیا تے بدہضمی نی شکایت جیہی ہوگئیس، گرائیں نے حکیم اساں ادرکِ نے استعمال نا مشورہ دتا۔ جدوں ادرک گرائیں نی کسی ہٹی تو نہیں ملی تے شیر وآں شہروں منگوانے نی بُجھی اس دتے ڈاکی آں پنج روپے دینیاں آپنی غرض دسی۔

بہوں چِر تائیں اوہ دتے آں پنج روپے دینا رَیا تے اوہ ہر واری ہک روپے نی ادرک گھن کے چار روپے آپے مارنا رہیا۔ شیر وآں اس نی اس حرکت تے کدے بی شک نئیں ہویا، الٹا اس ناں شکر گزار ہیا۔ دتا جدوں بی شیر وآں اس نی شے آن کے دینا تے اس نے مونہے چوں نکلنا ''یار دتیا تینڈی بہوں مہربانی اے''، ای سن کے دتا آپنیاں مُچھاں وچ ہسنیاں جواب دینا ''یار مہربانی کیہڑی گل نی بندہ ای بندے نے کم آناوے''۔

ہک دیہاڑے کی ہویا جے شیرو دتے نے گھار پونہچا تے پتہ چلاس جے اوہ شہر ٹر گیا وے، شیرو بہوں پرشان تھیا تے سوچاں چ پے گیا ہن شہر آپے ونجے کیہ کرے۔۔۔اوہ سوچی پیا۔۔۔خدانی کرنی ای ہوئی جے بڈھا کھیما پنشن واسے شہر وینا پیا ہیا،شیرو اساں پنج روپے دتے۔۔۔پیشی نا ویلا ہیا تے شیرو ٹکر کھاریا ہیا اس نا بوہا کھڑ کا شیرو اتھوں ای پچھا کون اے؟ جواب چ بڈھے کھیمے نی واز آئی ''شیرو زرا باہر آ'' شیرو ننگے پیر جلدی نال باہر آیا تے جدوں اس کولوں ادرک گنن لگا تے حیران ہویا جے دتے نی آندی ادرک کولوں چوکھی ساری ودھا ہئی،شیرو پچھا ''بابا میں پنج روپے نی ادرک آکھی ہئی ای توں کتنے نی گھن آیا ویں؟'' اگوں کھیمے جواب دتا'' نمیں یرا مانہہ چنگی طرحاں یاد اے جے میں ریڑھی آلے آں پنجاں نا نوٹ دینیاں آکھا،اس مانہہ اتنی تول دتی''۔

اگلے دیہاڑے وت شیرو دتے آں آڈر دتا تے جدوں اوہ مڑا تے اس اتنی ای ادرک آندی جتنی پہلوں۔۔۔اساں دتے نے فراڈ تے شک پیا،اس توں پہلوں اوہ کھیمے تے ہسا ہیا جے کوئی ہماتڑ بھلا تے چنگا ہی بھلا،شیرو خیال کیتا جے دتا مٹی پلیت کرنا پیا تے کیوں نا اوہ سچ پرچی کرے تے ہن کیں ہوری کولوں کم گھنے۔سویر ہوئی تے دتا اس نا انتظار کر کے چلا گیا۔شیرو گھروں نکلا تے وڈے راہے چ آ گیا،اُساں ہک جا تک ملا جیہڑا کالج وینا پیا ہیا۔شیرو اساں پنج روپے دے کہ اپنی غرض دسی۔پیشی ویلے جدوں اوہ جا تک ادرک دینے واسے آیا تے اوہ کھیمے نی آندی وئی ادرک وانگوں چوکھی ساری ودھ ہئی۔اس ویلے دتا بی ایہناں کولوں اکھیاں چھپا کے لکھی وینا ہیا۔شیرو ادرک گھار چھوڑ کے جلدی نال دتے ڈا کی نے بوہے تے آن کھلوتا۔بوہا کھڑ کایا تے اندروں دتے نی زنانی پچھا ''کون اے'' شیرو آکھا ''دتے گدڑ آں آکھ باہر شیرو آیا وئے'' اوہ بولی ''جی دتا تے گھار نئیں اے'' شیرو بھِر گیا تے آکھن لگا ''اوہ ہن ای تے گھار پونہچا وئے'' اوہ اگوں کمنیاں بولی ''بھائی میں سچ آکھنی پئی آں،اوہ گھار نئیں آیا''۔شیرو غصے چ بولا ''مانہہ لگنا اس تداں بی کدے سدھ نئیں کیتی''۔ای گل کر کے شیرو ٹر پیا۔دتا گھار آیا تے زنانی اس نی خبر گِدی۔۔اوہ چپ کر کے سبھ کجھ سنتا رہیا۔۔زنانی پچھا ''ہن بولنا کیوں نئیں''۔اوہ سوچی پئے گیا۔۔۔''بولاں کی۔۔شیرو آں تے میں صرف ادرک آن کے دینا رئیاں،میں تے اس ویلے نا سوچناں پیاں جدوں سارے گرائیں آلے میںڈے ہتھوں منگوائیاں شئیاں نے اصل مُلے نی سچ پرچی نہ کرن لگ پیون''۔

کتابیات

احمد داؤد، خواب فروش
امام مرتضیٰ نقوی، اردو ادب میں سکھوں کا حصہ
ڈاکٹر ناشر نقوی، اردو پنجاب اور سکھ شعراء
وقار بن الٰہی، ماں میں تھک گیا ہوں
ہربھجن سنگھ، پنجابی افسانے
عنایت الٰہی ملک، پت جھڑ کی سلطنت
خلش ہمدانی، اک آبلہ پا تنہا سا
دیویندر اسر، شیشوں کا مسیحا
نند کشور وکرم، مصور تذکرے
نند کشور وکرم، ایک دانشور ایک مفکر
گوپی چند نارنگ، ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء
ڈاکٹر ستیہ پال آنند، اپنے مرکز کی طرف
ڈاکٹر ستیہ پال آنند، کتھا چہار جنموں کی
امان اللہ خان، بے خواب سفر
احمد جاوید، گمشدہ شہر کی داستان
ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، قصہ کہانی
ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت
احسان بن مجید، موم کا پتھر
سید نصرت بخاری، گھاؤ
احمد داؤد، رہائی
علی تنہا، بھول کی گھنٹیاں

رخسانہ صولت، گیلے حرف
طلعت نورین سحر، نیلی آنکھوں کے خواب
طارق اسمٰعیل ساگر، لہر دار پانیوں کی کڑواہٹ
سعید اختر ملک، سوچ دالا ان
محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی
سید نصرت بخاری، شخصیاتِ اٹک
ارشد سیماب ملک، تذکرہ
شبنم بخاری، سمندر کھائی اوروہ
سید نصرت بخاری، حدیثِ دیگراں
پروین ملک، کسیاں دا پانی
پروین ملک، کیہ جاناں میں کون

رسائل

بیسویں صدی دہلی، مئی ۱۹۵۱ء
عالمی اردو ادب دہلی، ۲۰۱۲ء
سہ ماہی ادبیات اسلام آباد ۱۹۹۴ء
ماہنامہ چہار سو راولپنڈی، مئی جون ۲۰۰۶ء
مشعل گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۴۷ء ۱۹۹۷ء
عالمی اردو ادب دہلی، ۱۹۹۸ء
ایضاً ۲۰۰۰ء
سہ ماہی ادب ساز، جولائی تا دسمبر دہلی ۲۰۰۸ء
ماہنامہ چہار سو راولپنڈی، ستمبر ۲۰۰۴ء
ادبیات اسلام آباد (انتخاب) پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء
ماہنامہ سیپ مئی جون ۲۰۱۱ء

مجلّہ آفاق راولپنڈی،۲۰۰۳ء

سہ ماہی نزول گوجرہ،۲۰۱۴ء

سالانہ میگزین، مشعل، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اٹک،۲۰۱۴ء

سہ ماہی ادبیات اسلام آباد،۲۰۰۶ء

سہ ماہی تجدید نو لاہور،شمارہ۲،اپریل ۲۰۰۷ء

'فلواڑی'' گورنمنٹ کالج کیمبل پور،نومبر۱۹۴۲ء

سہ ماہی قندیل اٹک،۲۰۰۲ء

تماہی سانجھ لاہور،۲۰۰۷ء

سہ ماہی قندیل اٹک،۲۰۰۲ء

چھماہی ونگاں،اٹک،جنوری توں جون ۲۰۱۷ء

سہ ماہی شناسا،حسن ابدال ستمبر ۲۰۰۹ء

ماہنامہ،ماہِ نو،جلد ۵۶،شمارہ۔۱،جنوری۲۰۰۳ء

فکروخبر،ملیر کوٹلہ،۱۱مئی ۲۰۱۷ء